اُمید آشنا

نابغۂ روزگار میاں عبدالمجید (چیئرمین نیشنل فوڈز) کی سرگزشت

اکرام کمبوہ

اکرم کمبوہ نے ''میاں عبدالمجید'' پر ''اُمید آشنا'' کے نام سے ایک خوبصورت اور پر اثر سوانح عمری لکھ کر پاکستانی صنعت کاروں کو یہ راستہ دکھایا ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کے تجربات کو نسلِ نو کے سامنے رکھیں تاکہ ایک خوبصورت مستقبل کی تعمیر ممکن ہو سکے۔

''اُمید آشنا'' ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک عہد کی کہانی ہے یہ اپنے باطن میں مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ گندھے ہوئے انسان کی کہانی ہے جو کہیں فقط ترقی پسند کاروباری ہے تو کہیں کلاسکے (ان کا گاؤں) کا ٹھیٹ دیہاتی۔ جہاں اپنے دفتر میں حد درجہ بہترین منتظم اور کامیاب صنعت کار نظر آتا ہے تو دوستوں میں اس کی شخصیت کی وضع داری، شائستگی، شگفتگی، درگز اور رواداری اس کے روحانی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

کئی دہائیوں پر مشتمل تعلق کے دوران، میں نے انہیں ایک بے لوث اور کھرا دوست پایا۔ بے شک ایسے ہی لوگ معاشرے کا حسن ہوتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایسے دل پذیر اور ہمہ جہت انسان کی سوانح عمری ہر پڑھنے والے کے لیے باعث راہنمائی ہوگی۔

بہت ساری نیک تمناؤں کے ساتھ!

Mansha

میاں محمد منشاء

میاں عبدالمجید ہمارے معاشرے کی اس مختصر فہرست میں شامل سماجی رہنما اور متحرک کارکن ہیں جو اپنی ذات، اپنے دائرہ اثر اور رفقائے کار کے ذریعے ملک میں ایک خاموش انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ خواست گاران انقلاب اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ اگر خواب دیکھنے والے ہی نہ ہوں گے تو پھر خوابوں کی تعبیر دیکھنے والے کہاں سے آئیں گے۔

میاں عبدالمجید صاحب اپنے گاؤں کے اسکول، اپنے کالج، اپنی رہائش گاہ اور اپنے معاشرہ کے ہر شعبہ کو قرار واقعی اہمیت دیتے ہیں، میرے علم میں نجانے کتنے ہی ایسے ادارے ہیں جو اُن کی خاموش اعانت کی وجہ سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہے کہ یہی تو وہ سرمایہ حیات ہے جو زندگی افروز بھی ہے اور زندگی کو بامعنی بنا سکتا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ میاں عبدالمجید صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں لیکن مجھے میاں صاحب کی ذات والا صفات کو کوزہ میں بند کرنے کا ہنر نہیں آتا۔

دریں چہ شک کہ ایک شمع کی روشنی سے دوسری شمع کی روشنی کا دائرہ فزوں تر ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میاں صاحب کے بارے میں وقت کے ساتھ عرفان واعتراف میں اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
ڈین فیکلٹی آف مینجمنٹ اینڈ سوشل سائنسز
بزٹیک یونیورسٹی، کورنگی کریک، کراچی

Throughout his distinguished career as a business and civic leader, Abdul Majeed has lived by the motto “By love, Serve One Another” which he learned as a student at Forman Christian College. In his quiet and determined way he has achieved great success as a corporate Chairman and CEO, and he has been a leader within his industry and community. As a result, his peers have recognized and presented him with countless awards for his leadership and service. Abdul Majeed is a role model for all business and civic leaders, and Forman Christian College was proud to honor him with the Distinguished Formanite Award in March 2004.

Peter H. Armacost
Rector
Forman Christian College

جناب سید محفوظ خطیب صاحب

کے ذوق مطالعہ کی نذر

[illegible]

[illegible]

انتساب

قرآن مجید کی اس آیت کے نام

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔''

(سورۃ الزمر: آیت ۵۳)

فہرست مضامین

دیباچہ ---------------------------- 7

پیش لفظ ---------- اکرم کمبوہ ---------------------- 9

تاریخ -- 13

تہجد کی دعا -- 21

زمانہ بدلتا ہے -- 51

آزادی -- 77

جدوجہد کا آغاز -------------------------------------- 95

ایک نئی دُنیا -- 123

رہنمائے تقدیر -- 143

نئی منزل نئے راستے ---------------------------------- 155

ترقی کا سفر -- 169

ایک اور سنگ میل -------------------------------------- 187

بدلتے حالات -- 203

سوچتا ہوں میں -- 227

سفر جاری ہے -- 247

دیباچہ

میاں عبدالمجید کی شخصیت کئی ہم آہنگ شخصیات کا مجموعہ ہے۔ بہ یک وقت صاحبِ مال، صاحبِ حال اور صاحبِ مقال ہیں۔ صاحبِ مال اس لیے کہ پاکستان کے کامیاب ترین صنعت کاروں میں شامل ہیں۔ صاحب حال اس طرح کہ اس دور کے بے حال طبقوں کی حاجت روائی میں مستعد رہتے ہیں اور صاحبِ مقال اس طور پر کہ برطانیہ اور امریکہ کے تعلیمی اور تربیتی اداروں سے اعلیٰ اسناد حاصل کی ہیں اور کانفرنسوں اور سیمینارز میں خیال افروز مقالے پیش کرتے رہتے ہیں۔

میاں عبدالمجید کی جو صفت ان تمام صفات کی سرچشمہ ہے وہ اپنے وطنِ عزیز پاکستان سے والہانہ محبت ہے۔ اس محبت کے اظہار کے لیے انھوں نے جو میدان چنا ہے وہ فروغِ علم ہے۔ پاکستان کے پس ماندہ اور مصیبت زدہ افراد اور بچے جو خستہ حال، میلی کچیلی بستیوں میں رہتے ہیں یا اینٹوں کے بھٹوں میں جبری مشقت میں گرفتار ہیں یا متعفن جیلوں میں بند ہیں، واجبی تعلیم حاصل کر کے قابلِ عزت شہری بن سکتے ہیں۔ میاں صاحب مختلف اداروں کے ذریعے ایسی تعلیم کا بندوبست کرنے میں بہت سرگرم ہیں۔ تعلیم کے حوالے سے انھوں نے گجرانوالہ کے نواح میں واقع اپنے آبائی گاؤں کلاسکے کے ہائی اسکول برائے طلبہ اور ڈگری کالج برائے طالبات کو فراموش نہیں کیا اور ان تعلیمی اداروں میں قابلِ قدر توسیع کی ہے۔

میاں صاحب سے میری رفاقت دیرینہ ہے۔ یہ رفاقت قیامِ پاکستان کی مرہونِ منت ہے۔ حصولِ پاکستان کی بدولت مجھے، میاں صاحب اور دیگر اَن گنت

پاکستانیوں کو موقع ملا کہ ترقی یافتہ ممالک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ مجھے انگلستان کی نتائجی علمیت (Progmatism) کی علم بردار شہرۂ آفاق مانچسٹر یونی ورسٹی میں میاں صاحب کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل رہا لیکن یہ ہم عصری صرف نصابی تعلیم تک محدود نہیں تھی۔ اس میں پاکستان سوسائٹی کی سرگرمیوں کا فروغ بھی شامل تھا۔ یہی صورتِ حال اب بھی ہے۔ میاں صاحب نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے بڑے متحرک رکن ہیں جس کا میں بھی ایک ادنیٰ رکن ہوں۔ نظریۂ پاکستان ٹرسٹ پچھلی دہائی میں مشہور نظریاتی صحافی مجید نظامی صاحب کی سربراہی میں ایک ایسے ادارے کے طور پر اُبھرا ہے جو قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و کردار کی روشنی میں پاکستان کی تعمیرِ نو کا علم بردار ہے اور اعلیٰ وجہ البصیرت اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ نفسی نفسی کے دورِ حاضر میں انہی افکار کی پیروی سے ایک انسان دوست، خوش حال، جمہوری، عادلانہ اور روشن ضمیر معاشرے کا احیا ممکن ہے۔

پاکستان کے نظریاتی احیا کا پیغام بڑوں کے لیے بھی ہے اور نئی نسل کے لیے بھی۔ البتہ زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں نصابِ تعلیم کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان اور پاکستان کی جاندار نظریاتی اساس کے بارے میں آگہی پیدا کی جائے۔ میاں عبدالمجید اپنے رفقا کے ساتھ مل کر کراچی کے تعلیمی اور دیگر اداروں میں اس آگہی کو پھیلانے میں شب و روز مصروف ہیں۔

(ڈاکٹر رفیق احمد)

سابق وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی لاہور

و اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور

پیش لفظ

پاکستان خدا کی ایسی تخلیق ہے جس کی حفاظت اور دیکھ بھال بھی وہ خود ہی کرتا ہے۔ جب ملک پاکستان وجود میں آیا تو حالات نہایت خراب تھے۔ملک کو اتنے مسائل کا سامنا تھا کہ دشمن تو دشمن دوست بھی اس کے قیام پر شک کر رہے تھے۔مگر یہ ملک نہ صرف قائم رہا بلکہ ترقی بھی کرتا رہا۔اللہ باری تعالی نے اسے ایسے محنتی اور مخلص لوگوں سے نوازا جن میں سے ہر ایک اپنے شعبے کا بانی اور رہنما بنا جو پاکستان کو ان شعبوں میں اوپر لے کر گیا۔نہایت نامساعد حالات میں ان لوگوں نے اپنی کوششوں سے ملک کو سہارا دیا اور اسے ترقی کی شاہراہ پر لے آئے۔ان میں سب سے اوپر نام محمد علی جناح کا ہے۔وہ قوم کو پاکستان کا تحفہ دے کر اور اس کے لیے ابتدائی ادارے قائم کر کے اس دنیا سے چلے گئے تو ملک کو سنبھالنے کے لیے دوسرے لوگ میدان میں آئے۔یہ وہ لوگ تھے جو نظریۂ پاکستان کے سائے میں پروان چڑھے تھے۔ان میں سے بہت سوں نے زندگی کا پہلا لفظ جو ادا کیا وہ پاکستان تھا۔ جنھوں نے بولنا شروع کیا تو ان کا پہلا جملہ ''لے کے رہیں گے پاکستان'' تھا۔یہی نسل پاکستان کی صحیح وارث تھی۔یہ لوگ جس شعبے میں گئے اس کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔جس کام میں ہاتھ ڈالا اسے انتہا تک لے گئے۔اپنے شعبے کے بانی اور رہنما بن گئے۔

ایسے ہی لوگوں میں ایک نام میاں عبدالمجید صاحب کا بھی ہے۔ان کو زیادہ لوگ نہیں جانتے مگر وہ ہر گھر میں ہیں۔ایک ایسی شخصیت جس کے بغیر اس ملک میں صنعت کی تاریخ ادھوری ہے۔جس نے کام تو خوب کیا اور ایسا کیا کہ ضرب المثل بن گیا مگر جسے لوگ ابھی کم جانتے ہیں۔مگر یہ ناواقفیت نہیں ہے۔گلاب کی خوش بُو محسوس کرنے کے لیے اس کا نظر میں ہونا ضروری نہیں ہے۔اس کی خوش بُو ہی اس کی موجودگی کا ثبوت ہے۔کچھ ایسی ہی ناواقفیت کا معاملہ جناب میاں عبدالمجید صاحب ہیں۔جن کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے ہیں مگر وہ ان کو اپنے اردگرد محسوس ضرور کرتے ہیں۔جب کوئی پاکستان کا بنا سوتی کپڑا پہنتا ہے جب کوئی نیشنل فوڈز کی کوئی پروڈکٹ استعمال کرتا ہے تو میاں عبدالمجید صاحب اس کی زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں کیوں کہ ملک کی ہر ٹیکسٹائل مل کو بنانے اور چلانے میں ان کا حصہ ہے اور نیشنل فوڈ تو ہے ہی ان کا خیال۔

ایک مدد گار اور سب کے کام آنے والے شخص کے طور پر میاں عبدالمجید صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔انڈسٹری سے لے کر تعلیم تک بے شمار شعبوں میں وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔لیکن جب میں نے ان کے بارے میں کتاب لکھنے کا سوچا تو مجھے پتا چلا کہ میں ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا خاص طور پر ان کی نجی زندگی کے بارے میں۔ایک ایسا شخص کس مٹی سے اٹھا اس نے یہ کامیابیاں کس طرح حاصل کیں۔ اس نے یہ مقام کیسے حاصل کیا۔ اس نے کیسے ایک نئے ملک میں بین الاقوامی معیار کے کارخانے قائم کیے۔کس طرح اس نے صنعت کاروں کو راضی کیا کہ وہ اپنی صنعتوں کو جدید پیمانے پر ڈھالیں۔کیوں کر اس نے یورپ کے ملکوں سے ان کی جدید ترین مشینیں اور ان کو چلانے کی تربیت حاصل کی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ان بے شمار سوالوں کے جواب جاننے کے

لیے مجھے بہت کوشش کرنا پڑی اور میاں صاحب سے بہت کچھ کہلوانا پڑا۔وہ ایسی شخصیت ہیں جو کسی کی مدد کرنے کے لیے تو فوراً تیار ہو جاتی ہے مگر جب ان کے بارے میں بات کی جائے تو وہ کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان کے لیے اپنے بارے میں بات کرنا ذرا دشوار کام ہے۔ بین الاقوامی درجے کی کانفرنسوں میں پورے اعتماد سے مقالے اور تقریریں پڑھنے والے میاں عبدالمجید صاحب اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے کسی قدر کنفیوژ ہو جاتے ہیں ۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خمیر میں خودنمائی شامل ہی نہیں ہے۔ان کی تربیت اس طرح ہوئی ہے کہ اپنا کام کرو اور سوائے خدا کے کسی سے اس کا صلہ مت چاہو۔ایسا شخص کس طرح اپنی تعریف خود کرسکتا ہے۔ایسے شخص سے اس کے بارے میں جاننے کے لیے بہت سارے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ۔اور میں نے یہی کیا۔

ایک صحافی اور مصنف کے طور پر میں جتنے بھی بڑے لوگوں سے ملا ان سے بات کی اور ان کے انٹرویوز کیے میں نے ان میں ایک بات مشترک پائی کہ ان کا بڑا پن ان کے کام میں نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں تھا۔ گھنے تناور درخت جیسی شخصیت جس پر پتھر مارنے والے کو بھی پھل ملتا ہے جس کے سائے میں سکون ہے۔اور جس سے ملتا ہی ملتا ہے وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتا،جس پر جتنا زیادہ پھل آتا ہے وہ انکساری سے اتنا ہی جھک جاتا ہے۔جو خود زمانے کے سرد و گرم جھیلتا ہے مگر دوسروں کو آرام دیتا ہے۔آسمان کی طرح مہربان اور زمین کی طرح اپنی گود میں لینے والا۔جس کامیاب شخص میں مجھے یہ اوصاف نہیں ملے۔تو میں نے اس کی کامیابی کو تقدیر، دولت یا خاندان کے اثر ورسوخ کی وجہ سے پاتے دیکھا۔ایسے لوگوں سے ملنے کے بعد میں نے کامیابی کا ذاتی مفہوم بدل دیا اب میرے نزدیک کسی شخص کی کامیابی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے لیے کیا کیا۔ میرے نزدیک کامیاب شخص

وہ ہے جس نے دوسروں کے لیے کچھ کیا ہے اور میری زندگی کا مشن ایسے لوگوں کو سامنے لانا ہے۔

عبدالمجید صاحب سے ملنے کے بعد مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میں ایک بہت عظیم شخص سے مل رہا ہوں اور ان کی عظمت دیکھیں کہ وہ مجھ جیسے عام سے آدمی سے بھی ملتے ہوئے مجھے اپنی بڑائی کا احساس ہونے نہیں دیتے۔وہ مجھ سے یوں ملتے ہیں جیسے اپنے کسی بے تکلف دوست سے۔بات کرنے کا عام سا انداز اور بہت انکساری بھرا لہجہ۔

میاں صاحب جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے۔اب میں درمیان سے ہٹتا ہوں، آپ میاں صاحب کے بارے میں پڑھیں۔الفاظ بے شک میرے ہیں مگر احساسات میاں صاحب کے ہیں۔ اگر کہیں آپ کو کوئی کمی یا کوتاہی نظر آئے تو اسے میرے الفاظ کی کمی یا کوتاہی سمجھئے گا میاں صاحب کے احساسات کی نہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر اُن حضرات کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کے تعاون کی بدولت یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب عابد گنائی، جناب جی این خان، جناب چوہدر محمد طفیل، جناب میاں عبدالقادر، جناب وقار حسن، جناب گل زار قریشی، جناب ڈاکٹر ایم اے کھوکھر، جناب ڈاکٹر منصور احمد ڈار، جناب طارق سعود، جناب سید محفوظ قطب، جناب راشد جلیل، جناب چودھری اسلم چیمہ، جناب محمود احمد خان، جناب سید محسن مقبول گیلانی، جناب ڈاکٹر زبیر بندوق دا، جناب محمد ادریس، جناب محمد نصرت علی چشتی، محترمہ نجمہ الطاف اور جناب سیف اللہ۔

اکرم کمبوہ

E-mail: akramkamboh_pk@yahoo.com
akramkamboh_pk@hotmail.com

تاریخ

1947ء کا پر آشوب دور...... ایسے دور اس دنیا میں کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ جب صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہمسائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ جو کبھی دسترخوان پر ایک دوسرے کو نوالے کھلاتے تھے' اب وہی ہاتھ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے لیے اٹھ رہے تھے...... بھائی چارے کے وقت جو درانتیاں ایک دوسرے کی فصل کاٹا کرتی تھیں اب وہی آپس میں گلے اور پیٹ چاک کر رہی تھیں۔ نہروں میں مون سون کا پانی کم اور انسانوں کا لہو زیادہ بہہ رہا تھا۔ اگست کے اوائل سے مشرقی پنجاب سے قتل وغارت گری کی خبریں آ رہی تھیں۔ اس کے ردعمل میں مغربی پنجاب میں بھی اکا دکا واقعات ہو رہے تھے لیکن اصل آگ اس وقت بھڑکی جب دہلی سے آنے والی مہاجرین کی ٹرینیں' پنجاب سے گزرتے ہوئے زندہ انسانوں کے مذبح خانوں میں بدل گئیں اور کٹی پھٹی لاشیں جب لاہور پہنچیں تو اشتعال نے مسلمانوں کو بھی حد سے گزرنے پر مجبور کر دیا۔

لاہور جلنے لگا اور رفتہ رفتہ یہ آگ پورے مغربی پنجاب میں پھیلنے لگی۔ جہاں سکھ اور ہندو آباد تھے ان پر حملے ہونے لگے۔ یہ فسادات منظّم نہیں تھے ورنہ بے شمار ہندوؤں اور سکھوں کو بچ کے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ یہاں ابھی لوگوں میں انسانیت اور صدیوں کی ہمسائیگی کا احساس باقی تھا اگر ایک مارنے والا ہوتا تھا تو دو بچانے والے

بھی آجاتے تھے۔ بے شمار واقعات ایسے ہوئے جب مسلمانوں نے جان پر کھیل کر اپنے ہندو یا سکھ ہمسائے کی مدد کی اور اسے بھارت جانے میں مدد فراہم کی۔ ایسا ہی ایک واقعہ گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں میں پیش آیا۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں ہندوؤں کی بھی آبادی تھی۔ اگرچہ یہاں ابھی تک کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا لیکن اردگرد سے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں۔ گاؤں کے ہندو سہمے ہوئے تھے۔ ان کو لگ رہا تھا کہ جلد یا بدیر اُن کی باری آنے والی ہے۔ گاؤں کے لوگ ان کو تسلی دے رہے تھے کہ وہ ان کی حفاظت کریں گے مگر ان کے اندیشے کم نہیں ہوئے اور پھر ایک دن ان اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اردگرد سے بلوائی گاؤں پر چڑھ آئے' ان کا مطالبہ تھا کہ ان کو ہندوؤں پر حملہ کرنے' ان کو قتل کرنے اور ان کو لوٹنے کی اجازت دی جائے' مگر گاؤں کے بزرگ اور سربرآوردہ لوگ حملہ آوروں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''اے ساڈے ہمسائے نے۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''اے ہندو نے۔'' ایک جوشیلا حملہ آور چلایا۔'' اینہاں ساڈے مشرقی پنجاب ۔۔ تے۔۔ دلی دے مسلماناں نال کی کیتا اے۔۔۔ جے تینوں نہیں پتا۔''

گاؤں والوں اور حملہ آوروں میں مذاکرات ہونے لگے۔ گاؤں والے اصرار کر رہے تھے کہ ان کے گاؤں کے ہندو بے گناہ ہیں اور ان کا کسی جھگڑے' فساد سے تعلق نہیں ہے مگر بلوائیوں کا موقف تھا انھوں نے ہندوؤں کو مارنا ہے۔ مشرقی پنجاب اور پورے بھارت میں مرنے والے مسلمان بھی بے گناہ اور معصوم تھے۔ ان کا کہنا تھا اگر انھوں نے بدلہ نہیں لیا تو اس طرح بدلے کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ گاؤں والے اپنی باتوں سے اس آگ کو نہیں بجھا سکتے تھے۔ اصل میں بلوائی مارنے سے زیادہ لوٹ مار کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ پورے پنجاب کی طرح

اس گاؤں میں بھی بہت سے دولت مند ہندو تھے۔ زمین اور کاروبار ان کے قبضے میں تھے اور سود پر قرض دے کر وہ لوگوں کا خون بھی چوس رہے تھے۔ بلوائی اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ جب گاؤں والوں نے ان کو حملے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو وہ ان سے بھی لڑ مرنے کو تیار ہو گئے تھے اور لگ رہا تھا مسلمان آپس میں کٹ مریں گے۔

ایسے میں ایک بزرگ نے انوکھی بات کی۔ اس نے کہا ٹھیک ہے ان ہندوؤں کو مارنا چاہیے۔ پر یہ ہمارے گاؤں کے ہندو ہیں اس لیے ہم ان کو ماریں گے۔''

''چاچا...... اے کی گل ہوئی۔'' ایک حملہ آور بولا۔

''پتر اے عزت دی گل اے۔'' بزرگ نے جواب دیا، اس کی منطق انوکھی مگر سادہ تھی۔ یہ ان کے گاؤں کے ہندو تھے اس لیے ان کو صرف وہی مار سکتے تھے کوئی دوسرے گاؤں سے ادھر آئے اور ان کو مارے تو ان کے لیے بے عزتی کی بات تھی۔ جیسے ہر ملک اپنے مجرموں کو خود سزا دیتا ہے' یہ کام کوئی دوسرا ملک کرے تو ان کی بے عزتی ہوگی۔ گاؤں والوں کی سمجھ میں یہ نکتہ آ گیا اور وہ ڈٹ گئے کہ ان کے گاؤں کے ہندوؤں کو کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا وہ ان کو خود مارتے تو الگ بات تھی' سارے گاؤں والے اس بات پر متفق ہو کر حملہ آوروں کے سامنے ڈٹ گئے تو انھوں نے پسپائی میں ہی عافیت سمجھی۔ یہ چند درجن افراد سیکڑوں لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔اس طرح گاؤں والوں نے ان ہندوؤں کو بچا لیا اور کتنی کوشش سے بچایا جب کہ ان کے ہم مذہب مشرقی پنجاب میں بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹے جا رہے تھے۔ ان لوگوں میں انسانیت زندہ تھی اور ان انسانیت نواز لوگوں کے گاؤں کا نام ''کلاسکے'' ہے۔

دوآبے کے درمیان پنجاب کے علاقے نہ صرف زرخیز زمین میں دنیا میں بے

مثال ہیں بلکہ مردم خیزی میں یہ علاقے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خاص طور سے لاہور سے جالندھر تک کا علاقہ ایسا ہے کہ یہاں ایک ایک گاؤں تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ کلاسکے کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔ لودھی خاندان کے دور حکومت میں یہ علاقہ جاٹ لوگوں کے پاس تھا ان میں ایک جاٹ کیلاش چند نے ایک قصبہ بسایا اور اسے اپنے نام سے موسوم کیا۔ کیلاش گڑھ زمانے کے ہاتھوں تبدیلی کا شکار ہوا اور بگڑ کر کیلاس رہ گیا اور اب یہ کلاسکے کہلاتا ہے۔ جاٹوں نے اسلام قبول کیا تو کلاسکے بھی مسلمانوں کی آبادی بن گیا اور یہاں نومسلم جاٹوں کے علاوہ نومسلم راجپوت بھی آباد ہوئے۔ یہ گوجرانوالہ شہر سے اٹھارہ کلو میٹر دور مغرب کی سمت ہے۔۔ عہد جہانگیر میں کلاسکے میں ایک نابغۂ روزگار حکیم درویش نے جنم لیا۔ بابا فرید گنج شکر کے مرید ہونے کے علاوہ یہ اعلیٰ درجے کے یونانی حکیم بھی تھے۔ قدرت نے ہاتھ میں ایسی شفا دے رکھی تھی کہ دور دور سے لوگ علاج کے لیے آتے تھے۔ حد یہ کہ شہرت دہلی تک پہنچی تو شاہی بلاوے پر وہاں جا کر شاہی مستورات کا کامیاب علاج کیا۔ حکیم درویش کا ایک اور کارنامہ طب یونانی کو پنجابی زبان میں ڈھالنا تھا اور یہ کام اُنھوں نے اتنے احسن طریقے سے کیا کہ اصل سے بھی بڑھ گئے۔ طب یونانی میں وہ اس دور کے بوعلی سینا تھے۔ وہ فارسی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر آج بھی مشہور ہے جو اُنھوں نے اپنے گاؤں کلاسکے کی تعریف میں کہا تھا۔ اس میں اُنھوں نے کلاسکے کو ایران کے شہر شیراز سے تشبیہ دی تھی۔

جب درویش حکیم پچھائے راز تب گڑھ کیلاس بنے شیراز
گڑھ کیلاس کی ایسی گیتا بولن سانچ جھوٹھ نئیں ریتا

جب کیلاش چند کی اولاد نے اسلام قبول کر لیا تو یہاں پر مسلمان بھی آباد ہونے لگے۔ ان میں ایک میاں خاندان بھی تھا جو اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اپنی

نیک نفسی، راست بازی اور دین داری کی وجہ سے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے پاس دھن دولت نہیں تھی مگر مالی لحاظ سے کم تر بھی نہیں تھے۔ اس خاندان میں 1892ء میں ایک بچے نے آنکھ کھولی۔ جسے امام الدین کا نام دیا گیا۔ اس بچے کے لیے اس کے ماں باپ کے دل میں شروع سے ارمان تھا کہ وہ بڑا ہو کر عالم بنے اور ان کی یہ خواہش یوں پوری ہوئی کہ بچے نے نہ صرف دین اور دنیا کا علم حاصل کیا بلکہ اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے معلّمی کا پیشہ بھی اختیار کیا۔ وہ اس گاؤں کے چند اوّلین افراد میں سے تھے جنھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ جب میاں امام الدین پڑھ رہے تھے تو اُس وقت کلاسکے میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ اُن کو کئی میل دور دوسرے گاؤں میں پڑھنے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ اُن کی والدہ محترمہ انھیں آدھے راستے تک چھوڑنے جاتی تھیں۔ گھر میں غریبی کا یہ عالم تھا وہ کہا کرتی تھیں کہ ہم گھر میں تو باجرے کی روٹی کھاتے ہیں اور اپنے بیٹے امام الدین کو اسکول جاتے وقت گندم کی روٹی کھلاتے ہیں تاکہ اس کے دل میں غربت کا احساس پیدا نہ ہو اور نہ ہی اسے اپنے ہم مکتبوں کے سامنے شرمندگی ہو۔ میاں امام الدین کے بڑے بیٹے میاں عبدالرشید صاحب کی پیدائش کے وقت کلاسکے میں پرائمری اسکول بن گیا تھا اور میاں امام الدین صاحب اُس وقت وہاں پڑھا رہے تھے۔ اسی اسکول سے میاں عبدالرشید صاحب نے پرائمری پاس کی۔ اسکول میں تعلیم دینے کے ساتھ میاں امام الدین صاحب گھر میں بھی مسلمان بچوں کو تعلیم دیتے تھے تاکہ وہ اس میدان میں دوسری اقوام کے بچوں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ عام علوم کے علاوہ قرآن مجید اور دوسرے مذہبی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ عورتوں کے لیے اس کا اہتمام اماں بیگم بی بی کیا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں درس کے ساتھ بحث ومباحثے اور علمی مسائل پر بات ہوتی تھی۔ امام الدین کی وجہ سے اس ننھے سے گاؤں کے گھر

گھر میں تعلیم کا چرچا ہونے لگا۔ اس دور کے دوسرے باشعور مسلمانوں کی طرح میاں امام الدین صاحب نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ تعلیم کے بغیر مسلمان نہ تو آزادی حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ترقی کرسکتے ہیں۔

انگریزوں کی آمد کے بعد مغربی اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کے پنجہ ستم سے نجات ملی تھی اور ان کو کسی قدر ابھرنے کا موقع ملا تھا۔ کلاسکے میں شروع میں ہندو غالب تھے مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی آبادی بڑھی اور ہندوؤں کی کم ہوئی اس کے باوجود 1947ء تک یہ عالم تھا کہ گاؤں کی ساری معیشت ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ بیشتر زمینیں ان کی تھیں اور سوائے کھالوں کے ہر طرح کی تجارت بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کے مسلمان کوئی لین دین ان کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتے تھے۔ مسلمان ہر طرح سے ان کے محتاج اور زیر دست تھے۔

ایسے میں میاں امام الدین کا اسکول میں اور گھر میں مسلمان بچوں کو تعلیم دینا درحقیقت آزادی کی طرف پہلا قدم تھا۔ کلاسکے کا پہلا اسکول 1867ء میں قائم ہوا، اور بعد میں اس نے ہائی اسکول تک ترقی کی۔ آغاز میں صرف ہندو بچے پڑھتے تھے۔ مسلمان جدید تعلیم سے بے گانہ تھے اور اسے انگریزوں کی غلامی سمجھ کر اس سے گریز کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ میاں امام الدین جیسے لوگوں کی کوشش سے مسلمانوں میں بھی تعلیمی شعور بیدار ہونے لگا۔ مسلمانوں نے اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کروایا اور ساتھ میں دینی تعلیم بھی دلوانے لگے۔

میاں امام الدین صاحب کی گاؤں کے رواج کے مطابق کم عمر میں شادی ہوگئی تھی اس وقت شاید بیس اکیس برس کے تھے۔ 1915ء میں ان کے پہلے بیٹے میاں عبدالرشید صاحب نے جنم لیا۔ میاں صاحب اور بیگم بی بی بے حد خوش تھے۔ میاں

صاحب نے بیوی سے کہا۔ ''میں اسے اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔''

اس زمانے میں مسلمان بچہ میٹرک کر لیتا تھا تو سمجھا جاتا تھا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی ہے۔ لڑکیوں کے لیے تو صرف پانچ جماعتیں ہی کافی سمجھی جاتی تھیں۔ اس لیے جب میاں صاحب نے اعلیٰ تعلیم کی بات کی تو بیگم بی بی یہی سمجھیں کہ ان کی مراد اسکول کی تعلیم سے ہے۔ اسی اثنا میں میاں امام الدین صاحب کا تبادلہ گوندلہ نوالہ میں ہو گیا تھا۔ جہاں ایک لوئر مڈل اسکول تھا جو بعد میں مڈل اسکول کا درجہ پا گیا۔ میاں عبدالرشید صاحب بھی اپنے والدین کے ساتھ گوندلہ نوالہ چلے گئے اور وہیں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گوندلہ نوالہ اُس زمانے میں گوجرانوالہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا اب گوجرانوالہ کا ہی حصہ بن چکا ہے۔ بعدازاں میاں عبدالرشید صاحب کا میٹرک کے لیے داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ہوا اور وہیں سے اُنھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

مگر میاں امام الدین صاحب بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو محض اسکول کی تعلیم تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے وہ ان کو بہت آگے' کلاسکے سے آگے کسی شہر میں' ملک سے آگے کسی اور ملک میں براعظم سے آگے کسی اور براعظم میں تعلیم حاصل کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ کلاسکے میں رہتے ہوئے بھی ان کو بڑی شدت سے احساس تھا کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور آنے والا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہوگا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دور کے لحاظ سے ان کے بچے تعلیم کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ میاں عبدالرشید صاحب کی پیدائش کے بعد ان میاں بیوی کو امید تھی کہ ان کے اور بچے بھی ہوں گے مگر وقت گزرتا گیا اور ان دونوں کی گود صرف میاں عبدالرشید صاحب سے آباد رہی۔ حتیٰ کہ میاں عبدالرشید صاحب گود کی عمر سے نکل گئے۔ اُنھوں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ بی بی بیگم

نماز روزے کی پابند تو تھیں...... ساتھ ہی وہ روز رات کو اٹھ کر تہجد پڑھا کرتی تھیں اور مزید اولاد کے لیے اپنے پروردگار کے آگے ہاتھ پھیلاتی تھیں۔ برسوں گزر گئے تہجد کے بعد یہی دعا مانگتے ہوئے مگر ان کے دل میں خدا سے بدگمانی نہیں آئی کہ وہ دعا قبول کرنے سے گریزاں ہے۔ ان کو یقین واثق تھا کہ خدا اُن کی دعا ضرور سنے گا اس کے ہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں ہے۔ اس دعا کا عرصہ اتنا طویل ہو گیا کہ کوئی اور ہوتا تو مایوس ہو جاتا مگر بیگم بی بی مایوس نہیں تھیں۔ پھر خدا نے ان کو نوازنے کا فیصلہ کیا۔

تہجد کی دعا

ستمبر 1933ء کا ایک دن تھا، میاں امام الدین صاحب اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے۔صبح کا سہانا وقت تھا۔ روشنی نمودار ہو رہی تھی اور میاں صاحب اپنے اندر ایک انوکھی خوشی محسوس کر رہے تھے ۔شائد اس لیے کئی سالوں بعد ان کے گھر خوشی آنے والی تھی۔ خدا نے ان میاں بیوی کی دعائیں سن لی تھیں۔خوش گوار ہوا سے لطف لیتے وہ ابھی اسکول پہنچے ہی تھے کہ گھر سے خبر آئی کہ اللہ نے ان کو ایک اور فرزند سے نوازا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے پورے اٹھارہ سال بعد پیدا ہوئے اور انھیں دیکھتے ہی ماں نے کہا تھا۔

''یہ میری اٹھارہ سال تک تہجد میں مانگی ہوئی دعا ہے۔''

میاں صاحب جو اب اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے ان کو اطلاع ملی تو بھاگے ہوئے آئے فرزند کی پیشانی چومی' اس کے کان میں اذان دی اور میاں عبدالمجید نام رکھا۔ خدا نے اتنے عرصے بعد اولاد سے نوازا تھا۔ اس کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے۔ اتفاق سے اسی دن ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکول آئے ہوئے تھے۔۔ وہ ہندو پنڈت تھے مگر میاں امام الدین صاحب سے دوستی تھی اطلاع ملی تو وہ بھی نومولود کو دیکھنے آئے۔ پنڈت تھے تو جیوتشی کیسے نہ ہوتے۔ اُنھوں نے ننھے عبدالمجید کو دیکھا تو چونک گئے۔ میاں صاحب سے کہا۔

”میاں جی آپ کا یہ بچہ اونچے بھاگ لے کر پیدا ہوا ہے۔ جس شعبے میں جائے گا کامیاب ہوگا۔ ایک دنیا اس کا نام جانے گی۔ دولت اور شہرت اس کے گھر کی داسی ہوگی۔“

میاں امام الدین صاحب ان باتوں کے قائل نہیں تھے اس لیے ہنس کر چپ رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ تقدیر اللہ بناتا ہے اس لیے وہی اس سے واقف ہے کہ آگے کیا ہوگا اور اس کے نصیب میں کیا ہے؟ ان کے خیال میں پنڈت جی نے محض خوش مزاجی کے لیے یہ بات کی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میاں امام الدین صاحب کے بچوں کے مستقبل کے بارے میں عزائم میں کوئی کمی آئی تھی بلکہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور دنیا کی جدتیں سامنے آرہی تھیں وہ میاں عبدالرشید صاحب کو پہلے سے زیادہ سمجھانے لگے تھے کہ وہ بہترین تعلیم حاصل کریں۔ صرف تعلیم ہی نہیں علم حاصل کریں اور اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ ان کا ارادہ میاں عبدالرشید صاحب کو لاہور بھیجنے کا تھا۔ جو پورے پنجاب میں تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے لیے بھی ان کے یہی عزائم تھے۔ گاؤں دیہات میں والدین عام طور سے بچوں کو خود سے دور کرنا گوارا نہیں کرتے اور ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں لیکن میاں امام الدین صاحب کی ایسی سوچ نہیں تھی اُنھوں نے اولاد کی بہتری کے لیے بہ خوشی ان کو خود سے دور جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میاں عبدالرشید صاحب نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم گوجرانوالہ سے حاصل کی تھی۔ انٹر اُنھوں نے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے کیا اس کے بعد میاں امام الدین صاحب نے ان کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور بھیج دیا۔ جب ان کا داخلہ بی اے کے لیے لاہور کے دیال سنگھ کالج میں ہوا تو ان کو لاہور منتقل ہونا پڑا اتنی دور سے

روز تو کیا مہینے میں ایک دوبار آنا بھی خاصا مشکل کام تھا۔

جن دنوں میاں عبدالرشید صاحب لاہور جانے کی تیاری کر رہے تھے ان ہی دنوں ان کے بھائی عبدالمجید کی پیدائش ہوئی۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ اسے چھوڑ کر جاتے ہوئے ان کو بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر جانا مجبوری تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب میاں امام الدین صاحب کے گھر کی رونق تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب ایک تو چھوٹے تھے' دوسرے خاموش رہنے والا بچہ تھے جسے رونے کی عادت بھی نہیں تھی۔ اس لیے گھر میں میاں عبدالرشید صاحب کے جانے سے سناٹا چھا گیا تھا۔ گھر میں دو عورتیں (دادی اور ماں) اور ایک بچہ رہ جاتا تھا۔ میاں امام الدین صاحب صبح اسکول جاتے تو شام کو آتے تھے۔ ان کے والد میاں غلام علی مجذوب صفت تھے وہ کھڈی پر کپڑا بنتے تھے مگر ان کا دل دنیا میں نہیں لگتا تھا جب گھر والوں کے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان ہو جاتا تھا تو وہ چلّہ کاٹنے چلے جاتے تھے۔ اپنی خوراک اور آرام کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ ایک دن کہیں سے چلّہ کاٹ کر آئے تو حالت خراب ہو رہی تھی۔ بیوی نے پانی گرم کر کے دیا۔ وہ نہا رہے تھے کہ فرشتہ اجل نے دستک دی' میاں امام الدین صاحب باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے مگر ابھی ماں کا سایا ان کے سر پر تھا۔

میاں عبدالرشید صاحب کے جانے کے بعد ماں اور دادی کی توجہ کا مرکز میاں عبدالمجید تھے۔ دونوں عورتیں نمازی' پرہیزگار اور پاکیزہ کردار کی حامل تھیں۔ خاص طور سے بیگم بی بی جو سارے دن کی مصروفیات کے باوجود نہ صرف گاؤں کی بچیوں اور عورتوں کو درس قرآن دیا کرتی تھیں بلکہ راتوں کو اٹھ کر تہجد بھی پڑھتی تھیں۔ یہ اس کا اثر تھا کہ میاں عبدالرشید صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب پر ساری زندگی مذہب کا اثر رہا۔ بیگم بی بی کی محبت اور ریاضت کا اندازہ لگایئے کہ صبح سویرے فجر کے بعد

سب سے پہلے چکی پر گندم پیستی تھیں۔ گاؤں کے رواج کے مطابق سارے سال کی گندم ذخیرہ کر لی جاتی تھی اور اس سے روز نکال کر صاف کر کے چکی پر پیسی جاتی تھی۔ اس کے بعد آٹا گوندھتی تھیں، اسی اثنا میں میاں صاحب اور دوسرے گھر والے بیدار ہو کر نماز سے فارغ ہو کر آ جاتے تھے ان کے لیے ناشتہ تیار کرتی تھیں۔ ناشتہ کر کے میاں صاحب اور بچے چلے جاتے تو خود ناشتہ کر کے گھر کے دوسرے کام سورج بلند ہونے سے پہلے نمٹا دیا کرتی تھیں۔

روشنی ہونے پر گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں تعلیم اور درس قرآن کے لیے آنے لگتی تھیں۔ یہ سلسلہ سارا دن چلتا، درمیان میں گھر کے کام کاج اور میاں عبدالمجید صاحب کی دیکھ بھال بھی جاری رہا کرتی تھی۔ مغرب کے بعد رات کا کھانا کھا کر اور چیزیں سمیٹ کر وہ عشاء کے بعد درود اور وظائف کر کے سویا کرتی تھیں۔

میاں امام الدین صاحب اسکول سے آتے تو مطب شروع ہو جاتا تھا۔ میاں صاحب کو حکمت اپنے بزرگوں سے ملی تھی۔ خدا نے ہاتھ میں شفا دے رکھی تھی۔ دوائیں خود بناتے اور اکثر مریضوں کو جو استطاعت نہیں رکھتے تھے دوائیں مفت میں دے دیا کرتے تھے۔ شام سے رات تک مریضوں کا سلسلہ جاری رہا کرتا۔ کسی دن فارغ ہوتے اور عام طور سے اتوار کے دن ہی فارغ ہوتے تھے۔ تب گاؤں کے چوپال میں وقت گزارتے۔ وہاں پر بھی علمی بحث ومباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ گاؤں کے مسئلے مسائل سنے جاتے اور پھر ان کا حل پیش کیا جاتا۔

1935ء سے لے کر 1947ء تک کا عرصہ برصغیر اور خاص طور سے پنجاب کی تاریخ میں تبدیلیوں کا عرصہ تھا۔ سیاسی ہل چل نے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علامہ اقبال کے الہ آباد کے خطبے کے بعد مسلمانوں میں الگ وطن کا نظریہ جڑ پکڑنے لگا تھا اور خاص طور سے اقلیتی صوبوں کے مسلمان اس بارے میں

پرجوش تھے۔ کیونکہ وہ براہ راست ہندوؤں کے جبر وستم کی زد میں تھے۔ پنجاب میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی یہاں پر مسلمان اکثریت میں تھے۔ خاص طور سے مغربی پنجاب میں مسلمان معاشی طور پر قدرے بہتر حالت میں تھے۔ تعلیم اور دوسرے میدانوں میں ترقی کررہے تھے۔ جاگیردار سوفی صد نہ سہی نوے فیصد انگریز سرکار کے ساتھ تھے۔ اور یہ مراعات یافتہ طبقہ مسلم لیگ کے خلاف تھا۔

مگر عوام میں مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھ رہی تھی خاص طور سے دین دار طبقہ جمعیت العلمائے ہند کے پروپیگنڈے کے باوجود مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ کلاسکے کے مسلمان مسلم لیگ کے حامی تھے۔ 1936ء کے انتخابات میں انھوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا۔ میاں امام الدین صاحب آغاز سے مسلم لیگی تھے اور قرار داد لاہور جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا تھا اس سے پہلے ہی پاکستان کے حامی تھے ان کے خیال میں انگریزوں کے جانے کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کو صرف ایک الگ وطن ہی تحفظ دے سکتا ہے۔ جب وہ گاؤں میں چوپال میں سب سے بحث یا بات کرتے تھے تو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ...... اپنی بات کہنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔

سیاسی تقسیم گہری ہونے کے باوجود گاؤں کے مسلمان اور غیر مسلم مل جل کر رہتے تھے۔ مہمان سب کے ساجھے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی غمی خوشی میں شرکت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ میلوں میں ایک ساتھ جاتے تھے۔ امیری غریبی کا فرق تھا مگر یہ بہت زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ بزرگ اور بچے سب کے ایک سے تھے اور ان کے ساتھ یکساں محبت اور احترام سے پیش آیا جاتا تھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں عبدالمجید صاحب نے جنم لیا۔

میاں امام الدین اسکول مدرس کے علاوہ حکمت بھی کرتے تھے۔ گاؤں میں وہ

واحد حکیم تھے، یونانی طریقہ علاج تھا مگر وہ اس میں اپنی وضع کی ہوئی ادویہ بھی استعمال کرتے تھے۔ صبح سویرے کھیتوں اور درختوں میں جا کر جڑی بوٹیاں اور پتے جمع کر کے لاتے تھے۔ اُنھوں نے صرف بزرگوں سے فیض حاصل نہیں کیا تھا بلکہ خود بھی اس شعبے میں تحقیق کی۔ طب یونانی کے بارے میں بے شمار کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور علاج میں ان سے استفادہ کرتے تھے لیکن بیماریوں کے لیے اپنے نسخے بناتے تھے۔ غریبوں سے فیس نہیں لیتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ کوئی امیر جاگیردار، زمیندار علاج کے لیے آتا تھا تو اس سے علاج کے لیے سامان منگوالیا کرتے تھے۔ سامان آنے کے بعد دوائیں تیار کی جاتی تھیں۔ مریض کو جتنی ضرورت ہوتی اتنی دے کر باقی دوا کے جزو محفوظ کرلیا کرتے تھے اور اس سے دوسرے مریضوں کو دوا دیا کرتے تھے مگر یہ آمدنی کا کوئی بہت بڑا ذریعہ نہیں تھا۔ آنے والے مریضوں میں اکثر غریب ہوتے تھے ان کو ایسے ہی دوا دے دیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں جہالت زیادہ تھی خاص طور سے غریب مسلمان پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈوں کے چکر میں بری طرح گرفتار تھے۔ علاج معالجے سے زیادہ وہ تعویذ اور عملیات کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر میاں امام الدین صاحب اس چیز سے متنفر تھے۔ ان کا کہنا تھا یہ سب چیزیں ہندومت سے آئی ہیں اور اصل اسلام سے ان کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے مگر وہ اس کے نفسیاتی اثرات کے قائل تھے۔ ایک بار مطب میں ایک بچی آئی اس کے گھر والے کہہ رہے تھے کہ اس پر اثر ہے کسی نے تعویذ کردیا ہے، میاں صاحب جانتے تھے کہ بچی بیمار ہے مگر اس پر دوا اثر نہیں کر رہی تھی کیونکہ تعویذ والی بات اس کے ذہن میں اتنی بری طرح بیٹھ گئی تھی کہ دوا اس پر بے اثر ہوتی تھی۔ اس کے نفسیاتی اثر کو ختم کرنے کے لیے میاں صاحب نے ایک انوکھی ترکیب کی۔ اُنھوں نے ایک بڑا سا کاغذ لے کر اس پر آک کے دودھ سے نقش

بنائے۔ آک ایک پودا ہوتا ہے' جس کے پتوں اور شاخوں سے ایک دودھ نما شے نکلتی ہے۔ یہ زہریلا ہوتا ہے۔ میاں صاحب اسے دوائیں بنانے میں استعمال کرتے تھے اس لیے ان کے پاس یہ چیز ہوتی تھی۔ اُنھوں نے کاغذ پر اس سے نقش بنائے' یہ خشک ہوتا ہے' تو نقش غائب ہو جاتے ہیں' اُنھوں نے بچی کو بلا کر اسے یہ کاغذ دیا اور کہا کہ اسے نہاتے وقت اپنی چوکی پر رکھ لے اگر اس پر کوئی تعویذ جیسا نقش بنا دکھائی دے تو سمجھ لے کہ تعویذ کا اثر ختم ہوگیا ہے۔ جب کاغذ گیلا ہوا تو اس پر آک کے رس سے بنے نقش ابھر آئے اور بچی خوش ہوگئی کہ اس پر کیے گئے تعویذ کا اثر ختم ہوگیا ہے۔ اور وہ صحت یاب ہوگئی۔ تو میاں امام الدین صاحب نے علاج کے ساتھ نفسیاتی طریقہ علاج بھی استعمال کیا۔ اسکول سے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے گزارا ہوتا تھا۔ کچھ زمین پٹے پر تھی اس سے سارے سال گندم اور دوسری اجناس آجاتی تھیں۔ تازہ سبزیاں بھی ملتی تھیں۔

وہ عجیب زمانہ تھا کھانے کے لیے کم تھا' آسائشیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس کے باوجود لوگ اپنی چیز دوسروں کو دیتے ہوئے نہیں ہچکچاتے تھے۔ مل کر کھانے کا رواج تھا کوئی مصیبت میں پڑتا تو سارا گاؤں اس کی مدد کرتا۔ اس میں غیر اور مسلمان کی تمیز ہی نہیں تھی' پھر وقت بدلتا گیا' لوگوں کے پاس پیٹ بھر کر کھانے کو آگیا' آسائشیں بھی آنے لگیں مگر دل تنگ ہوگئے' لوگ ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے' کوئی مشکل میں پڑجاتا تو کوئی مدد کے لیے نہ آتا' سگے بھائیوں میں بھی تیرا میرا ہونے لگا۔

میاں امام الدین صاحب گاؤں کے پروردہ تھے اور اس سے محبت کرتے تھے مگر وہ جمود کے نہیں تبدیلی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی اُنھوں نے میاں عبدالرشید صاحب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور بھیجا۔ ان پر کبھی زور نہیں دیا کہ وہ واپس گاؤں آئیں یا

ان کا مستقبل گاؤں سے وابستہ ہونا چاہیے۔ یہی نہیں بعد میں وہ خود بھی شہر منتقل ہوگئے۔ اسکول سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ میاں عبدالرشید صاحب کے پاس لاہور چلے آئے اور سمن آباد میں اپنا مطب قائم کیا۔ رہائش بھی یہیں رکھ لی۔ ساری عمر اُنھوں نے کما کر کھایا۔ یہ وضع داری ساری عمر برقرار رہی۔ جب تک زندہ رہے گھر کے خرچ میں ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ حد یہ کہ جب میاں عبدالرشید صاحب کے ساتھ رہے تب بھی ان کی کمائی میں کچھ نہ کچھ حصہ ڈالتے رہے تھے۔ حالانکہ میاں عبدالرشید صاحب اب تکمیلِ تعلیم کے بعد کمانے لگے تھے۔ یہ اس دور کی وضع داری کا ایک خاصہ تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب نے اس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ باپ عالم اور طبیب مگر روشن خیال اور دین دار تھے، ماں حقوق العباد کو جاننے والی اور کسی پر اپنی ذات کو ترجیح نہ دینے والی۔ باپ جیسے شفیق بھائی' جو ساری عمر ان کے لیے سایہ بنے رہے اور ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ جس خوش قسمت کو ایسے رشتے میسر آجائیں اور وہ پھر بھی ترقی نہ کرے تو اس کی بدنصیبی پر کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر میاں عبدالمجید صاحب جتنے باادب تھے اتنے ہی بانصیب بھی تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی اُنھوں نے گھر میں تین چیزوں کا چرچا دیکھا تھا۔ دین' تعلیم اور طب' تینوں چیزیں نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی میاں امام الدین صاحب تک آئی تھیں۔

بچپن سے میاں عبدالمجید صاحب دیکھتے آئے تھے' والد صاحب کا صبح سے شام تک کا وقت ان ہی تینوں کاموں میں گزرتا تھا۔ صبح اسکول' شام کو درس اور پھر رات تک طب اور تینوں کام ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتے تھے کوئی بھی کام جو انسان محض اپنی ذات کے لیے نہ کرے عبادت میں ہی شمار ہوتا ہے۔ یہ بات میاں عبدالمجید صاحب نے بچپن میں ہی جان لی تھی۔ ان کو اپنے بچپن کی زیادہ باتیں یاد

نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب بولنے اور سوچنے کے قابل ہوئے تو ان کو کلاسکے کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس وقت ہندو ہر میدان کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی چھائے ہوئے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی کلاس میں چند گنے چنے مسلمان بچوں کے علاوہ سارے ہی ہندو بچے تھے یہی وجہ تھی ان کے بیشتر دوست ہندو تھے۔ ان کے زیادہ تر ہمسائے ہندو تھے۔ ان کی گلی استادوں کی گلی کہلاتی تھی کیونکہ اس میں بیشتر گھر استادوں کے تھے اور ان میں سے اکثر ہندو تھے۔ ہندو گھرانوں سے تعلقات تھے۔ ذات پات کے نظام کے باوجود آنا جانا تھا۔ خوشی غمی کے مواقع پر ایک دوسرے میں شریک ہوتے تھے۔ کھانا نہیں کھاتے تھے مگر مدد کرتے تھے' جس کے ہاں شادی یا فوتگی ہوتی تھی اور دور دراز سے لوگ آتے تھے تو سارا گاؤں چارپائیاں اور بستر مہیا کرتا تھا۔ سب کے گھروں سے کھانا آتا تھا' یعنی مہمان سب کے سانجھے ہوتے تھے' اس طرح شادی کے موقع پر ایک خاص رسم نیندرا کہلاتی تھی' اس میں سارے گاؤں یا برادری والے شادی کے موقع پر ایک خاص رقم دیا کرتے تھے اس طرح شادی والے گھر پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ امداد باہمی کے اور بھی طریقے تھے جن سے غریب لوگوں کی مدد کی جاتی تھی۔

اس زمانے میں سماج سدھار اور دیہات سدھار قسم کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اس کے تحت دیہات میں اسکول اور پینے کے صاف پانی کی سہولت فراہم کی جا رہی تھی۔ یہ تحریکیں کانگریس اور دوسری پارٹیاں چلا رہی تھیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد تھا کہ اس کے تحت ان کے گاؤں میں پانی کے دو ہینڈ پمپ لگائے گئے تھے ایک ہندوؤں کے لیے اور ایک مسلمانوں کے لیے۔ ان کی وجہ سے دیہات کی عورتوں کو دور دراز سے پانی لانے سے نجات مل گئی تھی۔

میاں عبدالمجید صاحب ابھی پانچ چھ سال کے تھے' ان کے علاقے میں آب پاشی

کے لیے نہر بنائی گئی تھی۔ ان کے گاؤں کی زمینوں کو اب پانی کے لیے بارش کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لوگوں کو نہانے اور کپڑے دھونے کی سہولت بھی مل گئی تھی۔ صبح کے کاموں سے فارغ ہو کر عورتیں بچوں کو لے کر نہر پر چلی جاتی تھیں۔ خود بھی نہاتی دھوتیں، بچوں کو نہلاتیں اور گھر کے کپڑے بھی دھولیا کرتی تھیں۔ میاں عبدالمجید صاحب دوسرے بچوں کے ہم راہ چلے جاتے تھے۔ بھری گرمیوں میں نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کا جو مزہ تھا وہ بعد میں ان کو اعلیٰ درجے کے سوئمنگ پول میں تیراکی کر کے بھی نہیں آیا۔ ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کے لیے ناقابل فراموش بن گیا۔

اس روز گرمی خاصی تھی، میاں عبدالمجید صاحب یہ سوچ کر نہر کی طرف چلے گئے کہ وہاں اور بچے اور عورتیں ہوں گی۔ مگر اتفاق سے اس دوپہر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اکیلے ہی نہر میں اتر کر نہانا شروع کر دیا۔ نہر کا کنارا زیادہ گہرا نہیں تھا اسے ایک کٹاؤ کی صورت میں نہر سے ذرا آگے بڑھا دیا گیا تھا تا کہ بچوں کو پانی کے بہاؤ سے خطرہ نہ ہو اور عورتوں کو کپڑے دھونے میں بھی آسانی رہے۔ بچوں کو اس جگہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی مگر اس دوپہر وہاں کوئی نگرانی کرنے والا نہیں تھا، اور بچہ ہونے کی وجہ سے میاں عبدالمجید صاحب کو خطرے کا صحیح ادراک نہیں تھا۔ وہ اس حد سے آگے نکل گئے۔ جہاں پانی گہرا تھا اور اس کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ جب تک ان کو خطرے کا احساس ہوتا پانی ان کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ اُنھوں نے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا، اور ساتھ ہی خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ان کی کوشش تھی کسی طرح کٹاؤ تک واپس آ جائیں۔

خدا کو ان کی زندگی منظور تھی۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پڑوس میں رہنے والی ایک لڑکی بملا وہاں آ گئی۔ بملا نوجوان تھی اور اسے تیراکی بھی آتی تھی۔ اس

نے نہر میں چھلانگ لگائی اور میاں عبدالمجید صاحب کو بچالیا۔ وہ ان کو گھر لے کر آئی اور جب بتایا کہ وہ ڈوب رہے تھے تو ماں جی نے دعا کرنی شروع کردی۔ البتہ میاں امام الدین صاحب کا ردعمل خالص پدرانہ تھا۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کے ایک زوردار تھپڑ لگادیا۔ ان کو یہ تھپڑ ساری عمر یاد رہا تھا اور یہ بات بھی ساری عمر ان کے دل پر نقش رہی کہ ایک ہندو نے ان کی جان بچائی تھی۔

گاؤں کی مسجد چاروں طرف بہت پرانے' اونچے اور گھنے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ مسجد میں ایک کنواں بھی تھا۔ ڈول سے پانی نکال کر نماز کے لیے آنے والے وضو کرتے تھے اور گرمیوں میں لوگ وہاں نہاتے تھے۔ یہ پانی ان درختوں کو سیراب کرتا تھا۔ اس زمانے میں گھروں میں نہانے دھونے کا رواج نہیں تھا۔ رفع حاجت کے لیے بھی کھیتوں کا رخ کرنا ہوتا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد تھا بچپن میں وہ اس کنویں سے پانی نکال کر گھنٹوں نہاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اسکول سے آتے ہی سیدھا کنویں کا رخ کرتے تھے اور ساری دوپہر نہانے کے بعد شام کو گھر آتے تھے۔

مسجد کی طرح مندر بھی تھا اور اس کے اردگرد بھی بے شمار اونچے اور گھنے درخت تھے۔ جن کی چھاؤں میں ٹھنڈک ہوتی تھی۔ شدید گرمی کے دنوں میں گاؤں کے لوگ ان کے تلے بسیرا کرتے تھے۔ اس جگہ ہندوؤں کا کنواں تھا۔ اور ساتھ ہی ایک خوب صورت باغیچہ تھا جو اسی کنویں کے پانی سے سیراب ہوتا تھا۔ کلاسکے کے ہندوؤں میں چھوت چھات کافی تھا۔ وہ پانی اور کھانے کے معاملے میں حساس تھے۔ ان کے کنویں اور ہینڈ پمپ الگ تھے جن سے کوئی مسلمان پانی نہیں لے سکتا تھا۔ اسی طرح کھانے کا تھا' ان کے گھروں اور خاص طور سے باورچی خانے والے حصے میں مسلمانوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندو ان کو رسوئی کہتے ہیں اور ان میں

چھوت چھات کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ گاؤں کے باہر سے آنے والے ہندو مہمان کے لیے ہندو گھروں سے کھانا آتا تھا' اور مسلمان مہمان کے لیے مسلمان گھروں سے کھانا دیا جاتا تھا۔

اسکول جانا شروع کیا تو دوست بن گئے' میاں عبدالمجید صاحب شام کو ان کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت کرکٹ' فٹ بال کا کسی کو پتا نہیں تھا۔ بچے زیادہ تر گلی ڈنڈا یا ہاکی کھیلتے تھے۔ ہاکی بھی کوئی باقاعدہ نہیں ہوتی تھی بلکہ درخت کے نیچے سے بڑی شاخیں لے کر اور کوئی گول پتھر تلاش کر کے اس سے ہاکی کھیلی جاتی تھی پھر چھپن چھپائی اور ایک دوسرے کو پکڑنے والا کھیل ہوتا تھا' ذرا بڑی عمر کے لڑکے کبڈی اور کشتی کھیلتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے یہ کھیل زیادہ نہیں کھیلے مگر کھیلے ضرور۔ پتنگ بازی بھی کی تھی مگر ایک حد تک۔ اصل میں میاں امام الدین صاحب کو کھیل ایک حد سے زیادہ پسند نہیں تھے۔ اُنھوں نے اپنے بچوں کو کوئی کھیل کھیلنے سے نہیں روکا مگر ان کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ کھیل بس کھیل رہے' اصل میں ان کو اپنی ساری توجہ تعلیم پر دینی تھی۔

گاؤں میں مشترک رسم ورواج تھے۔ میاں صاحب نے ان کو دوسرے مذاہب کی عزت کرنا سکھائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ تم کسی دوسرے کے مذہب کی عزت نہیں کروگے تو وہ تمہارے مذہب کی عزت کیسے کرے گا۔ میاں امام الدین صاحب کے دوستوں میں سکھ بھی تھے اور ہندو بھی۔ ان میں جو سکھ تھے ان کا گھر میں زیادہ آنا جانا تھا اس وجہ سے میاں صاحب نے گھر میں تمباکو اور سگریٹ کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ وہ نہ تو خود سگریٹ پیتے تھے اور نہ ہی کسی دوسرے کو پینے کی اجازت تھی۔ اس طرح گھر میں گائے کے گوشت کی بھی ممانعت تھی کہ میاں صاحب کے ہندو دوستوں کو اس چیز سے تکلیف نہ ہو۔ اُنھوں نے خود ہی رواداری والا ماحول رکھا تھا اور

بچوں کو بھی یہی تعلیم دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میاں امام الدین صاحب کی جتنی عزت مسلمان کرتے تھے اتنی ہی عزت گاؤں کے ہندو کرتے تھے۔ سکھ وہاں نہیں تھے' ان کے گاؤں آس پاس تھے' وہ میاں صاحب سے ملنے آتے تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے کہ جب ان کی دادی کا انتقال ہوا تو گاؤں کا کوئی بھی غیر مسلم فرد ایسا نہیں تھا جو جنازے سے غیر حاضر ہوا ہو۔ وہ قبرستان کے اندر تو نہیں گئے تھے لیکن قبرستان کی حد تک جنازے کا ساتھ دیا تھا۔ رواداری کا یہ ماحول تقسیم تک جاری رہا تھا اور پھر ہندو سکھ بھارت چلے گئے' کلاسکے کے مسلمانوں نے ہندوؤں کو بچانے کے لیے انوکھی بات کی تھی مگر اس کے بعد ہندوؤں کا وہاں رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ گاؤں میں دو ہندو قتل ہوئے تھے۔ مگر قتل کے عوامل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ ذاتی دشمنی پر مبنی تھے۔ اتفاق سے قتل ہونے والے دونوں ہندو سود کا کاروبار کرتے تھے اور بے شمار لوگ ان کے مقروض تھے۔ کسی دل جلے نے ان کو مار دیا' یہ فرقہ وارانہ قتل نہیں تھے اس کے باوجود ہندوؤں میں دہشت پھیل گئی' آس پاس کے ہندو سکھ پہلے ہی جا چکے تھے' اُنھوں نے بھی جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ان کے محلے کی ہندو عورتیں ماں جی کے پاس آئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ماں جی ان کا زیور امانت کے طور پر رکھ لیں' ماں جی نے ان کا زیور لیا اور حفاظت کے خیال سے جانوروں کے طویلے میں دفن کر دیا۔ اس زمانے میں لوگ ایسا ہی کرتے تھے۔ سونا اور زیور زمین میں دبا دیتے تھے کہیں چولہے کے نیچے یا جانوروں کے طویلے میں۔ جب یہ ہندو عورتیں اپنے خاندانوں کے ساتھ جانے لگیں تو اپنے زیور لینے آئیں' ماں جی نے ان کی امانت ان کو واپس کر دی۔ حالانکہ وہ سیروں کے حساب سے سونا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو نہیں یاد کہ ان کی ماں جی کے پاس سونے کی کوئی شے تھی' اس زمانے میں سونا صرف دولت مند گھرانوں میں ملتا تھا'

حالانکہ آج کی طرح اس کی قیمت بہت زیادہ نہیں تھی مگر لوگ قناعت پسند تھے' سونے کا خیال کم ہی آتا تھا' البتہ ہندو گھرانوں میں سونے کا رواج زیادہ تھا' ویسے بھی وہ اسے مقدس شے سمجھتے تھے اور اسے لکشمی دیوی سے منسوب کرتے تھے اس لیے غریب سے غریب ہندو کے گھر میں سونا ہوتا تھا۔ تقسیم کے وقت بہ ظاہر بے حد غریب نظر آنے والے ہندوؤں کے گھروں سے اتنا سونا نکلا تھا کہ لوٹ مار کرنے والے بھی حیران رہ گئے تھے۔

1940ء کا عشرہ تبدیلیوں کا عرصہ تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب ان دنوں لاہور میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ میاں امام الدین صاحب نے میاں عبدالمجید صاحب کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ اُنھیں لاہور میں مزید تعلیم کے لیے کسی اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ میاں عبدالمجید صاحب لاہور شہر دیکھیں اس کی زندگی سے مانوس ہو جائیں اور کالج بھی دیکھیں جہاں ان کے بھائی ہاسٹل میں قیام پذیر تھے۔ یہ اتفاق تھا یا میاں امام الدین صاحب نے جان بوجھ کر مارچ کا انتخاب کیا تھا۔ لاہور میں ۲۳ مارچ کو منٹو پارک کے ایک جلسے میں مسلم لیگ الگ وطن کی قرار داد پیش کرنے والی تھی۔ وہ جس روز لاہو پہنچے ایک دن پہلے خاکساروں کے جلوس پر پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔ بے شمار مسلمان شہید اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے لاہور کی سڑکوں پر شہدا اور زخمیوں کا خون دیکھا۔ لوگوں نے مارے عقیدت کے اس خون کے گرد اینٹیں لگا کر ان پر پھولوں کے انبار ڈال دیے تھے۔ ماحول سخت کشیدہ تھا اس کے باوجود منٹو پارک کا جلسہ اپنی جگہ برقرار تھا۔

بائیس مارچ کے دن قائداعظم اور دوسرے مسلمان لیڈر اسپتالوں میں زخمی خاکساروں کی عیادت کو گئے' تو اس کا شہر کے ماحول پر اچھا اثر ہوا تھا اور لوگوں کے

دلوں سے فساد کا خوف ختم ہوگیا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے لیے شہر ہی کسی عجوبے سے کم نہیں تھا اس کے مقابلے میں گوجرانوالہ کوئی گاؤں لگتا تھا۔ کلا سکے کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مگر جب اُنھوں نے منٹو پارک کا بے انتہا مجمع دیکھا تو یہ منظر ہمیشہ کے لیے ان کے ذہن پر نقش ہوگیا تھا۔ اس روز ان کو یقین ہوگیا تھا کہ مسلمان اپنا الگ وطن قائم کرلیں گے۔ میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں۔

''اس وقت میں صرف سات برس کا تھا۔ اور مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ مسلمان اپنے لیے ایک الگ وطن کے خواہش مند تھے۔ میں نے جب منٹو پارک کا جلسہ دیکھا اور بس جلسہ ہی دیکھا۔ اس وقت انگریزی تو کیا اردو ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مجھے لوگوں کا ہجوم اور جذبہ یاد ہے ان لوگوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر مجھے اس وقت یقین ہوگیا تھا کہ یہ جو چاہ رہے ہیں اسے حاصل کرلیں گے۔''

میاں امام الدین صاحب پرائمری لیگ کے علاقائی صدر تھے اور اردگرد کی جتنی بھی لیگ تھی وہ سب ان کے ہاتھ میں تھی۔ جب چوپال میں بیٹھتے تھے تو اردگرد سے مسلم لیگ کے کارکن اور ہمدرد ان سے ملنے آتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب بھی یہ سب دیکھتے اوران کی باتیں سنتے تھے ان کے اندر یہ سب خود بہ خود نقش ہوتا چلا گیا۔ وہ زندگی میں کبھی سیاسی آدمی نہیں رہے مگر ان کی مسلم لیگ سے جو ایک جذباتی وابستگی تھی وہ ساری عمر برقرار رہی۔ اگرچہ اس وابستگی کی بنیاد پر اُنھوں نے نہ تو عملی سیاست میں حصہ لیا اور نہ ہی صنعت کاری میں اپنے مرتبے کو حکومتوں میں داخل ہونے کے لیے استعمال کیا۔ ان کی ساری وابستگی ذہن کی حد تک رہی۔

منٹو پارک کے اس تاریخی جلسے نے میاں عبدالمجید صاحب کے شعور پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ 1947ء میں آزادی تک اس شعور نے تیزی سے ترقی کی۔ میاں عبدالمجید صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو حصول پاکستان سے زیادہ اس کے مقصد پر نظر

رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اسکول کے زمانے میں محسوس کرلیا تھا کہ ایک الگ ملک کا سب سے بڑا مقصد خود اپنے اور ملک کی ترقی کے مواقع تلاش کرنا تھا اور یہ مواقع ایسے ہی نہیں مل سکتے تھے بلکہ اس کے لیے سخت محنت اور مقصد سے لگن لازمی تھی۔ اس سوچ کے زیراثر اُنھوں نے اسکول کے زمانے سے خود کو سخت محنت کا عادی بنالیا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے آدمیوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی تعمیر میں سب سے بڑا عنصر محنت کا ہوتا ہے۔ لیاقت اور قسمت بھی اپنا حصہ بناتی ہیں جیسے مکان کی تعمیر میں سریا اور سمنٹ بھی لگتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ حصہ ریتی بجری کا ہوتا ہے۔ کامیابی کے اس نسخے نے ہر جگہ میاں عبدالمجید صاحب کا ساتھ دیا۔

جیسا کہ بتایا کہ اُنھوں نے ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں تین چیزوں کو پایا تھا' دین سے محبت' علم سے لگن اور طب سے خدمت' دین کا علم جس کی بنیاد قرآن ہے اُنھوں نے گھر میں میاں امام الدین صاحب سے پڑھا۔ بعد میں ضروری دینی مسائل اور عبادات کے طریقے بھی ان سے سیکھتے رہے۔ ان کے سینے میں علم کی شمع ہی میاں صاحب نے روشن کی تھی۔ وہ ان کو بچپن سے سمجھاتے رہے تھے کہ علم وفن کا جو بھی شعبہ منتخب کرو اس کے اعلیٰ ترین مدارج تک جاؤ۔ کبھی محنت سے جی نہ چراؤ اور جب ایک راستہ پکڑ لو تو اسے اس وقت تک نہ چھوڑو جب تک اس کی تمام منازل نہ طے کرلو۔

ذرا بڑے ہونے پر میاں عبدالمجید صاحب کو بھائی کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان دنوں میاں عبدالرشید صاحب صرف تعلیمی چھٹیوں میں یا امتحان پاس کر لینے کے بعد گھر آتے تھے۔ وہ گاؤں کے پہلے لڑکے تھے جنھوں نے بی اے کیا تھا۔ ان کا سفر اس پر ہی ختم نہیں ہوا تھا اُنھوں نے عربی اور فارسی کو زبان کے طور پر پڑھا تھا اور اس میں عالموں کی سی مہارت حاصل کرلی تھی۔ پھر اُنھوں نے ایم اے میں داخلہ

لیا۔ اس کے لیے اُنھوں نے ریاضی کو منتخب کیا۔ یہ ان کا پسندیدہ ترین مضمون تھا۔ مگر بدقسمتی سے بعض عوامل کی بناء پر وہ ایم اے مکمل نہ کرسکے۔

جن دنوں وہ ایم اے کررہے تھے پنجاب اسمبلی میں رپورٹر کی نوکری نکلی۔ میاں عبدالرشید صاحب کے ایک دوست وہاں کام کرتے تھے اُنھوں نے ان سے کہا۔ ''یارتم آجاؤ...... تمھیں ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔''

''میں تو ایم اے کررہا ہوں۔'' اُنھوں نے عذر کیا۔

''تعلیم بھی جاری رکھنا۔''

خود میاں عبدالرشید صاحب بھی ملازمت کی ضرورت محسوس کررہے تھے۔ وہ بیس سال سے زیادہ کے ہوچکے تھے اور اس عمر میں لڑکے کمانے لگتے تھے۔ اپنے گھر والوں کی مدد کرتے تھے۔ ان کو بھی میاں امام الدین صاحب پر انحصار کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُنھوں نے میاں صاحب سے اس ملازمت کی اجازت چاہی۔ اُنھوں نے جواب دیا۔

''کرلو......اگر تعلیم میں حرج نہ ہو۔''

میاں عبدالرشید صاحب نے ان کو یقین دلایا کہ ان کی تعلیم کا حرج نہیں ہوگا اور ان کو اجازت مل گئی مگر بعد میں وہ اس دعوے کو نبھانہ سکے کیونکہ ایم اے اور وہ بھی ریاضی میں۔ پوری توجہ مانگتا تھا اس زمانے میں معیار تعلیم بھی بہت بلند تھا۔ اور تعلیم پر پوری توجہ نہ دینے والے طالب علم پیچھے رہ جاتے تھے اور پیچھے رہنا میاں عبدالرشید صاحب کو کسی صورت گوارا نہیں تھا اُنھوں نے تمام تعلیمی مدارج اعلیٰ نمبروں سے پاس کیے تھے یہی وجہ تھی کہ جب وہ گاؤں آتے تو ان کی خصوصی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ گاؤں کے بڑے بزرگ خاص طور سے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے اور یہ اعزاز کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب بھائی سے محبت بھی کرتے تھے اور رشک بھی...... وہ ماں سے کہتے......''ماں جی......سب بھائی سے پیار کرتے ہیں مجھ سے کیوں نہیں کرتے؟''

ماں جی انھیں سمجھاتی تھیں۔''پتر......رشید پتر شہر میں پڑھتا ہے......گاؤں کا نام روشن کرتا ہے۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہے' اس لیے سب اس سے پیار کرتے ہیں۔''

''ماں جی ......میں بھی شہر جاؤں گا' خوب پڑھوں گا' اچھے نمبروں سے پاس ہوں گا تو سب مجھ سے بھی محبت کریں گے؟''

اگرچہ ماں جی کا دل دوسرے بیٹے کو بھی نظروں سے دور کرنے کے خیال سے دہل جاتا تھا' مگر اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کی حوصلہ افزائی کی۔''کیوں نہیں پتر۔''

''تب میں ضرور لاہور جاؤں گا اور وہاں خوب سارا پڑھوں گا۔''

''ہاں پتر ضرور جانا۔'' ماں جی نے دل پر جبر کر کے کہا۔

میاں عبدالمجید صاحب کلاسکے کے اسکول میں پڑھنے لگے۔ بہ ظاہر یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کا عام سا اسکول تھا' مگر میاں عبدالمجید صاحب اس دور کے بارے میں کہتے ہیں۔

''وہ بڑا منفرد دور تھا۔ ہمارے ہاں ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ نہ بجلی تھی' نہ گیس اور نہ ہی پانی کی لائن۔ جنگ کی وجہ سے زندگی کی عام اشیا بھی نایاب تھیں۔ مٹی کا تیل تک نہیں ملتا تھا۔ درخت سے لکڑی کاٹنے کی ممانعت تھی اس لیے غریب غربا اُپلوں سے آگ جلاتے تھے خود ہمارا چولہا اور تندور اُپلوں سے گرم ہوتا تھا۔ مگر میں نے جو اس بے مایہ مگر بے حساب دینے والے گاؤں میں سیکھا' وہی ساری عمر

میرے کام آیا۔ میری کامیابی کی بنیاد ہی یہ دور تھا۔ میں نے اس وقت بڑوں کی عزت کرنا سیکھا' استاد اور بزرگوں کا رتبہ کیا ہوتا ہے یہ جانا' سب سے بڑھ کر دوسرے مذاہب کا احترام سیکھا جو ساری عمر میری گھٹی میں رہا۔ ہمارے گاؤں میں چند دن کا بھی بڑا، بڑا ہوتا تھا۔ اس سے بے تکلفی سے پیش آنا یا ایسی بات کر جانا جو اسے ناگوار ہو ہم نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ میں دوستوں سے ہٹ کر بات کر رہا ہوں کیونکہ ان میں بے تکلفی اور ہنسی مذاق چلتا ہے۔ اگر کبھی غلطی سے کسی بڑے کو کوئی بات ناگوار گزر جاتی اور وہ شکایت لے کر گھر تک آجاتا تو مجھے نہیں یاد کہ ہم سرزنش سے بچے ہوں۔ اس وقت اپنے بچے کی طرفداری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خاص طور سے ہمارے گھر میں نہ صرف سخت سرزنش کی جاتی تھی بلکہ اکثر اوقات تو سزا دینے کی نوبت بھی آجاتی تھی۔

اس کے باوجود جب میں کلاسکے سے نکل کر لاہور آیا جو کلاسکے کی نسبت بہت بڑا اور جدید شہر تھا۔ پھر جب اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ آیا' تو یہاں کی دنیا ہی مختلف تھی۔ مگر مجھے کبھی اجنبیت یا ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی اور دنیا میں آ گیا ہوں۔ کیونکہ میاں امام الدین صاحب مجھے سمجھاتے رہا کرتے تھے۔ اُنھوں نے ایک روز مجھے اپنے پاس بٹھا کر ایک بات کہی جو مجھے آج تک یاد ہے۔

''پتر......تم آج ایک گاؤں میں ہو' یہ الگ دور ہے' آج یہ جگہ تمہاری دوست اور تمہارا ماحول ہے' کل جب تم کہیں اور جاؤ گے تو وہ جگہ تمہارا ماحول اور تمہاری دوست بن جائے گی۔ اس طرح جگہیں اور ماحول بدلتے رہیں گے۔ کبھی اپنے ماحول کو مت بھولو اور کبھی ایک ماحول سے نکل کر دوسرے ماحول میں دوسری جگہ جاتے ہوئے مت ہچکچانا' ایسا کرو گے تو اپنے ماضی سے جڑے رہو گے۔ اس کی خوشیاں اور پیار یاد رکھو گے اور دوسری جگہ سے بھی دل لگاؤ گے۔''

میاں امام الدین صاحب کی یہ بات میرے دل میں اس طرح جم گئی کہ تقریباً ستر برس ہونے کو آئے ہیں۔ میں آج بھی اس کی لذت' حلاوت اور نکتہ آفرینی محسوس کرتا ہوں۔ میں میاں امام الدین صاحب کا شکرگزار ہوں اُنھوں نے چند الفاظ میں میرے مستقبل کی راہیں آسان کردی تھیں اور مجھے ہمیشہ کے لیے میرے ماضی سے جوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی میں ساری دنیا گھوما' میں برسوں یورپ میں رہا' میں کلا سکے سے نکلا تو لاہور اور پھر برطانیہ سے ہوتے کراچی آکر آباد ہوا کبھی کوئی جگہ مجھے اجنبی نہیں لگی۔ میں نے اس کے نئے ماحول کو اپنالیا۔ اسے دوست بنالیا۔ مگر ساتھ ہی میں کبھی اپنے ماضی کونہیں بھولا۔ اس کی یاد تاعمر میرے دل میں تازہ رہی' آج بھی ہے۔ میں نے اپنے ماضی کورسم ورواج کا بوجھ نہیں بنایا اسے خوش بُو کی طرح اپنے سینے میں اتارلیا۔ یہ ماضی آج بھی مجھے اتنی ہی خوشی دیتا ہے جتنا آج سے ستر برس پہلے دیا کرتا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔''

میاں عبدالمجید صاحب نے ایک بات اور بچپن میں سیکھی تھی وہ یہ کہ گاؤں میں لڑائیاں صرف بڑوں میں ہوتی تھیں۔ بچوں میں نہیں۔ یعنی میاں امام الدین صاحب کا اگرکسی سے جھگڑا ہے' بات چیت یا گھروں میں آنا جانا بند ہے تو اس سے بچوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب ان کے گھروں میں بھی جاتے تھے اوران کے بچوں کے ساتھ بھی کھیلتے تھے۔ بلکہ جن سے جھگڑا یا بات چیت بند ہوتی تھی ان سے بھی پورے ادب واحترام سے پیش آتے تھے۔ اس طرح ان کے بچے بھی میاں امام الدین صاحب کے سامنے مؤدب رہتے تھے۔ اس معاملے میں رشتے داری یا مسلمان برادری کی تخصیص نہیں تھی بلکہ غیر مسلم بھی اس زمرے میں آتے تھے۔ جھگڑا ان کے بڑوں سے ہوتا تھا' بچوں سے نہیں۔

گاؤں کی ایک خاص شے، بلکہ خاص کردار میراثی ہے یہ شہروں میں نہیں ملتا۔

اس کا شمار گاؤں کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتا تھا حالانکہ یہ سب سے زیادہ کام کرتے تھے۔ لوگوں کی غمی خوشی کی تقریبات میراثی بھگتاتے تھے' رشتے کرانا اور بات آگے چلانا بھی ان کا کام تھا۔ غمی خوشی کی خبریں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ شادی بیاہ کے دعوت نامے یہ لے کر جاتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ گانوں اور ٹپوں سے لوگوں کا دل بہلاتے تھے۔ خوشی کی تقریبات میں جگت بازی کر کے لوگوں کو خوش کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان کو خوشیاں بانٹنے والا دیکھا تھا اور انھیں دکھ ہوتا تھا جب لوگ عزت دینا تو ایک طرف رہا ان کی بے عزتی کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کو سب سے نچلے درجے میں رکھا جاتا تھا۔ معززین کے سامنے ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کھڑے رہتے تھے۔ کھانا وہ بناتے تھے مگر ان کو ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کی اجازت نہیں تھی۔

میاں امام الدین صاحب ان چیزوں کے سخت خلاف تھے۔ وہ ذات پات اور اونچ نیچ کے نظام کو نہیں مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا اللہ نے سب کو برابر کا پیدا کیا ہے۔ اور اسلام نے سب سے پہلے یہی بت توڑا تھا۔ میاں امام الدین صاحب اپنی محفل میں ان لوگوں کو عزت دیتے تھے اور کبھی ان سے بے عزتی کا سلوک نہیں کیا۔ ان کے مطب میں جب مریض آتے تھے وہ سب ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے' اس پر ذرا اونچی حیثیت کے امراء کو اعتراض ہوتا تھا وہ چاہتے تھے کہ میاں امام الدین صاحب مریضوں میں بھی حفظ مراتب برقرار رکھیں۔ مگر میاں امام الدین صاحب نے کبھی ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی جب تک وہ گاؤں میں مطب کرتے رہے' سارے مریض ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے۔

بچپن کی خواہشات بھی انوکھی ہوتی ہیں۔ اس وقت وہ شے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی ہے جو کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد بالکل بے کار لگنے لگتی ہے۔ میاں

عبدالمجید صاحب بھی خواہشات سے خالی نہیں تھے۔ جن دنوں وہ پانچویں درجے میں تھے، اُنھوں نے نہ جانے کہاں ایک ریلے سائیکل دیکھ لی۔ اس زمانے میں سائیکل کا رواج بڑھا تھا اور گاؤں دیہات میں بھی سائیکل نظر آنے لگی تھی۔ ان کا دل مچل اٹھا کہ ان کے پاس بھی سائیکل ہو۔ یہ زیادہ منہگی بھی نہیں ہوتی تھی۔ ساٹھ ستر روپے میں مل جاتی تھی۔ لیکن میاں امام الدین صاحب سے کہنے کی تو ہمت نہیں تھی۔ اُنھوں نے ماں جی سے فرمائش کی، رات سونے سے پہلے ماں جی ان کو کہانی سناتی تھیں۔ یہ لوک کہانیاں ہوتی تھیں ان میں سبق آموز قصے ہوتے تھے۔ میاں امام الدین صاحب جب فرصت میں ہوتے تو تاریخ اسلام، مسلمان فاتحین اور بزرگان دین کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔

"ماں جی مجھے سائیکل لینی ہے۔"

"کون سی پترّ......" ماں جی شاید سمجھی نہیں تھیں۔

"ماں جی ......ریلے سائیکل۔"

"اچھا......میں میاں صاحب سے کہوں گی۔"

میاں عبدالمجید صاحب خوش ہوگئے۔ میاں امام الدین صاحب ماں جی کی بات مان جاتے تھے۔ مگر اس معاملے میں کئی دن گزر گئے۔ نہ تو میاں امام الدین صاحب نے ان سے کچھ کہا اور نہ ماں جی نے جواب دیا۔ اُنھوں نے ایک رات پھر ماں جی سے کہا۔ "ماں جی ...... سائیکل۔"

"پترّ میں نے میاں صاحب سے کہہ دیا ہے، اب بار بار کہنا تو اچھا نہیں لگتا۔"

میاں امام الدین صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے سمجھ لیا کہ میاں صاحب انھیں سائیکل دلانے کے حق میں نہیں ہیں درحقیقت یہ شوق ہی شوق تھا ان کو سائیکل کی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں میں تمام

جگہیں ایک دوسرے سے کچھ ہی مسافت پر تھیں اور گوجرانوالہ شہر بارہ میل دور تھا۔ سائیکل پر وہاں جانے کی میاں عبدالمجید صاحب کو نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی طاقت۔ اس لیے ان کو سائیکل نہیں ملی تھی۔ شاید امام الدین میاں صاحب واضح انکار کر کے ان کی دل شکنی بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے چپ رہے شاید ان کے ذہن میں ہو کہ بعد میں میاں عبدالمجید صاحب کو سائیکل دلا دیں گے مگر بعد میں یہ بات بھی ان کے ذہن سے نکل گئی اور ان کی خواہش دل میں رہ گئی۔

عجیب بات ہے کہ اولین ملازمت سے لے کر یورپ جانے اور وہاں بہترین کارخانوں میں کام کرتے ہوئے بھی ان کی یہ خواہش برقرار رہی۔ مگر جب وہ سائیکل لینا چاہتے تو کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ وہ سائیکل لے نہیں پاتے تھے۔ ظاہر ہے مسئلہ مالی وسائل کی فراہمی کا ہوتا تھا۔ اس دور میں جب اُنھوں نے کمانا شروع کیا تو تنخواہیں بھی زیادہ نہیں تھیں اور ان کی اکثر ملازمتیں دراصل تربیتی کورس تھے۔ وہ برطانیہ بھی اسکالرشپ پر پڑھنے اور تربیت حاصل کرنے گئے تھے۔ ان کو معمولی سی آمدنی ہوتی تھی جسے جیب خرچ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ برطانیہ میں قیام کے دوران اُنھوں نے بچت کر کے کچھ رقم جمع کر لی۔ برطانیہ میں سائیکل لینا بے کار تھا۔ اس لیے اُنھوں نے جو پہلی سواری حاصل کی وہ ایک کار تھی۔ یہ فاکس ویگن اُنھوں نے جرمنی سے لی تھی۔

ان کو پہلی سواری کار ملی تھی بعد میں ایک سے بڑھ کر ایک کار ان کے زیرِ استعمال رہی مگر ان کی پہلی سائیکل والی بچپن کی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ اُنھوں نے گھڑ سواری بھی کی اور گاؤں کی نہر میں کشتی بھی چلائی۔ بس ایک اس سائیکل کی حسرت پوری نہ کر سکے۔

اسکول کی تعلیم کے علاوہ ان کو پڑھنے کے لیے کوئی چیز کم ہی دستیاب ہوتی

تھی۔ کلاسکے میں اخبارات اور رسائل کا گزر نہیں تھا۔ میاں امام الدین صاحب کی ایک لائبریری تھی لیکن اس میں زیادہ تر دقیق مذہبی موضوعات پر کتب تھیں۔ ان کے لیے میاں امام الدین صاحب نے خاص طور سے لاہور سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ''پھول'' لگوا کر دیا تھا جو ہر مہینے باقاعدگی سے ڈاک سے آتا تھا۔ اس میں زیادہ تر اسلامی اور اصلاحی موضوعات پر کہانیاں چھپتی تھیں۔ میاں عبدالمجید صاحب نے یہی رسالہ پڑھا بلکہ وہ اسے میٹرک کے زمانے تک پڑھتے رہے تھے۔ اس کے بعد جب وہ لاہور آئے تب بھی تعلیم کے علاوہ دوسری چیزیں پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

جب وہ پرائمری پاس کر کے کلاسکے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے گاؤں میں جدید رسل و رسائل کا یہ عالم تھا کہ پورے گاؤں میں ایک بھی ریڈیو نہیں تھا۔ پرانی نسل کے بیشتر لوگ بالکل ان پڑھ تھے اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے تھے۔ وہ انگوٹھا لگاتے تھے۔ گنے چنے گھروں میں اخبارات اور رسائل آتے تھے۔ درمیانی نسل اور نئی نسل کے اکثر پڑھے لکھے لوگ شہروں کا رخ کر رہے تھے۔ جیسے میاں عبدالرشید صاحب اور ان کے بعد میاں عبدالمجید صاحب بھی لاہور چلے گئے تھے۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب کی عمر دس سال کے آس پاس تھی جب وہ لاہور گئے۔ اور ان کو کلاسکے میں کل دس سال رہنے کا موقع ملا۔ مگر وہاں اُنھوں نے جو سیکھا اور جانا وہ ساری زندگی ان کے کام آیا، ان کے ایک استاد کہتے تھے۔

''بچوں آنے والے وقت میں تبدیلیاں بہت تیزی سے آئیں گی' نت نئی چیزیں روز سامنے آیا کریں گی جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔''

کلاسکے کے اس ہندو استاد کی پیش گوئی میاں عبدالمجید صاحب نے پوری ہوتے دیکھی۔ بہت بچپن میں جب وہ دوسری جماعت میں تھے تو ان کے ایک

ہمسائے شہر سے ایک بہت بڑا ریڈیو لے کر آئے تاکہ اسکول کے بچے جدید دور کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ بچوں نے حیرت سے اس چیز کو دیکھا جس سے مختلف آدمیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ اس طرح استاد ان کو سڑکوں، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے بارے میں بتاتے تھے کہ یہ کس طرح سے انسان کے لیے آسانی پیدا کرتے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ان کو اسکول میں تربیت بھی دی جاتی تھی جیسے ناخن باقاعدگی سے تراشنا ہے، کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا اور پاؤں میں جوتا یا چپل لازمی پہننا ہے۔

اس وقت لکھنے کے لیے کاپی پنسل نہیں ہوتی تھی اور زیادہ تر تختی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس سے لکھائی اچھی اور پختہ ہوجاتی تھی مگر اسے تیار کرنا اور صاف کرنا ایک مستقل کام تھا۔ تختی تو مل جاتی تھی اب سرکنڈے سے قلم خود بنانا ہوتا تھا استاد بھی سمجھاتے تھے کہ اچھا قلم کس طرح بنتا ہے، دوات کی سیاہی کس طرح تیار کی جاتی تھی پھر جب ایک روز تختی لکھ لی جاتی تھی تو اسے کس طرح سے دھو کر اگلے روز کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ ساری چیزیں تربیت کا ایک حصہ ہوتی تھیں۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد میاں عبدالمجید صاحب کے لیے میاں امام الدین صاحب نے فیصلہ کیا کہ ان کو بڑے بھائی میاں عبدالرشید صاحب کے پاس لاہور بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں اسکول کی بقیہ تعلیم مکمل کرسکیں۔ میاں امام الدین صاحب کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کالج کا دور آنے تک وہ لاہور میں رہ کر خود کو شہر کا عادی بنالیں گے اور ان کو کالج کے تعلیمی ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان کی لاہور روانگی سے پہلے فیصلہ ہوا کہ وہ وظیفے کا امتحان دے کر لاہور جائیں گے اس وقت مڈل اور سیکنڈری کے لیے وظیفے کا امتحان الگ سے دینا پڑتا تھا اور یہ امتحان کسی دوسرے اسکول میں ہوتا تھا۔ میاں عبدالمجید

صاحب کو بھی امتحان دینے کے لیے گوجرانوالہ کے ایک ہائی اسکول میں جانا پڑا تھا۔ اُنھوں نے یہ امتحان پاس کرلیا تھا اور ان کو آگے تعلیم کے لیے وظیفہ مل گیا تھا۔

لاہور جانے کے فیصلے نے ان کی زندگی پر دور رس نتائج مرتب کیے تھے۔ دس سال کی عمر تھی اور گھر میں ایک ہی بچّے تھے' میاں عبدالرشید صاحب ان دنوں لاہور چلے گئے تھے جب میاں عبدالمجید صاحب پیدا ہوئے تھے اس طرح ماں جی کے پاس ایک وقت میں ایک ہی بچہ ّرہا تھا۔ ماں جی کے پاس صرف میاں عبدالمجید صاحب تھے جب میاں امام الدین صاحب نے ان کو بھی پڑھنے کے لیے لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا تو ماں جی تڑپ گئی تھیں وہ روز میاں امام الدین صاحب سے احتجاج کرتی تھیں کہ ان کے پاس ایک ہی بچہّ ہے اور اسے بھی دور بھیج رہے ہیں۔ میاں امام الدین صاحب کا موقف تھا کہ یہ ان کی بہتری کے لیے ضروری ہے۔ ماں جی ان سے کہتی تھیں۔

''میاں صاحب اب تو کلاسکے کا اسکول آگے ہوگیا ہے۔ جب تک میاں عبدالمجید اس کی ساری جماعتیں پاس نہ کرلے اسے یہیں رہنے دیں۔''

''یہاں سے پڑھنے اور لاہور سے پڑھنے میں بہت فرق ہے۔ یہ شہر میں رہے گا تو وہاں کے طور طریقے جلد سیکھ لے گا اور آگے اسے مشکل نہیں ہوگی۔''

''میاں عبدالرشید بھی تو انٹر کرکے لاہور گیا تھا۔''

''اس وقت مجبوری تھی' اسے شروع میں بھیجتا تو وہ کس کے پاس رہتا' اب مجید کے لیے موقع ہے اس کا بھائی ہے تو یہ ابھی کیوں نہ جائے۔''

''میاں جی میرے پاس کیا رہ جائے گا؟''

اس بار میاں امام الدین صاحب کو غصہ آگیا تھا۔ ''یہ بچہّ ہے تو کیا اسے گود میں بٹھائے رکھیں۔ یہ ترقی کیسے کرے گا۔''

''کیا ترقی کرنے کے لیے اس کا دور جانا ضروری ہے۔''

''بہت ضروری ہے۔ یہ یہاں سے نکلے گا دنیا دیکھے گا تب کچھ کر سکے گا۔ تم بتاؤ یہاں یہ کیا کر سکتا ہے۔''

تب ماں جی نے دل پر صبر کی سل رکھ کر میاں عبدالمجید صاحب کو لاہور جانے کی اجازت دے دی۔ مگر جب وہ تانگے پر گوجرانوالہ جانے کے لیے گھر سے نکل رہے تھے تو اندر ماں جی رو رہی تھیں اور یہ سارے راستے روتے گئے تھے۔ ان کے لیے تو گوجرانوالہ ہی گھر سے دور تھا' جہاں آدمی صبح جا کر شام کو واپس آجاتا تھا' میاں عبدالمجید صاحب کئی بار میاں امام الدین صاحب کے ساتھ گوجرانوالہ گئے تھے' اس زمانے کے ایک معروف عالم دین مولانا داؤد غزنوی، میاں امام الدین صاحب کے دوستوں میں سے تھے ان کا سرخ وسفید نورانی چہرہ میاں عبدالمجید صاحب کو اچھا لگتا تھا۔ ان کا گھر دوسری منزل پر تھا سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا' کلاسکے میں چند ایک گھر پکی اینٹوں سے بنے تھے جب کہ گوجرانوالہ میں بے شمار پکے مکانات تھے' پکی سڑکیں تھیں جن پر لاریاں چلتی تھیں۔ ریل اسٹیشن تھا اور مین لائن کا اسٹیشن تھا اس پر کلکتہ تک سے گاڑیاں آتی تھیں۔ گوجرانوالہ کے پہلوان مشہور تھے' ان میں سے بعض تو رستم ہند بھی ہوئے تھے۔ دوسرے شہروں سے بھی پہلوان آتے تھے اور دنگل ہوتے تھے تو کلاسکے کے لوگ بھی دیکھنے جاتے تھے۔ دنگلوں کے علاوہ بھی لوگ محض پہلوانوں کو دیکھنے کے لیے جاتے تھے ان کو پیسے دیے جاتے تھے تو وہ آتے اور پنڈال میں کپڑے اتار کر محض لنگوٹ میں چکر لگاتے تھے۔ لوگ شرط لگاتے کہ کس کا جسم زیادہ تنومند ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کو جب لاہور بھیجا گیا تو ان کے ذہن میں تھا کہ میاں امام الدین صاحب چاہتے ہیں وہ پڑھ لکھ کر بڑے افسر بن جائیں تو کئی سال بعد

ان کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔ ایک بار میاں امام الدین صاحب نے ان کو بتایا کہ جب میاں عبدالرشید صاحب نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا تو گاؤں کے لوگ مبارک دینے آئے کہ میاں صاحب آپ کے بیٹے نے تو کمال کردیا ہے اب اسے پٹواری بنوادیں تاکہ یہ گاؤں کے مسائل حل کرے۔ میاں امام الدین صاحب نے انکار کردیا۔ کہ نہیں ابھی یہ اور پڑھے گا۔ اس کے بعد میاں عبدالرشید صاحب نے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا تو پھر لوگ مبارکباد دینے آئے اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ اسے تحصیل دار یا تھانے دار بنوا دیں کیونکہ یہ عہدے بہت طاقت ور ہوتے ہیں اور ان سے لوگوں کو اور گاؤں کو بہت فائدہ ہوگا۔ مگر میاں امام الدین صاحب کا انکار برقرار رہا اُنھوں نے لوگوں سے کہا نہیں یہ ابھی اور پڑھے گا۔ لوگ مایوس ہوکر چلے گئے۔ پھر جب میاں عبدالرشید صاحب نے بی اے بھی پاس کرلیا تو گاؤں والے اور دوست احباب پھر مبارک باد دینے آئے اور اس بار یہ رائے دی کہ میاں امام الدین صاحب بیٹے کو ڈپٹی کمشنری کی نوکری کے لیے تیار کریں۔ کلاسکے کا ایک نوجوان ڈپٹی کمشنر بنے گا تو گاؤں کا نام روشن ہوگا۔ گاؤں کے سارے مسائل حل ہوجائیں گے' مگر اُنھوں نے اس بار بھی انکار کردیا۔ نہیں' یہ ابھی اور پڑھے گا۔

خود میاں امام الدین صاحب کا کیا عالم تھا' اسکول کی نوکری اور اس کے بعد طب اور درس تو ہوتا ہی تھا۔ گاؤں کے ڈاک خانے کے لیے کام کرتے تھے' اسکول میں آوارہ جانوروں کو روکنے کے لیے ایک پھاٹک لگایا گیا تھا اس کی دیکھ بھال یعنی اسے کھولنے اور بند کرنے کی ذمّے داری بھی میاں امام الدین صاحب پر تھی اتنے بہت سارے کام کرنے کے بعد وہ بچوں کی تعلیم کے لیے بھی وقت نکالتے تھے۔ کیونکہ ان کا مقصد مناصب یا پیسہ نہیں بلکہ کام تھا۔ عہدے اور پیسہ دونوں اس دنیا

میں رہ جاتے ہیں، اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں دونوں جگہ انسان کا کام ہی اس کے کام آتا ہے۔ بچوں کو بھی تعلیم دلانے اور اس پر اصرار کرنے کے بعد ان کا مقصد کبھی یہ نہیں رہا کہ ان کے بچے مناصب حاصل کریں۔ روپے پیسے کے لحاظ سے ترقی کریں، ان کا مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ بچے علم حاصل کریں اور کام کریں۔ اپنے کام سے نام روشن کریں اور اس سے پہچانے جائیں۔ جب میاں امام الدین صاحب نے یہ قصہ میاں عبدالمجید صاحب کو سنایا تو اُنھوں نے اس وقت اسے اپنے ذہن میں بٹھالیا تھا اس کے بعد نوکری یا پیسہ کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔

میاں امام الدین صاحب نے اولاد کی رہنمائی کی ان کے لیے راستے صاف کیے اور جب وہ آگے بڑھنے لگے تو کبھی ان کو پیچھے سے نہیں روکا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو شدت سے احساس تھا کہ ان کے باپ نے ان کو دیا ہی دیا تھا کبھی کچھ لیا نہیں تھا۔ لینا تو ایک طرف اُنھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ جب میاں عبدالمجید صاحب کراچی میں اپنا بزنس سیٹ کر چکے تھے خوشحالی آ گئی تھی تو ایک دن وہ لاہور میں میاں امام الدین صاحب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ وہ خواہش کرتے تھے کہ ان کے پاس ایک باغ ہو اور وہ اس کی دیکھ بھال کریں۔ میاں امام الدین صاحب میاں عبدالرشید صاحب کے پاس رہ رہے تھے اور سمن آباد میں مطب کرتے تھے۔ شافی دواخانہ کے نام سے تھا۔ یہاں پر بھی وہی عالم تھا غریبوں سے علاج او ردوا کی کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی بات سن کر اُنھوں نے کہا۔

''چھوڑو بیٹا' کیا کرنا ہے باغ کا...... اسے بھی مرجھا جانا ہوتا ہے۔''

''تب ہم کیا کریں...... آپ کوئی حکم دیں...... کوئی نصیحت کریں۔'' میاں عبدالمجید صاحب نے مودبانہ گزارش کی۔

''ایک نصیحت ہے مگر وعدہ کرو اسے پورا کرو گے۔''

''جی میں وعدہ کرتا ہوں۔'' اُنھوں نے اقرار کیا۔

''میں نے تم دونوں کو جتنی تعلیم دلائی ہے، مجھ سے وعدہ کرو تم اپنے بچوں کو اس سے زیادہ تعلیم دلواؤ گے۔ یہی میری محنت کا صلہ ہے اور یہی میرا معاوضہ ہے۔''

میاں عبدالمجید صاحب نے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے اور اُنھوں نے اپنا وعدہ نبھانے کی پوری کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

زمانہ بدلتا ہے

کلاسکے ایک الگ دنیا تھی اور لاہور ایک الگ دنیا...... میاں امام الدین صاحب نے انھیں سمجھایا تھا کہ ماحول بدلنے سے کبھی مت پریشان ہونا اسے اپنا دوست بنا لینا......میاں عبدالمجید صاحب نے ایسا ہی کیا تھا۔ ماں اور گاؤں سے بچھڑنے کا غم فطری تھا مگر اُنھوں نے جلد خود کو لاہور جیسے بڑے شہر میں ایڈجسٹ کرلیا تھا۔ اس وقت میاں عبدالرشید صاحب پنجاب اسمبلی میں ملازمت کرنے کے ساتھ عربی اور فارسی بھی پڑھ رہے تھے۔ ان کی رہائش لاہور کے ایک نواحی گاؤں ڈھولن وال میں تھی۔ یہ ملتان روڈ سے ذرا دُور واقع تھا۔ اس میں میاں عبدالرشید صاحب نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ ملتان روڈ پر ہی یتیم خانے کے سامنے اسلامیہ مڈل اسکول تھا۔ جلال الدین اکبر نامی ایک صاحب جو شاعر اور بہت قابل آدمی تھے اس کے ہیڈ ماسٹر تھے تو میاں عبدالمجید صاحب کو اس اسکول میں داخل کرادیا گیا۔

اسکول انجمن حمایت اسلام کا تھا اور اس کا ماحول خالص اسلامی رکھا گیا تھا۔ بچے یونیفارم اور سر پر رومی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ اسکول کا تعلیمی معیار جتنا بلند تھا اس کے قواعد وضوابط بھی اتنے ہی سخت تھے۔ ان کو انجمن سے لگاؤ اس زمانے میں ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے پنجاب اور شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کے لیے

انجمن کا کردار کسی طرح بھی علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے کم نہیں تھا اس کے تحت درجنوں اسکول اور کالجز قائم کیے گئے تھے جن سے تعلیم پا کر مسلمانوں کی نئی نسل نے تحریک پاکستان میں فعال کردار ادا کیا۔ اس اسکول سے میاں عبدالمجید صاحب کے لیے مشکل دور شروع ہوا اور اس مشکل پر قابو پانے کے لیے محنت کی عادت ان کو اسی دور میں پڑی تھی۔

کلاسکے میں ان کی اردو بھی درست نہیں تھی۔ انگریزی سے بالکل ناواقف تھے' اسلامیہ اسکول میں آنے کے بعد نہ صرف انگریزی نصاب میں شامل ہوئی بلکہ اردو کا بہتر ہونا بھی لازمی شرط ٹھہری۔ آنے والی جماعتوں میں انگریزی کا عمل دخل بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ جب اُنھوں نے میٹرک کا امتحان دیا تو سوائے اردو اور اسلامیات کے سارے ہی پرچے انگریزی زبان میں تھے۔ کلاسکے کے اسکول میں ہندو اور سکھ بچّے خاصے تھے۔ پھر گورنمنٹ اسکول ہونے کی وجہ سے وہاں کا ماحول مختلف تھا۔ جب کہ انجمن کے اسکول کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ صبح اسمبلی میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی تھی اس کے بعد سب بچے مل کر لب پہ آتی ہے دعا گاتے تھے' مسلمانوں کا لباس اور اسلامی تہذیب سے بھرپور ماحول...... اساتذہ بچوں کو جدید تعلیم تو دیتے تھے مگر ساتھ میں ان کے ذہن کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے لازمی بات تھی کہ یہ سب تحریک پاکستان کے پرجوش حامی تھے۔

لاہور کے اساتذہ کا معیار بہت بلند تھا۔ اپنے مضمون میں ان کی دسترس تو تھی ہی' یہ سب ادب اور تاریخ کے بھی ماہر تھے۔ بچوں کو بہترین انداز میں سکھاتے تھے۔ اسکول کا نظام بہت اچھا تھا۔ طلبہ کو تمام ہی چیزیں اسکول کی جانب سے فراہم کی جاتی تھیں۔ میاں عبدالمجید صاحب اسکول کے ماحول کی حد تک تو تیزی سے ہم آہنگ ہو گئے تھے لیکن اصل مسئلہ زبانوں کا تھا ان کی انگریزی اور اردو بہتر نہیں تھی جب

میاں عبدالرشید صاحب کو پتا چلا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ وہ روزانہ دو اخبار دیکھا کریں، ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ تھا۔ اس کے معیار کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ اس کا ایک مدیر شہرۂ آفاق انگریز مصنف رتھ یارڈ کپلنگ بھی رہا تھا۔ انقلاب کا معیار بھی بہت بلند تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے یہ دونوں اخبار دیکھنا شروع کیے۔ آج کل کے لحاظ سے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ گاؤں سے پرائمری پاس کرکے آیا ہوا بچّہ ادبی زبان کے حامل اخبارات پڑھ سکے۔ جب کہ خود میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں کہ انگریزی ایک طرف رہی کہ یہ تو اُنھوں نے پڑھی ہی نہیں تھی، ان کی اردو بھی بہتر نہیں تھی۔

اس کے باوجود اُنھوں نے مختصر سے عرصے میں ان دونوں اخبارات کی مدد سے اپنی اردو اور انگریزی اتنی بہتر کرلی تھی کہ ان دونوں مضامین میں ان کو پھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ آرام سے ہر کلاس کا امتحان پاس کرتے چلے گئے تھے۔

ڈھولن وال میں میاں عبدالرشید صاحب نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ کام کاج کے لیے ایک نوکر بھی تھا مگر اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب سے کہا ”آج سے گھر کا سامان لانا، کھانا بنانا اور سارا حساب کتاب رکھنا تمھاری ذمے داری ہے۔“

اس طرح ان کے لیے ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک تو یہ تھا کہ والدہ ان کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ باورچی خانے اور اس کے سامان کا ان کو کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ ان کی تربیت کا آغاز تھا یہ چیزیں بعد میں ان کے بہت کام آئیں۔ سالن نوکر بناتا تھا اسے سامان لاکر دینا ان کی ذمّے داری تھی۔ باورچی خانے میں کوئی چیز کم یا ختم نہ ہو، پھر جاکر تندور سے روٹی لگوانی ہوتی تھی۔ یہ سارے کام اسکول سے آکر ان کو کرنے ہوتے تھے۔ اس تربیت نے ان کو یہ سکھا دیا تھا کہ آدمی کو کہیں اکیلے رہنا ہو

تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اپنا حساب کتاب کس طرح رکھ سکتا ہے، اسی زمانے میں میاں عبدالمجید صاحب نے چائے بنانا سیکھی۔

ڈھولن وال میں زیادہ تر آرائیں آباد تھے۔ یہ پڑھے لکھے اور ادبی ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ شام کو جب میاں عبدالرشید صاحب کام سے آتے تو مکان کے سامنے تھڑے پر پڑھے لکھوں کی محفل جمتی تھی۔ اس میں میر انیس سے لے کر شورش کاشمیری تک اور غالب سے لے کر اقبال کی شاعری تک بحثیں اور باتیں ہوتی تھیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کے ذمے اس محفل میں شریک لوگوں کو چائے کی فراہمی جاری رکھنا تھا۔ بعض اوقات تو ان کو پانچ چھ بار چائے بنا کر میاں عبدالرشید صاحب اوران کے دوستوں کو پیش کرنا پڑتی۔ چائے بنانے اور اسے پیش کرنے کے آداب اُنھوں نے اس زمانے میں ہی سیکھے تھے۔

چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر میاں عبدالمجید صاحب کی گاؤں واپسی ہوئی مگر میاں عبدالمجید صاحب کو اسلامیہ ہائی اسکول چھوڑنے کا قلق تھا وہاں کا معیار تعلیم اور ماحول بہت اچھا تھا۔ پھر وہ احمد نگر ڈسٹرکٹ اسکول میں آئے یہاں سے مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا اس زمانے میں آٹھویں کا امتحان بھی بورڈ لیا کرتا تھا۔ احمد نگر اسکول میں بھی ان کو اچھے اساتذہ ملے تھے۔ یہ علاقہ چٹھوں کا تھا۔ ان کی زمینداریاں تھیں۔ اس وقت بڑی زمینداریاں نہیں ہوتی تھیں۔ عام طور سے لوگوں کے پاس ایک دو مربع زمین ہوتی تھی ۔ یہ تو بعد میں جاگیرداروں نے پاکستان بننے کے بعد ترقی کی اور درجنوں مربعوں کے مالک بن گئے۔ کرم الٰہی چٹھہ، موجودہ سیاست دان حامد ناصر چٹھہ کے دادا تھے ان کا شمار بھی بہت قابل رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ کرم الٰہی چٹھہ صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین بھی تھے اور یہ ایک طرح سے ان کا اپنا اسکول تھا اس کے لیے اُنھوں نے چند بہت قابل اور اعلیٰ معیار کے استاد رکھے تھے۔ یہی وجہ

تھی کہ وہاں دور دور سے بچے داخلہ لینے کے لیے آتے تھے۔

ان دنوں ایک واقعہ پیش آیا۔ بارشوں کی وجہ سے اسکول کی کچی چار دیواری کا ایک حصہ گر گیا۔ اسکول والوں کے پاس اتنے فنڈز نہیں تھے کہ اسے بنواتے اس لیے فیصلہ ہوا کہ یہ دیوار خود بنائی جائے گی۔ سارے اساتذہ اور طلبا نے مل کر یہ دیوار اٹھائی تھی۔ وہ مٹی کھود کر لاتے تھے اور اسے گیلا کر کے اس سے دیوار اٹھاتے تھے۔ مضبوطی کے لیے اس میں پتھر بھی رکھتے جاتے تھے۔ سب نے مل کر ایک دن میں یہ دیوار اٹھادی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب بھی اس کام میں شامل تھے اور اُنھوں نے یہ سبق سیکھا کہ کوئی خرابی ہو تو اسے خود ہی دور کرنے کی کوشش کرو نہ کہ اس بات کا انتظار کیا جائے کہ حکومت اسے ٹھیک کرے گی۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی ان کا دل لگ گیا تھا۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ میاں امام الدین صاحب کی یہ بات رہی کہ جہاں جاؤ اس ماحول کو اپنا دوست بنالو۔

امتحان کے دنوں میں ان کو تین مہینے تک اسکول کے ہاسٹل میں رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ دن میں تو عام تعلیم ہوتی تھی۔ کلاس ورک ہوتا تھا۔ رات کو اساتذہ بچوں کو الگ سے امتحان کی تیاری کراتے تھے۔ اوراس ٹیوشن کی کوئی فیس بھی نہیں لیتے تھے۔ مقصد صرف اسکول کی نیک نامی تھی ان کے اسکول کا بچہ بورڈ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے کوئی پوزیشن لے تو اس میں ان کے اسکول کا نام ہوتا۔ حد یہ کہ بچوں کو کھانا بھی اسکول کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا۔ مڈل کا امتحان وزیر آباد کے ایک اسکول میں دینا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب اسکول کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہاں گئے تھے اور امتحان تک وہیں ایک ہاسٹل میں رہے تھے۔ اس امتحان میں بھی اُنھوں نے اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی یعنی 1941ء میں پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تھا اور مڈل اسکول کا امتحان اُنھوں نے 1946ء میں پاس کیا۔

1941ء سے 1947ء تک کا دور برصغیر اور خاص طور سے پنجاب کی تاریخ میں بے حد ہلچل کا دور تھا۔تحریک پاکستان عروج پر تھی ایک طرف مسلمان متحد ہو کر ایک الگ وطن کی جنگ لڑ رہے تھے تو دوسری طرف انگریز اور ہندو کی ہر ممکن کوشش تھی کہ پاکستان نہ بنے اور مسلمان کسی طرح متحدہ برصغیر پر راضی ہو جائیں۔ اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر رہے تھے۔ دھونس' دھاندلی' جبر اور لالچ' کوئی حربہ استعمال کرنے سے نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے مسلمانوں کے اندر سے لالچی اور مفاد پرستوں کو اپنے ساتھ ملا کر انگریز اور ہندو نے پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

مگر خوش قسمتی سے مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ یعنی عام مسلمان اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ان کے جان و مال' آزادی وعزت اور دین و مذہب کی حفاظت صرف پاکستان میں ممکن ہے اور یہ سارے مسلمان مسلم لیگ اور قائداعظم کی پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ پلڑے کا ایسا وزن تھا جس نے ترازو کے کانٹے کو پاکستان کے حق میں جھکا دیا 1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی تمام ہی نشستیں جیت لی تھیں۔ کانگریس' جمعیت العلمائے ہند اور سرخ پوش تحریک کے محاذ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب اگرچہ اتنے بڑے نہیں تھے کہ سیاسی سرگرمیوں اور تحریک میں عملی حصہ لیتے' مگر ان کی تمام تر ہمدردی اور دلچسپی تحریک پاکستان کے ساتھ تھی۔ میاں عبدالرشید صاحب بھی تحریک پاکستان کے حامی تھے۔ ان کے دوستوں میں بیشتر مسلم لیگی تھے ان میں ایک خاص نام حمید نظامی صاحب کا تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب کی ان سے گہری دوستی تھی اور وہ اکثر ان سے ملنے جاتے تھے۔کبھی کبھی میاں

عبدالمجید صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ حمید نظامی کا دفتر ایک طرح سے مسلم لیگ کا جنکشن تھا۔ وہاں لیگی کارکن آتے تھے، لیگی لیڈر آتے تھے اور لیگ کے بارے میں خبریں آتی تھیں، بحث ومباحثے چلتے تھے اور لوگوں کا زور اس پر ہوتا تھا کہ پاکستان ضرور بنے گا۔

سیاست سے ہٹ کر ادب اور ادبی چٹکلوں پر بات چلتی تھی اردو کے معاملے میں لاہور اور دہلی کے مسلم پریس کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کی جاتی تھیں اور اخبار کے دفتر میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد میاں عبدالمجید صاحب نے ایک بار پھر لاہور کا رخ کیا۔ میاں عبدالرشید صاحب وہاں سکونت اختیار کرچکے تھے ان کی دوسری شادی میاں امام الدین صاحب کی مرضی سے ہوئی تھی۔ بیگم پڑھے لکھے خاندان سے تھیں اور خود بھی اسکول ٹیچر تھیں۔ میاں عبدالرشید صاحب نے لاہور میں کرائے کا مکان لے لیا تھا یہ بھی ڈھولن وال میں تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب کے پاس وقت تھا ابھی نویں جماعت میں داخلہ ہونا تھا اس لیے اُنھوں نے لاہور کی سیاحت شروع کردی۔ شہر جانے کے لیے تانگہ مل جاتا تھا۔ ملتان روڈ سے بسیں بھی ملتی تھیں۔ شہر چھ سات کلومیٹر دور تھا اور وہاں تک پیدل جانا ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے چند مہینے میں سارا لاہور دیکھ لیا۔ اس زمانے میں لاہور اتنا بڑا شہر نہیں تھا مگر چھوٹا بھی نہیں تھا پرانے لاہور کی آبادیاں وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں خاص لاہور کی ثقافت جھلکتی تھی۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں لاہور بڑا شہر تھا کراچی کی آبادی اتنی نہیں تھی۔ اسے بس بندرگاہ اور چھاؤنی ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل تھی پھر جب یہ پاکستان کا دارالخلافہ بنا اور ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے بڑی تعداد میں یہاں کا رخ کیا تو یکایک ہی کراچی

پھیلنے لگا۔

منٹو پارک سے لے کر مقبرۂ جہانگیر تک یہاں دیکھنے کے لیے بے شمار مقامات تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے فراغت کے ان دنوں میں لاہور کو اچھی طرح دیکھا پھر ان کے نویں جماعت میں داخلے کا وقت آ گیا۔ اس وقت لاہور میں ایک اعلیٰ درجے کا مسلم ماڈل ہائی اسکول قائم ہوا تھا۔ یہ اسکول دراصل بہت سارے مسلمان دانش وروں اور ماہرین تعلیم نے مل کر قائم کیا تھا اور چوہدری طفیل محمد اس کے اولین پرنسپل تھے۔ تعلیم کے میدان میں ان کا نام جانا پہچانا رہا ہے۔ وہ انگریزی زبان کے ماہر تھے اور اُنھوں نے اسکول کا معیار ایسا رکھا تھا کہ کسی طرح انگریزی تعلیمی اداروں سے کم نہیں تھا۔

دراصل مسلم ماڈل ہائی اسکول گورنمنٹ ماڈل اسکول کے طرز پر قائم کیا گیا تھا جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پاس واقع تھا۔ اس لیے ملتان روڈ سے ذرا فاصلے پر ایک علاقہ ہے، جنگ نگر تو وہاں پر جگہ ملی۔ یہ ہندوؤں کا علاقہ تھا اور تقریباً ساری آبادی ہندو تھی۔ مسلمان چند ایک ہی تھے، جنگ نگر میں ایک مسلمان خاتون بیگم فاطمہ تھیں، ان کی بہت بڑی کوٹھی، اراضی اور دوسری جائے داد تھی۔ مسلم لیگ سے تعلق تھا اور فلاحی کاموں میں پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ خاص طور سے جب بہار میں مسلم کش فسادات ہوئے تھے اور مسلمانوں کے گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے تب فاطمہ بیگم نے بے سہارا ہونے والی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کو لا کر اپنی اراضی پر آباد کیا تھا۔ یہ لوگ کئی نسلوں سے اب بھی اس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ فاطمہ بیگم کی کوٹھی کے ساتھ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ اُنھوں نے اسے اسکول کے لیے معمولی کرایہ پر دیا۔ یوں اسکول قائم ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے بچے اس اسکول میں داخل کرائیں۔ مقصد یہ تھا کہ بڑے لوگ اپنے بچے داخل

کرائیں گے تو اسکول کو شہرت ملے گی اور دوسرے بھی اپنے بچوں کو یہاں داخل کرائیں گے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے 'احسان' اخبار کے مالک احسان الٰہی نے اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کرایا تھا۔ ان کا صحافتی اور ادبی حلقوں میں ایک نام تھا۔ احسان اخبار مکمل طور پر مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے کاز کے لیے وقف تھا۔ اس کے علاوہ ایک ادبی رسالہ ''ادب لطیف'' بھی نکلتا تھا اس کے مالک چودھری برکت علی بھی اسکول کے سرپرستوں میں سے تھے۔ ان کا ایک کتب خانہ مکتبہ اُردو کے نام سے تھا۔ ادب لطیف دراصل اس مکتبہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت صاحب حیثیت لوگ اپنی قوم کا درد رکھتے تھے اور اس کی ترقی کے لیے عملی طور پر کوشاں رہتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو اس اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ ملا۔

اس وقت میٹرک یعنی نویں اور دسویں جماعت میں الگ سے نصاب کا تصور نہیں تھا۔ بلکہ سائنس اور آرٹس کے مضامین ملا کر پڑھائے جاتے تھے۔ سائنس' آرٹس اور کامرس کی تخصیص اس وقت کالج میں جا کر ہوتی تھی یعنی انٹرمیڈیٹ میں، اس لیے میاں عبدالمجید صاحب نے سائنس کے مضامین نویں جماعت سے پڑھے اور اس سے ان کو تحریک ہوئی کہ آگے چل کر سائنس کو بہ طور مضمون رکھیں۔ اتفاق سے ان کو یہاں اسلامیہ مڈل اسکول کے کچھ ساتھی بھی مل گئے وہ وہاں سے مڈل کر کے مسلم ماڈل ہائی اسکول میں آ گئے تھے۔ اسکول میں قابل اساتذہ جمع کیے گئے تھے جو نہ صرف بڑی محنت سے بچوں کو پڑھاتے تھے بلکہ ان کو غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر اکساتے تھے۔

کھیلوں کے علاوہ اسکول کے تحت ڈرامے بھی پیش کیے جاتے تھے جن میں اسکول کے طلبا حصہ لیتے تھے۔ تقریری مقابلے ہوتے تھے' اسکول کے تحت تقریری

مقابلے اور ڈراموں کے مقابلے بھی ہوتے تھے جن میں بڑی شخصیات مہمان خصوصی بن کر آتی تھیں، ان میں حمید نظامی اور شورش کاشمیری جیسے لوگ نمایاں تھے۔ ایک ایسا ہی ڈراموں کا مقابلہ لاہور کے باغ جناح کے اوپن تھیٹر میں ہوا تھا۔ اس میں مسلم ماڈل ہائی اسکول نے اچھی پوزیشن حاصل کی تھی۔ وائی ایم سی اے میں تقریری مقابلے ہوتے تھے تو اس سے طلبہ میں غیرنصابی سرگرمیوں کا رجحان بھی ہوتا تھا' اسکول کی ہاکی اور کرکٹ کی ٹیمیں تھیں۔ ان کھیلوں کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا ہے 1946ء کا سال تحریک پاکستان کے حوالے سے اہم ترین سال تھا۔ بلکہ بعض بالغ نظر کہتے ہیں پاکستان اس سال ہی بن گیا تھا بس اس کا اعلان 1947ء میں جا کر ہوا تھا۔ 1946ء کے انتخابات نے پاکستان کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اور انگریز جان گیا تھا کہ اب مسلمان پاکستان سے کم کسی شے پر راضی نہیں ہوں گے، شہر سے دوری کی وجہ سے مسلم ماڈل ہائی اسکول براہ راست ان ہنگاموں کا حصہ نہیں بنا تھا جو لاہور میں جاری تھے مگر اساتذہ اور طلبہ دلی طور پر اس تحریک کے ساتھ ہی تھے۔ اس اسکول کا معیار میاں عبدالمجید صاحب کے سابقہ اسکولوں سے کہیں بہتر تھا کیونکہ یہ ماڈل اسکول بھی تھا اس لیے اس میں معیار پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ دوسرے اسکولوں میں عام طور سے دوپہر کو چھٹی ہو جاتی تھی مگر مسلم ماڈل ہائی اسکول میں دوپہر کے بعد بھی کلاسز جاری رہتی تھیں۔ اس وجہ سے طلبہ دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے اس کے علاوہ اسکول میں کینٹین بھی تھی وہاں سے بھی معمولی سی رقم کے عوض معیاری کھانا مل جاتا تھا۔ اس طرح سے بچے شام تک پڑھتے تھے۔ کیونکہ ان کو بورڈ کا امتحان دینا ہوتا تھا اور وہاں مقابلہ سخت ہوتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو اضافی محنت کرائی جاتی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے وہ اکثر مغرب کے وقت گھر میں آتے تھے۔

ابھی اسکول کا سال جاری تھا‘ 1946ء کے انتخابات ہوئے‘ بنگال کے علاوہ پنجاب میں بھی مسلم لیگ اکثریتی جماعت بن کر سامنے آئی۔ مگر انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے ملی بھگت کر کے یونی نسٹ پارٹی کے جاگیرداروں کو آگے کیا اور سر خضر حیات وزیراعظم بن گئے اس پر مسلم لیگ نے احتجاجی تحریک شروع کی۔ مسلم ماڈل ہائی اسکول کے اساتذہ اور انتظامیہ دل وجان سے مسلم لیگ کے حامی تھے اس لیے اُنھوں نے بھی احتجاج میں بھرپور شرکت کی تھی۔ سارے اساتذہ اور سارے طلبہ جاتے تھے‘ پہلے جلوس نکلتا تھا جس میں حکومت کے خلاف نعرے لگتے تھے اس کے بعد موچی دروازے پر جلسہ ہوتا تھا مقررین مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت میں دھواں دھار تقریر کرتے تھے جلسے کے بعد کوئی ایک مسلم لیگی رہنما اپنی گرفتاری دیتا تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب جلوسوں میں کم ہی شریک ہوتے تھے اور احتجاجی مارچ میں تو صرف ایک بار گئے تھے اس کی وجہ بڑے بھائی کی طرف سے ان کو ہدایت تھی کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر دیں اور سیاسی سرگرمیوں میں شرکت سے گریز کریں مگر عبدالمجید صاحب چوری چھپے چلے ہی جاتے تھے۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں سنی تھیں۔ جیسے سید عطاءاللہ شاہ بخاری تھے‘ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے تھے تو فجر کی اذان تک جاری رہتی تھی۔ خطاب میں ایسا سحر ہوتا تھا کہ کوئی ایک بندہ بھی پنڈال سے اٹھ کر نہیں جاتا تھا اس طرح شورش کشمیری بھی بلا کے خطیب تھے۔ لوگ ان کو سننے کے لیے جلسوں میں آتے تھے۔

عجیب بات تھی اتنے عرصے لاہور میں رہے مگر میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی مولانا ظفر علی خان کو نہیں دیکھا۔ حالانکہ اس زمانے میں لاہور کا کوئی صحافی ان سے

زیادہ مشہور نہیں تھا۔ زمیندار اخبار اور مسلم لیگ سے اپنی غیر متزلزل وابستگی کی وجہ سے سارے برصغیر میں جانے جاتے تھے۔ ان کا اخبار زمیندار بار بار بند ہو جاتا تھا کیونکہ وہ اس میں کچھ نہ کچھ ایسا چھاپ دیا کرتے تھے جس سے حکومت بھڑک جاتی اور اخبار پر پابندی لگا دی جاتی۔ آئے دن ضمانت کی ضبطی نے اخبار کی مالی حالت تباہ کر دی تھی لہٰذا مسلمان عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ اخبار کی مالی مدد کریں۔ زمیندار اخبار کے نام سے صندوق بنوا کر جگہ جگہ رکھوا دیے گئے تھے لوگ ان میں حسب توفیق چندہ ڈال دیا کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ایسا بھی دیکھا کہ لاہور کے باہر سے غریب کسان اور ہنر مند اپنی سبزیاں' اجناس اور ترکاریاں فروخت کرنے آتے تھے تو واپسی میں کچھ رقم ان صندوقوں میں ڈال جاتے تھے۔ ایک بار وہ اسکول کے طلبہ کے ساتھ زمیندار کا دفتر دیکھنے گئے تھے معمولی سا دفتر تھا لوگ سامنے کھلے میں چارپائیاں ڈال کر بیٹھے تھے۔ اسکول میں طلبہ کی اخلاقی تربیت پر بہت زور دیا جاتا تھا اس وقت طلبہ کو بتاتے تھے کہ تربیت کے بغیر تعلیم ایسی ہی ہے جیسے گولی بندوق کے بغیر۔ اسلام کے اخلاق کے بارے میں بتایا جاتا تھا اس وقت کے استاد خود اخلاق کا عملی نمونہ تھے۔ طلبہ کو اپنے عمل سے تعلیم دیتے تھے۔

کالج کے زمانے میں میاں عبدالمجید صاحب نے مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ اس زمانے میں کالجوں اور یونیورسٹیز میں مشاعرے ایک لازمی تقریب کے طور پر ہوتے تھے اور طلبہ کی بھی ان سرگرمیوں میں شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ آج کل لاہور میں جہاں اسٹیٹ بینک کی عمارت ہے اس وقت وہاں ایک بینک بنا تھا۔ آسٹریلیا سے آنے والے مسلمانوں نے آسٹریلیشیا بینک بنایا تھا اور اس کا شمار برصغیر کے اولین مسلم بینکوں میں ہوتا تھا۔ آسٹریلیشیا بینک کے احاطے میں ایک مسجد تھی جس کے ساتھ ایک لائبریری رضاکارانہ طور پر بنائی گئی تھی۔ مسجد کی اس لائبریری کے

انچارج ہیلے کالج آف کامرس میں بھی بطور لائبریرین کام کرتے تھے۔ جن کے ساتھ میاں عبدالرشید صاحب کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ اسی مسجد میں جمعہ کے خطیب علامہ علاؤالدین صدیقی تھے جو نظریاتی اعتبار سے پکے اور سچے مسلم لیگی تھے، جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر بنے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے وہاں بڑے بڑے مسلم رہنماؤں کو دیکھا خاص طور سے لیگی قائدین وہاں آتے تھے اور قیام پاکستان کے حوالے سے طلبہ سے بات کرتے تھے۔

وہ دور ہر لحاظ سے متحرک اور پرجوش تھا ایک طرف تو ادبی اور شاعری کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان اصناف سخن میں نت نئے تجربات کیے جارہے تھے تو دوسری طرف آزادی کی تحریک تھی۔ خاص طور سے مسلمان اس معاملے میں پرجوش تھے۔ جلسے جلوس جاری تھے۔1946ء کے موسم گرما میں اسکول کی چھٹیاں آ گئیں اور میاں عبدالمجید صاحب گاؤں آ گئے۔ انتخابات کے بعد گاؤں میں بھی سیاسی طور پر اضطراب پایا جاتا تھا خاص طور سے ہندو پریشان تھے۔ اب تک وہ سمجھ رہے تھے کہ پاکستان کا نعرہ محض جذباتی باتیں ہیں اور انگریز جب بھی یہاں سے جائے گا پورا برصغیر بلاشرکت غیرے ہندوؤں کا ہو جائے گا۔ مگر انتخابات نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں اب ہندو پریشان تھے کہ پاکستان بنا اور پنجاب اس میں شامل ہو گیا تو ان کا کیا بنے گا۔ پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ تھا اس نے پاکستان میں لازمی شامل ہونا تھا۔

اس زمانے میں قائداعظم نے مسلم لیگ کا فنڈ قائم کر کے مسلم عوام سے اپیل کی کہ سب مسلمان چاہے وہ امیر ہوں یا غریب اس فنڈ میں ایک آنہ چندہ دیں۔ چار آنے میں سولہ پیسے ہوتے تھے اور سولہ آنے سے ایک روپیہ بنتا تھا۔ جب میاں عبدالمجید صاحب نے اس بارے میں سنا تو اُنھوں نے سارے گاؤں کے لڑکوں کو جمع

کیا اور ان کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ گاؤں میں گھر گھر گئے، کسی نے پیسے دیے، کسی نے آٹا اور کسی نے گندم دی، بعض نے مرغی کا انڈا دیا، ان سب چیزوں کو جمع کر کے ان کی فروخت سے ملنے والے پانچ روپے لے کر وہ میاں امام الدین صاحب کے پاس آئے۔ ''میاں صاحب یہ ہم نے مسلم لیگ کے فنڈ میں دینے کے لیے جمع کیے ہیں آپ ان کو قائداعظم کو بھجوا دیں۔''

میاں امام الدین صاحب خوش ہو گئے تھے اُنھوں نے یہ پانچ روپے قائداعظم کے نام منی آرڈر کر دیے۔ مسلم لیگ کے فنڈ میں صرف اسی طرح چندہ دیا جا سکتا تھا اور باقی کسی طرح بھی چندہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پورے ملک سے روزانہ ہزاروں کی تعداد میں منی آرڈر قائداعظم کو مل رہے تھے اس لیے میاں عبدالمجید صاحب نے سوچا ہی نہیں تھا کہ قائداعظم اس کی رسید خود بھیج سکتے ہیں مگر وہ حیران رہ گئے جب چند ہفتے بعد ان کے منی آرڈر کی رسید قائداعظم کے دستخط کے ساتھ ڈاک سے آئی۔ باوجود اس کے کہ قائداعظم بے حد مصروف تھے۔ ایسے سپہ سالار کی مصروفیت کا اندازہ کون نہیں لگا سکتا ہے جو اپنی جنگ کے فیصلہ کن مرحلے میں ہو اس کے باوجود وہ منی آرڈر کی ایک ایک رسید پر خود دستخط کر کے بھیج رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یہ بات ہمیشہ یاد رہی اور جب بھی بے حد مصروفیات کسی ذمے داری کے آڑے آتیں تو وہ قائداعظم کے اس عمل کو یاد کیا کرتے تھے۔

ان ہی چھٹیوں کے دوران الیکشن ہوئے تھے۔ چٹھہ گروپ جو پہلے یونی نسٹ پارٹی میں تھا، اب مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ دولتانہ اور میاں افتخار الدین اور شوکت حیات یہ سب مسلم لیگی تھے۔ اُنھوں نے بڑے زور و شور سے مہم چلائی تھی اور بڑے بڑے پوسٹرز اور بینرز لگائے تھے۔ ان کے پاس پیسہ تھا اور حکومت تھی۔ مسلم لیگ کے پاس سوائے رضا کار کارکنوں اور جذبے کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ بے چارے

لوگوں کو پولنگ اسٹیشن ہی نہیں لا سکتے تھے جب کہ یونی نسٹوں نے بسوں کا انتظام کر رکھا تھا پولنگ اسٹیشنوں کے باہر کھانے کا بندوبست تھا۔ لوگوں کو بسوں میں بھر کر لے جاتے تھے وہ پولنگ اسٹیشن کے باہر یونی نسٹ پارٹی کے کیمپ میں جا کر کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد ووٹ مسلم لیگ کو دے کر بس میں بیٹھ کر واپس آ جاتے تھے۔ یونی نسٹ والے بے حد خوش تھے مگر جب نتیجہ آیا تو گوجرانوالہ سے مسلم لیگ کے تمام امیدوار کامیاب رہے تھے۔ حامد ناصر چٹھہ کے والد بھی اس الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے علاوہ بھی کبھی ایک ساتھ دو تین چھٹیاں آ جاتی تھیں تو میاں عبدالمجید صاحب گاؤں چلے جاتے تھے۔ پہلے ریل کے ذریعے گوجرانوالہ پہنچتے وہاں ایک تانگوں کا اڈا تھا جہاں سے گاؤں دیہات کے لیے تانگے چلتے تھے مگر یہ تانگے مغرب تک بند ہو جاتے تھے اور کلاسکے تک کا سفر دو ڈھائی گھنٹے کا ہوتا تھا اس لیے تانگے عصر کے بعد روانہ ہو جاتے تھے۔ اتفاق سے اس روز جب میاں عبدالمجید صاحب ریل اسٹیشن پر اترے تو سورج غروب ہونے کو تھا اور کلاسکے جانے والے تانگے روانہ ہو چکے تھے۔ البتہ ایک تانگا جو نزدیکی گاؤں بارے خان جا رہا تھا۔ رات اندھیری ہو رہی تھی آسمان پر تاریک بادل جمع ہو رہے تھے' رہ رہ کر بجلی کڑک رہی تھی۔

بارے خان سے کلاسکے کوئی پانچ کلومیٹر دور تھا' یہ راستہ میاں عبدالمجید صاحب نے پیدل طے کیا۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے درخت جھوم رہے تھے۔ مٹی اڑ رہی تھی۔ رات بالکل تاریک تھی۔ جب بجلی چمکتی تھی تو راستا دکھائی دیتا ورنہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ راستا اُنھوں نے بڑی مشکل سے کئی گھنٹوں میں طے کیا تھا یہ اللہ کا کرم تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئے درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے ان کو ڈر

لگ رہا تھا کہ کوئی گر ہی نہ جائے۔ کسی نہ کسی طرح وہ گاؤں پہنچے تو میاں امام الدین صاحب اور دوسرے لوگ حیران رہ گئے' میاں صاحب نے بہت ڈانٹا تھا کہ اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی۔ گوجرانوالہ میں رک جاتے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے عرض کی۔ ''بس میاں صاحب چل پڑا تھا۔''

یہ تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ بہت کچھ دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا تھا۔ جو لوگ قائداعظم، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے شدید مخالف تھے وہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ اس مفاد پرست ٹولے نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ اب قیام پاکستان مقدر ہے ان لوگوں نے جناح کیپ پہننا شروع کردی تھی۔ اس سے پہلے یونی نسٹ والے کلاہ پہنتے تھے۔ مسلمانوں کی مخصوص نشانی گول ٹوپی تھی جسے اس زمانے میں ترکی ٹوپی کہتے تھے۔ سواریوں اور دوسری سہولتوں میں جدت آ رہی تھی۔ اُنھوں نے لاہور میں آ کر پہلی بار ٹیلی فون دیکھا۔ ریل گاڑی تو بہت پرانی ہوگئی تھی اس طرح سنیما بھی ان کے بچپن میں آ گیا تھا۔

مگر سب سے اہم سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں تھیں۔ متحدہ ہندوستان تقسیم ہونے جا رہا تھا۔ اس دور میں دل گداز مناظر دیکھنے میں آئے اور خوف ناک خبریں سننے کو ملتی تھیں۔ ۳ر جون کے منصوبے کا اعلان ہوتے ہی مشرقی پنجاب میں فسادات کی منصوبہ بندی کرلی گئی تھی۔ اسلحہ بانٹا جا رہا تھا۔ دہلی اور کلکتہ میں بھی منظم فساد کی تیاری تھی اور اس کا نشانہ ظاہر ہے کہ مسلمان تھے۔ مغربی پنجاب میں چودہ اگست تک حالات معمول کے مطابق تھے سوائے لاہور کے جہاں آگ لگی تھی' سکھ اور ہندو مسلمان آبادیوں پر حملے کر رہے تھے جواب میں وہ بھی ان کے محلوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

دوسری طرف ان کے گاؤں کے ہندو سہمے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے

بھارت جانے کا نہیں سوچا تھا۔ وہ سب اپنے اثاثوں سمیت بیٹھے تھے۔ درحقیقت مسلمانوں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ ہندو سکھ یہاں سے جائیں گے مگر مشرقی پنجاب اور دہلی سے فسادات کی خبریں اور مسلمانوں کی کٹی پھٹی لاشیں آنا شروع ہوئیں تو مغربی پنجاب میں بھی اشتعال پھیل گیا۔ ردعمل میں سکھوں اور ہندوؤں پر حملے ہونے لگے تھے اور اُنھوں نے بھی یہاں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بھرے پرے گھر چھوڑ گئے تھے جیسے کہ مسلمان لٹ پٹ کر آئے تھے۔

1946ء میں گرمیوں کی چھٹیوں سے آنے کے بعد میاں عبدالمجید صاحب تحریک پاکستان کے لیے پرجوش تھے اگرچہ بھائی جان کی طرف سے منع تھا کہ اُنھوں نے جلسے جلوسوں میں نہیں جانا ہے۔ اس سے تعلیم کا حرج ہوتا۔ مگر وہ چوری چھپے چلے جاتے تھے۔ خضر حیات کے خلاف تحریک چل رہی تھی لوگ روز موچی دروازے پر جمع ہوتے اور گرفتاریاں دی جاتی تھیں۔ ان حالات میں جب کہ جیلیں لیگی کارکنوں سے بھر گئی تھیں اس لیے پولیس یہ کرتی تھی کہ گرفتار ہونے والوں کو لاہور شہر سے دور لے جا کر کسی ویرانے میں چھوڑ آتی تھی۔ ایک دن میاں عبدالمجید صاحب بھی پکڑے گئے اور اُنھیں دور ویرانے میں چھوڑ دیا۔ یہ خاصے لوگ تھے ان میں مسلم لیگ گارڈز بھی تھے اُنھوں نے سب کو فوجی انداز سے لائن میں لگوایا اور اس جنگل میں مارچ شروع کر دی۔ نہ جانے کون سی جگہ تھی۔ چل چل کر سب کا برا حال ہو گیا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے پاؤں کا ایک جوتا بھی نکل گیا۔ وہ ننگے پاؤں چلے جا رہے تھے۔

راستے میں ایک گاؤں میں مسلم لیگی رضا کار ایک گاڑی میں کسی لیڈر کو تلاش کر رہے تھے جسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب اور چند دوسرے لڑکوں نے موقع غنیمت جانا ور سب گاڑی میں گھس گئے۔ گاڑی والے سے کہا کہ

جب لیڈر ملے گا تو دیکھی جائے گی فی الحال تو ہمیں لاہور لے چلو۔ بعد میں پتا چلا کہ لیڈر کو جیل بھیج دیا گیا تھا اس گاڑی میں لاہور تک آئے۔ کیونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے لاہور پہنچنے کے باوجود ڈھولن وال جانے کے لیے کوئی تانگا دست یاب نہیں تھا بڑی مشکل سے ایک تانگا ملا جو ڈھولن وال سے ذرا دور ایک گاؤں تک جانے کے لیے تیار تھا اور وہ چھ آنے مانگ رہا تھا۔ ان سب کے پاس ملا کر چار آنے تھے اُنھوں نے یہ چار آنے تانگے والے کی خدمت میں پیش کیے اور اس کی منت سماجت کی کہ انھیں لے چلے۔ وہ لیگ کے جلسے میں شرکت کر کے آرہے ہیں' یہ سن کر تانگے والا جو چھ آنے سے ایک پیسہ کم کرنے کو تیار نہیں تھا ان کو مفت میں ڈھولن وال لے جانے کو تیار ہو گیا۔

سردی کے دن تھے گرم کپڑے نہیں تھے' سردی اور تاریکی میں ٹھٹھرتے وہ گھر پہنچے۔ اب دروازہ بجاتے تو بھائی جان کو پتا چل جاتا اس لیے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ چل چل کر تھکن اور اس سے زیادہ بھوک سے برا حال تھا۔ سیدھے کچن میں گئے' کھانا کھایا اور پھر کمرے کا دروازہ بجایا' اندر بھی جانا تھا۔ بھائی جان باہر نکلے وہ حسب توقع بے حد غصے میں تھے۔ گرج کر پوچھا کہاں گئے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو جھوٹ بولنے سے نفرت تھی اُنھوں نے گول مول الفاظ میں جواب دیا "بس جی ایسے ہی گیا تھا۔"

میاں عبدالرشید صاحب سمجھ گئے تھے "تمھیں جلسوں میں حصہ لینے کے لیے بھیجا ہے یا پڑھنے کے لیے ......" وہ خاصی دیر سخت سناتے رہے پھر اندر چلے گئے۔ میاں عبدالمجید صاحب بھی جا کر سو گئے۔ کچھ دیر بعد بھائی جان نے اٹھایا اور محبت بھرے انداز میں بولے۔ "تو نے کھانا نہیں کھایا ہے چل شاباش کھانا کھا لے۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے ان کو کس قدر شرمندگی کے ساتھ بتایا کہ وہ کھانا

کھا چکے ہیں۔ یہ بھائی جان کی شفقت کا ایک انداز تھا پہلے ان کو غصے میں ڈانٹ دیا اور پھر ان کی بھوک کا خیال آیا تو خود اٹھانے آ گئے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے کچھ نخرے کیے مگر پھر بھائی کے پیار کے آگے ہار مان لی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی اور واقعی یہ عمر کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے کے لیے بہت کم ہوتی ہے۔ مگر مسلمان قوم کے بچے تک محسوس کر رہے تھے کہ اُنھوں نے اس تحریک میں اپنا کردار ادا نہ کیا تو وہ آنے والی نسلوں کو اس کے بارے میں کیا جواب دیں گے۔ نو دس سال کے بچے گلی کوچوں میں لیگ کا نعرہ لگاتے پھرتے تھے۔ ''بٹ کے رہے گا ہندوستان...... لے کے رہیں گے پاکستان'' یہ نعرہ ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا اگر اس میں ملک وقوم کی ذرا سی بھی محبت تھی یہی وجہ تھی میاں عبدالمجید صاحب بھائی کی ناراضگی کا خطرہ مول لے کر لیگ کے جلوسوں میں جاتے رہے۔ آج وہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے بھی تحریک پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا۔ بے شک یہ چھوٹا سا سہی لیکن ایک کردار تھا۔

لاہور میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاہ عالمی مارکیٹ پر مکمل طور پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں نے ان کی دکانوں کو آگ لگانا شروع کر دی۔ اس کے شعلے بلند ہوتے تو وہ ڈھولن وال سے بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔ اگرچہ ڈھولن وال شہر سے دور ہونے کی وجہ سے پرامن رہا۔ یہاں کچھ ہندو آباد تھے ان کی جان ومال بھی محفوظ رہے۔ حالانکہ مسلمان بہت زیادہ تھے چاہتے تو آن واحد میں ہندوؤں کو ختم کر دیتے۔ اس دوران میں فسادات بہت بڑھ گئے تھے گوجرانوالہ سکھوں سے بھرا ہوا تھا شہر کے علاوہ اردگرد میں ان کے خاصے گاؤں تھے۔ سکھ مسلح اور طاقت ور تھے اس لیے ان کی طرف سے ہمہ وقت خطرہ رہتا تھا۔ کلا سکے کے مسلمان اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے' پورے گاؤں میں صرف

تین لائسنس یافتہ رائفلیں تھیں اس کے علاوہ لاٹھیاں اور خنجر تو سب کے پاس تھے۔ لوگوں نے ٹولیوں کی صورت میں دن اور رات کو پہرہ دینا شروع کر دیا۔

سکھوں نے تو حملہ نہیں کیا تھا مگر مسلمانوں نے سکھوں کے گاؤں دیہاتوں پر حملے شروع کر دیے۔ زیادہ تر فسادی طبیعت کے جرائم پیشہ لوگ تھے ان کا اصل مقصد لوٹ مار کرنا تھا۔ کیونکہ سکھ اور ہندو بہت دولت مند تھے۔ زمینوں اور کاروبار پر ان کا قبضہ تھا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ ان کو لوٹنے لگے۔ ایک قریبی گاؤں پر حملہ ہوا تو کلاسکے کے لوگ بھی اس میں شامل تھے سب نہیں ...... بس چند ایک تھے اور جب کلاسکے کی باری آئی تو یہاں کے لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے گاؤں کے ہندوؤں کو بچا لیا تھا۔ بعد میں دو ہندو مارے گئے تھے اور بقیہ دہشت زدہ ہو کر بھارت چلے گئے تھے مگر کلاسکے فساد کی آگ سے محفوظ رہا تھا۔ اس پر آشوب دور میں یہ واقعہ کلاسکے کی روایتی وضع داری اور انسانیت نوازی کا مظہر ہے۔ شاید اس وجہ سے خدا نے اس گاؤں کو عزت دی اور اس کا ایک فرد ملک کا نامور صنعت کار بنا۔

کلاسکے کا ایک نوجوان تھا اس نے خاصی لوٹ مار کی' گدھوں پر سکھوں اور ہندوؤں کے گھر سے قیمتی سامان لا کر اپنے گھر میں بھر لیا تھا۔ میاں امام الدین صاحب اور ماں جی نے اسے سمجھایا کہ یہ غلط ہے۔ ظلم ہے، ایسا کرنے والا کبھی نہیں پھلتا پھولتا ہے۔ پر وہ نہ مانا...... لوٹ مار کا سامان لاتا رہا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک سال بعد وہ بیمار پڑا اور فوت ہو گیا۔ اس نے جو سامان لوٹا تھا وہ وہیں پڑا رہ گیا۔ کلاسکے کے کچھ اور لوگ بھی اس لوٹ مار میں شریک تھے مگر سب سے آگے وہی نوجوان تھا۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں احساس پیدا ہوا کہ غلط کام کا انجام غلط ہی ہوتا ہے۔

قتل جو اس وقت ہوئے اصل میں زیادہ تر دشمنیاں تھیں یا سکھوں اور ہندوؤں

کے ہاتھوں کوئی مظلوم تھا تو اب اسے موقع ملا اور اس نے اپنا بدلہ نکال لیا تھا۔ کوئی کسی ہندو کا قرض دار تھا' کسی کی زمین گروی رکھی تھی کسی کی زمین سرے سے ہتھیالی گئی تھی۔ ان حالات میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں خاص طور سے جب لوگوں کو خوف نہ ہو کہ ان پر قتل کا مقدمہ بنے گا۔ اس وجہ سے لوگوں نے دل کھول کر اپنی دشمنیاں نکالیں۔ مارے جانے والوں میں میاں امام الدین صاحب کے ایک قریبی دوست پنڈت مالک رام بھی تھے۔ ان کو ایک مسلمان نے ذاتی دشمنی کی بنیاد پر قتل کردیا۔ اس واقعے نے گاؤں کے ہندوؤں کو اتنا خوف زدہ کردیا کہ اُنھوں نے میاں امام الدین صاحب اور دوسرے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہیں مگر ساتھ ہی اُنھوں نے یہاں سے جانے کی تیاری بھی کرلی تھی۔ اُنھوں نے سامان باندھا اور آرمی سے رابطہ کیا کہ ان کو سرحد پار پہنچا دیا جائے' وہ ایک ایک دو دو کر کے کلاسکے سے چلے گئے۔

میاں امام الدین صاحب اور دوسرے لوگوں کو ہندوؤں کے جانے کا افسوس تھا ان سے برسوں کی ہمسائیگی اور دوستی تھی۔ کلاسکے کی حد تک یہ دونوں قومیں پرامن رہتی تھیں اور سینتالیس سے پہلے کسی فساد کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس پورے علاقے میں کوئی ہندو یا سکھ نہیں رہا تھا کچھ مارے گئے تھے مگر زیادہ تر آرمی کی حفاظت میں سکون سے سرحد عبور کر کے بھارت چلے گئے تھے۔ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ ہندو عورتوں نے اپنا زیور ماں جی کے پاس امانت رکھوایا تھا ایک رات جب آرمی کا ٹرک ان کو لینے آیا تو وہ آ کر ماں جی سے زیور لے گئی تھیں۔ اس دوران میں سرحد پار سے لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ حکومت نے مہاجرین کو ان جگھوں پر بھیجنا شروع کردیا جہاں ہندو سکھوں کے چھوڑے مکانات اور زمینیں تھیں بے شمار افراد کلاسکے اور آس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں آئے۔

میاں امام الدین صاحب پرائمری لیگ کے صدر تھے۔ ان کے ذمے مہاجرین کی ابتدائی آبادکاری کا فرض لگایا گیا تو میاں صاحب نے دوسروں کے ساتھ مل کر آنے والے مہاجرین کو ہندوؤں اور سکھوں کے خالی گھروں میں آباد کیا۔ اکثر سامان تو لوٹ لیا گیا تھا کچھ باقی تھا جو اُن کے کام آیا مگر آنے والے مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے کھانے پینے اور رہنے بسنے کا بندوبست آسان نہیں تھا۔ کلاسکے کے لوگوں نے اناج اور دوسری چیزیں جمع کر کے ان کے کھانے کا بندوبست کیا۔ شہروں سے لیگ کے رضا کار آتے تھے کہ شہروں میں مقیم مہاجرین کی مدد کے لیے آپ جو دے سکتے ہیں ضرور دیں۔ حالانکہ بیشتر لوگ غریب تھے مگر رضا کاروں کو ہر گھر سے کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا اور کچھ نہیں تو لوگ ایک مٹھی آٹا یا گندم ہی دے دیا کرتے تھے۔ دوسرے گاؤں میں بھی مہاجرین کی آمد جاری تھی۔ وہ اپنے ساتھ دل خراش واقعات لا رہے تھے۔

گوجرانوالہ سے کلاسکے اور دوسرے دیہات تک آنے والے راستے پر بے شمار اونچے اور گھنے درخت تھے ان کی چھاؤں میں راستہ آسانی سے طے ہو جاتا تھا جب مہاجرین آئے اور بیشتر کھلے میں رہتے تھے ان کو چولہے جلانے اور راتوں کو سردی سے محفوظ رہنے کے لیے لکڑی کی ضرورت تھی تو اُنھوں نے یہ درخت کاٹ ڈالے۔ صدیوں پرانے درخت تھے، بعد میں نئے درخت لگے مگر پرانے درخت باقی نہیں رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو اس کا دکھ تھا۔ اُنھوں نے بے شمار بار تپتی دھوپ میں ان درختوں کی خنک چھاؤں میں سفر کیا تھا۔

اس وقت مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ اپنا ملک ہے۔ اسلام کا نظام عدل ہوگا اور سب کو برابر کے مواقع ملیں گے۔ ہندو ہر چیز پر قابض تھا اگرچہ اسلامی نظام عدل تو نہیں آیا مگر حالات مسلمانوں کے لیے بہتر ہوئے تھے سب نے اپنے

چھوٹے موٹے کام شروع کردیے۔ نئے ملک میں اس کی ضرورت بھی تھی خود میاں امام الدین صاحب نے مطب کے ساتھ کریانے کی دکان کھول لی تھی کیونکہ ہندو دکانیں بند کر کے جا چکے تھے۔ اس وقت ہر چیز کی کمی تھی اور سب کچھ راشن پر ملتا تھا۔ آج لوگ اس دور کا سوچ نہیں سکتے جب کفن کا کپڑا تک راشن کے تحت ملتا تھا۔ میاں صاحب کیوں کہ مسلم لیگ میں تھے اس لیے ان کو راشن ڈپو الاٹ ہوگیا۔ مگر چیزوں کی اتنی کمی تھی کہ ڈپو پر بھی نہیں ملتی تھیں۔ ایک بار گوجرانوالہ سے لانے کے دوران میں چینی کسی وجہ سے گیلی ہوگئی۔ اب اس کی طلب اتنی زیادہ تھی کہ لوگ یہ گیلی چینی بھی لے گئے۔ میاں عبدالمجید صاحب اس وقت میاں صاحب کے پاس کام کر رہے تھے اور وہ دیکھتے تھے کہ ملک کے ابتدائی حالات کس قدر خراب تھے۔ معمولی سی چیز بھی دستیاب نہیں تھی۔ مٹی کا تیل نایاب تھا حد یہ کہ ماچس تک نہیں مل رہی تھی۔ شہروں میں صورت حال اتنی بری نہیں تھی مگر گاؤں' دیہات میں خاصی بری صورت حال تھی۔

مہاجرین کو گاؤں دیہات میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کلاسکے میں بھی خاصے آئے تھے۔ یہ سب بالکل خالی ہاتھ تھے اور گاؤں کے لوگ بھی زیادہ امیر نہیں تھے اس لیے سب نے حسب مقدور دیا اور ان کے کھانے پینے کا اہتمام کیا گیا۔ بعد میں خاصے مہاجرین شہروں میں واپس چلے گئے تھے کیونکہ گاؤں دیہاتوں میں کام اور نوکری کے مواقع نہیں تھے۔ ایک سال میں معاملات کسی حد تک بہتر ہوئے تھے سب کو کوئی نہ کوئی جگہ مل گئی تھی جن کو نہیں ملی تھی اُنھوں نے سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے کنارے سرکاری اراضی پر جھونپڑیاں ڈال لیں۔ اقتصادی حالات بہتر نہیں تھے مگر گزارہ چل رہا تھا۔ حکومت لوگوں کی ہر ممکن مدد کر رہی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزریں تو میاں عبدالرشید صاحب گاؤں آئے' واپسی میں

میاں عبدالمجید صاحب کو ان کے ساتھ جانا تھا۔ ان دنوں طوفانی بارشوں کی وجہ سے تمام ندی' نالے اور دریا پوری طرح چڑھے ہوئے تھے۔ اور راستے بند تھے۔ وہ گاؤں سے اس طرح روانہ ہوئے کہ ایک بس کے اوپر سامان سمیت بیٹھے تھے اس وقت سفر کے لیے گاڑیاں بہت کم تھیں اور جو تھیں ان میں بہ مشکل جگہ ملتی تھی لوگ اس طرح سے چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرنے کے عادی تھے۔ گوجرانوالہ سے لاہور تک کا سفر اسی طرح طے ہوا تھا مگر راوی کے پل سے دوسری طرف جانے کے لیے بس والے نے انکار کر دیا۔ پل کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس پر سے بس گزاری جا سکتی۔ راوی کا پانی پل کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ بس والے نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ ریل پل کے اوپر سے گزر جائیں۔

راوی میں اتنا زیادہ پانی کبھی نہیں آیا تھا۔ جب میاں عبدالرشید صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب پل تک پہنچے تو اُنھوں نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا۔ راوی کسی بپھرے سمندر کی طرح بہہ رہا تھا اور پانی پل سے ذرا ہی نیچے تھا۔ سیلاب کی زد میں آ کر گاؤں کے گاؤں راوی کے دھارے میں شامل ہو گئے تھے۔ سامان' جانوروں اور انسانوں کی لاشیں مطلع آب پر بہتی جا رہی تھیں ان حالات میں پل عبور کرنا بھی جان جوکھم کا کام تھا۔ بھائی جان نے انھیں روک دیا۔ ”پہلے میں سائیکل دوسری طرف لے جاتا ہوں' پل بھی دیکھ لوں گا۔“

میاں عبدالمجید صاحب بھائی کو منع کرنا چاہتے تھے مگر ان کے رعب کی وجہ سے خاموش رہے۔ میاں عبدالرشید صاحب پہلے سائیکل سمیت دوسری طرف گئے اور پھر واپس آ کر میاں عبدالمجید صاحب کو ساتھ لے کر پل عبور کیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ پل کے پھٹوں کے نیچے پانی کا دھارا جیسے ان کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ آج بھی سوچتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اُنھوں نے نہ جانے کیسے پل

عبور کیا۔ بڑا ہی خوف ناک وقت تھا۔ پُل عبور کر کے وہ ریل لائن پر ہی چلتے ہوئے لاہور تک آئے۔ ان کو پتا چلا کہ ریلوے اسٹیشن سے باہر نہیں جاسکتے کیونکہ شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ اتفاق سے میاں عبدالرشید صاحب کے ایک دوست عبدالرحیم صاحب پاس ہی رہتے تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ وہ ان کے گھر چلے گئے اور جب تک کرفیو لگا رہا وہ ان کے گھر میں رہے تھے۔

اگلے روز کرفیو اٹھا تو میاں عبدالرشید صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب سائیکل پر ڈھولن وال پہنچے۔ راستے میں بالکل سناٹا تھا کوئی آدمی یا گاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی صرف ایک جگہ ایک تانگا دکھائی دیا۔ اس پر خون بکھرا ہوا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے زندگی میں پہلی بار اس طرح خون دیکھا تھا۔ ممکن ہے تانگے پر حملہ ہوا ہو۔اندرون لاہور تو حالت اور بری تھی۔ مال روڈ اور شاہ عالمی کے علاقے جل رہے تھے۔ وہاں پر تجارتی علاقہ تھا۔ دکانیں تھیں اور سب ہی ہندوؤں اور سکھوں کی تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پورے مال روڈ پر مسلمانوں کی صرف ایک دکان تھی اور یہ بھی شاید جوتے کی دکان تھی چمڑے کا سامان بکتا تھا۔ اس وجہ سے یہ دکان مسلمانوں کی تھی۔ ہندو چمڑے کا کاروبار نہیں کرتے تھے۔ فسادات اور لوٹ مار کا سارا زور اس طرف تھا۔ جب تک پاکستان کی حکومت وجود میں نہیں آئی' فسادات اسی طرح جاری رہے۔ پھر مسلم لیگ کی حکومت نے ان پر قابو پالیا۔ مگر اس وقت تک بہت کچھ برباد ہوگیا تھا۔ دکانیں اور سامان سے بھرے گودام نذرآتش کردیے گئے تھے۔ لوٹ مار میں صرف جرائم پیشہ لوگوں کی چاندی ہوئی تھی۔ عام افراد کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا بلکہ وہ نقصان میں رہے تھے۔

آزادی

حالات معمول پر آنے کے بعد 1948ء میں میاں عبدالمجید صاحب نے میٹرک کاامتحان دیا ان کا امتحانی مرکز مسلم ہائی اسکول (شیرانوالہ) میں پڑا۔ اس وقت تک مسلم ماڈل ہائی اسکول ڈی اے وی اسکول کی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ماہر معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق کے والد اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے تھے۔ فسادات کے بعد لاہور کی رونق اور سرگرمیاں آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی تھیں۔ جب اسکول کے امتحانات ہوگئے اور کالج میں داخلے کے وقت تک میاں عبدالمجید صاحب کومہلت ملی کہ وہ سوشل سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ امتحان سے ذرا پہلے اسکول بند ہوگئے تھے تاکہ طلبہ دل جمعی سے تیاری کرسکیں تو میاں عبدالمجید صاحب چند دوستوں کے ساتھ ایک خوب صورت جگہ چلے جاتے تھے بعدازاں اس جگہ شاہ نور فلم اسٹوڈیو بنا۔ یہ نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کی ملکیت تھا۔ وہاں کھیل کا میدان بھی تھا جب پڑھتے ہوئے تھک جاتے تو اس میدان میں فٹ بال کھیل لیا کرتے تھے۔

امتحان کے بعد ذرا لاہور گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ ابھی کالج کھلنے میں کئی مہینے تھے تو میاں امام الدین صاحب نے ان کو گاؤں بلوا لیا تاکہ وہ کریانے کی دکان چلانے میں مدد کریں۔ میاں عبدالمجید صاحب گاؤں چلے گئے۔ اس وقت ان کو

کاروبار کا پتا نہیں تھا مگر اس کا شوق تھا۔ ان کا خاندانی پس منظر بھی علمی تھا اور ان کی پشتوں میں کسی نے کاروبار نہیں کیا تھا مگر کریانے کی اس چھوٹی سی دکان سے ان میں کاروبار کی کافی سمجھ بوجھ آئی تھی۔ تعلیم میں ان کا رجحان زیادہ تر سائنس کے مضامین کی طرف تھا۔ ان کی ریاضی کافی اچھی تھی۔ اس وجہ سے بھی ان کو کاروبار سمجھنے میں آسانی رہی۔ ان میں کاروبار اور ذاتی کام کرنے کا شوق یہیں سے پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ اُنھوں نے زیادہ عرصے یہ کام نہیں کیا تھا' مگر اس سے سیکھا بہت کچھ۔

اس دور میں جب میاں عبدالمجید صاحب اسکول سے کالج میں گئے تو حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوئے تھے۔ ملک آزاد ہوا تھا مگر آزادی کی یہ فضا ابھی سہمی ہوئی تھی۔ نہ جانے کب کیا ہوجائے' فضا سے خون کی بو گئی نہیں تھی۔ والٹن کیمپ جہاں ہجرت کرکے آنے والے مسلمان مقیم تھے ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے اگرچہ کسی قدر بہتری آئی تھی۔ قائداعظم کی قیادت میں حکومت نے انتھک کام کیا تھا اس سے بھی بہتری آئی تھی لوگوں کو احساس تھا کہ چیلنجز بہت بڑے ہیں اور ان سے نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔ مگر اس وقت عوام اور حکومت ایک تھے اس لیے یہ بہت بڑا امتحان بھی ملک نے پاس کرلیا۔ اور دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا جو پاکستان کے ختم ہونے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

اسکول سے کالج میں آنا بھی ایک طرح سے آزادی ہی ہوتی ہے۔ اسکول میں ایک محدود دائرہ ہوتا ہے' تعلیم کا ایک نصاب ہوتا ہے اس سے باہر نہیں جایا جاسکتا تھا۔ ماں باپ' رشتے داروں اور معاشرے کی طرف سے بڑی نگرانی اور پابندیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ کالج میں آنے کے بعد پہلی آزادی تو تعلیم کے شعبے کا چناؤ ہوتا ہے۔ طالب علم طے کرتا ہے کہ اسے مستقبل میں کون سا شعبہ لینا ہے۔ اپنا کیریئر چنتا ہے' اس کے بعد معاشرے اور گھر والوں کی طرف سے بھی پابندیاں نرم پڑجاتی

ہیں۔ لڑکا نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے اس وجہ سے بھی اسے کچھ آزادی ملتی ہے، مجموعی طور پر کالج میں آنے کے بعد انسان خود کو مختلف محسوس کرتا ہے۔

اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور سب سے مشہور تھا اور اسکول سے فرسٹ کلاس میں میٹرک پاس کرنے والے ہر طالب علم کی اولین خواہش وہاں داخلہ لینا ہوتی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے بھی داخلے کے لیے درخواست دی۔ وہاں ان کا ٹیسٹ اور انٹرویو ہوا مگر داخلہ نہیں ملا۔ اس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا۔ اس وقت پطرس بخاری اس کالج کے پرنسپل تھے۔ موجودہ گورنر سلمان تاثیر کے والد ایم ڈی تاثیر اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم جیسے لوگ اساتذہ میں شامل تھے۔ دوسرے نمبر پر ایف سی کالج آتا تھا مگر یہ شہر سے بہت دور تھا اسلامیہ کالج ریلوے روڈ پر تھا اور وہ بھی خاصے فاصلے پر۔ ایم اے او کالج ان دنوں نیا نیا بنا تھا پھر کسی نے میاں عبدالمجید صاحب کو تعلیم الاسلام کالج کے بارے میں بتایا اسے ٹی آئی کالج بھی کہا جاتا تھا۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب کو نہیں معلوم تھا کہ یہ دراصل قادیانیوں کا قائم کردہ کالج ہے اور اس میں زیادہ تر قادیانی طلبہ پڑھتے تھے۔ یہ کالج نزدیک بھی تھا۔ اُنھوں نے میاں عبدالرشید صاحب سے اس کے بارے میں پوچھا کیونکہ کالج نیا نیا بنا تھا اس لیے وہ اس کے معیار کے بارے میں فکر مند تھے۔ اُنھوں نے مشورہ دیا ''ابھی تو جہاں بھی داخلہ مل رہا ہے لے لو...... بعد میں دیکھیں گے۔''

میاں عبدالمجید صاحب نے ٹی آئی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھی کسی رفاہی اسلامی ادارے کا کالج ہوگا مگر جب داخلہ لیا تو پتا چلا یہاں قادیانی ہیں۔ کالج کی انتظامیہ اور اساتذہ تو سو فی صد قادیانی تھے طلبہ میں بھی نوے فی صد قادیانی تھے۔ دس فیصد میں مسلمان اور عیسائی طلبہ تھے۔ مرزا ناصر جو بعد میں قادیانیوں کے خلیفہ بنے اور وہ لندن چلے گئے تھے اس وقت کالج کے پرنسپل تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے یہ بات میاں عبدالرشید صاحب کو بتائی تو وہ بھی فکرمند ہوئے تھے مگر اُنھوں نے تسلی دی۔ ''تم پڑھتے رہو۔''

میاں عبدالرشید صاحب جانتے تھے ان کی بنیاد مضبوط ہے۔ اس لیے کوئی ان بھائیوں کے ایمان اور عقیدے پر حاوی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کو تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اگر وہ اس مرحلے پر کالج چھوڑ دیتے تو ان کا پورا ایک سال ضائع ہوجاتا۔ لہٰذا وہ پڑھتے رہے کچھ عرصے بعد اُنھوں نے محسوس کیا کہ کالج کا معیار بہت اچھا ہے۔ مرزا ناصر جو مرزا غلام احمد اور مرزا شبیر الدین کے بھائی تھے' اُنھوں نے آکسفورڈ سے پڑھا ہوا تھا اس طرح کالج کے دوسرے اساتذہ بھی بہت قابل تھے۔ اس کی عمارت گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل کے ساتھ تھی۔ اس لیے گورنمنٹ کالج کے لڑکوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ اس وقت فضا قادیانیوں کے خلاف نہیں تھی کم سے کم اتنی نہیں تھی۔ تحریک پاکستان اور خاص طور سے کشمیر کے معاملے میں ان کا کردار عام مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس کے باوجود فضا ان کے لیے اتنی خراب نہیں تھی۔

میاں عبدالمجید صاحب نے سائنس لی تھی اور کالج کی تجربہ گاہ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس لیے کالج انتظامیہ نے طلبہ کے پریکٹیکلز کے لیے ایم اے او کالج میں بندوبست کردیا تھا۔ طلبہ پریکٹیکلز کے لیے وہاں جاتے تھے۔ مرزا ناصر نے کالج کا ماحول دوستانہ رکھا تھا۔ باوجود اس کے کہ طلبہ اس سے مرعوب رہتے تھے۔ وہ ان سے بے تکلفانہ پیش آتے تھے اُنھوں نے کہہ رکھا تھا کہ طلبہ کو کوئی بھی مسئلہ ہو تو وہ میرے گھر بھی آسکتے ہیں۔ ان کا گھر کالج کے قریب تھا' کبھی کبھی طلبہ ان کے گھر چلے جاتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو ان کے گھر کے حوالے سے ایک عجیب سی بات آج تک یاد ہے جب وہ جاکر ان کے گھر کی بیل بجاتے تھے تو ان کا

بوڑھا ملازم دور سے اللہ اکبر کہتا تھا۔

قادیانی طلبہ مذہب کے بارے میں بحث کرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھی پھر ان کا مذاق اڑاتے تھے ان کو بھی پتا تھا کہ ان کے عقائد عقل سے بالاتر ہیں۔ البتہ یہ بات تھی کہ وہ سب قادیانیت پر ثابت قدم تھے اور چھٹی کے دن طلبہ اور اساتذہ قریبی گاؤں دیہات میں تبلیغ کے لیے جاتے تھے۔ اساتذہ اپنی نصف تنخواہ ایک فنڈ میں دیتے تھے جو قادیانی مذہب کی تبلیغ کے لیے بنایا گیا تھا۔ ان لوگوں کا رہن سہن اور لباس سادہ تھا۔ اس وقت ربوہ میں ان کا ہیڈکوارٹر بن رہا تھا...... جب اس کا پہلا اجتماع ہوا تو کالج انتظامیہ کی طرف سے حکم آیا کہ سب طلبہ اس میں شریک ہوں گے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے جانے سے انکار کیا۔ اُنھوں نے مرزا ناصر سے کہا۔

''میں مسلمان ہوں' میں نہیں جاؤں گا۔''

''یہ کالج کے پرنسپل کا حکم ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''جو اسٹوڈنٹ نہیں جائے گا اسے ہم فارغ کر دیں گے۔''

اس دھمکی نے ان کو مجبور کر دیا۔ وہ بھی دوسرے طلبہ کے ساتھ ربوہ چلے گئے۔ وہاں سیکڑوں افراد کا اجتماع تھا پورے ملک سے...... بلکہ ساری دنیا سے قادیانی وہاں آئے تھے صرف ٹی آئی کالج سے نہیں بلکہ اور قادیانی تعلیمی اداروں سے بھی لڑکے آئے تھے۔ ہزاروں افراد کے کھانے پینے اور رہنے کا مناسب انتظام تھا۔ سارا کام رضا کارانہ طور پر ہوتا تھا اور ہر شخص کام کرتا تھا۔ کھانا بڑی بڑی بالٹیوں میں آتا تھا اور سب مل کر کھاتے تھے اس کے بعد برتن دھوئے جاتے تھے۔

اس وقت عام مسلمانوں کو اس بارے میں زیادہ علم نہیں تھا اور بیشتر اَن پڑھ لوگ ان کو بھی مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ اس لیے عوام میں زیادہ جذبات نہیں تھے۔ اس

وقت ربوہ میں ریل اسٹیشن نہیں تھا اس لیے بسوں کے ذریعے فیصل آباد لے گئے اسے اس وقت لائل پور کہا جاتا تھا۔ وہاں پر میاں عبدالمجید صاحب نے ان کے قائدین کی تقریریں نہیں سنی تھیں کیونکہ وہ کام کرنے والوں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کو نہیں معلوم تھا کہ وہاں مسلمانوں کے خلاف کچھ کہا گیا تھا یا نہیں۔ کالج میں صرف نصاب کی تعلیم ہوتی تھی۔ وہاں کبھی قادیانیت یا مذہب کے مسئلے پر بات نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی لٹریچر دیا جاتا تھا۔ ہاں قادیانیوں کا ایک اخبار ''الفضل'' کالج میں آتا تھا لیکن مسلمان طلبہ اسے نہیں پڑھتے تھے' بلکہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اسے ''الفضل'' کے بجائے ''الفضول'' کہا کرتے تھے۔

اس وقت جو سب سے مشہور قادیانی تھے وہ پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان تھے۔ بعد میں وہ اقوام متحدہ میں چلے گئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد لندن میں مقیم ہوگئے تھے' جو اس وقت قادیانیوں کا گڑھ تھا۔ جب وہ لاہور آیا تو سارے طلبہ اس سے ملنے اسٹیشن پر گئے تھے انھوں نے تمام طلبہ سے ہاتھ ملایا اور سب کا حال احوال بھی پوچھا۔ ان کے انداز میں وزیر کا طنطنہ نہیں تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے قادیانیوں میں یہ بات نوٹ کی تھی کہ وہ منکسر المزاج تھے۔ دوسرے وہ اپنے کاز سے مخلص تھے۔ وہ جتنا بھی کماتے تھے' بے شک دو روپے کماتے تھے تو اس میں سے اپنے کاز کے لیے چندہ ضرور دیا کرتے تھے۔ کالج میں ایک اور مشہور شخصیت حمیدی صاحب تھے یہ بعد میں پاکستانی ہاکی ٹیم کے کپتان بنے مگر اس وقت ان کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

ٹی آئی کالج میں اچھا وقت گزرا تھا مگر وہاں پر سائنس کے پریکٹیکلز کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایف ایس سی کے امتحان میں ان کا کمیسٹری کا پرچہ رہ گیا۔ اس میں پریکٹیکلز میاں عبدالمجید صاحب

سے ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ اس وجہ سے اُنھوں نے 1950ء میں یہ امتحان پاس کیا تھا۔ میاں امام الدین صاحب لاہور 1949ء کے آخر میں آئے تھے۔ اُنھوں نے گاؤں میں کریانے کی دکان اور مطب دونوں بند کردیے تھے۔ وہ لاہور منتقل ہوگئے تھے۔ جب ان کو پتا چلا کہ میاں عبدالمجید صاحب کی کمیسٹری میں کمپارٹ آئی ہے تو وہ بہت ناراض ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بیٹے کو ڈانٹا تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب بھی ناراض رہے تھے۔

دراصل جن دنوں یہ سارا چکر چل رہا تھا تو میاں عبدالمجید صاحب ذرا دوسری سرگرمیوں میں زیادہ تھے۔ ایک امتحان ہوتا تھا فوجی تربیت کا اسے یوٹی سی کہتے تھے تو اس میں بہت شرکت کی تھی۔ شہنشاہ ایران آرہا تھا اسے یوٹی سی کے دستے نے سلامی دینی تھی اس میں بھی میاں عبدالمجید صاحب شامل تھے اس کے بعد عراق کے شاہ آئے، پھر اردن کے شاہ حسین آئے، ان سب کو آرمی کے ساتھ کالج کے لڑکے بھی سلامی دیا کرتے تھے۔ ان سرگرمیوں میں ان کا خاصا وقت لگا تھا اس وجہ سے کیمسٹری کے تجربات پر پوری توجہ نہیں دے سکے تھے۔ تحریری امتحان اُنھوں نے بہت اچھا دیا تھا۔ بس پریکٹیکل اچھا نہیں ہوا۔ اس زمانے میں بہت سختی تھی اور رزلٹ عام طور سے تینتیس فی صد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جس سال اُنھوں نے دیا تھا اس سال نتیجہ صرف ستائیس فی صد رہا تھا۔ اگلے سال اُنھوں نے کیمسٹری کا پرچہ بھی بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا۔ فرسٹ ڈویژن تو نہیں آئی تھی لیکن اچھی سیکنڈ ڈویژن بن گئی تھی۔ کمپارٹ کا امتحان اُنھوں نے دیال سنگھ کالج لاہور سے دیا تھا۔ سید عابد علی عابد اس کے پرنسپل تھے۔ یہ وہی کالج تھا جہاں میاں عبدالرشید صاحب نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنی اس درس گاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور اسی درس گاہ نے تحریکِ پاکستان میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب

سے پوچھا۔

''آپ ٹی آئی کالج سے ہیں تو وہاں سے کیوں نہیں امتحان دیتے؟''

میاں عبدالمجید صاحب نے جواب دیا کہ وہاں ان کو امتحان دیتے ہوئی شرم آتی ہے کیونکہ سب جان گئے تھے ان کی کمپارٹ آئی ہے۔ عابد علی عابد نے ان کو اپنے کالج سے امتحان دینے کی اجازت دے دی۔ ایف ایس سی میں اتنے اچھے نمبر تھے کہ ان کو آسانی سے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ اس دوران میں میاں عبدالرشید صاحب دوسری شادی کر چکے تھے اور ان کا ایک بیٹا تو اس زمانے میں ہوگیا تھا جب میاں عبدالمجید صاحب نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ بچہ بڑا ہو رہا تھا اور میاں عبدالرشید صاحب کو اس کی تعلیم کی فکر تھی۔ لہذا ڈھولن وال چھوڑنے کا فیصلہ کیا' اور وہ سب ملتان روڈ پر نواں کوٹ (رستم پارک) منتقل ہوگئے۔ نئ آبادی تھی۔ گاؤں جیسا ماحول تو نہیں تھا مگر شہر جیسی رونق بھی نہیں تھی البتہ آس پاس ساری پڑھی لکھی فیملیز تھیں۔ چند افراد ڈان اخبار میں کام کرتے تھے۔ بعض گورنمنٹ ملازم تھے۔ ایک ملک غلام حسین صاحب تھے جو اس وقت پنجاب کے اکاؤنٹنٹ جنزل تھے ان لوگوں کی وجہ سے علاقے کا پڑھا لکھا ماحول بن گیا تھا خاص طور سے ملک غلام حسین صاحب سے اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ میاں عبدالرشید صاحب کے ساتھ ان کی اچھی دوستی تھی۔ اُنھوں نے ملازمت کے معاملے میں میاں عبدالمجید صاحب کی بہت مدد کی۔

جس زمانے میں میاں عبدالمجید صاحب نے ایف ایس سی کرلیا تھا۔ غلام حسین صاحب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوگئے تھے اور اُنھوں نے فیروز سنز پبلی شر میں ملازمت کرلی تھی اس کے سارے حسابات وہی دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں فیروز سنز پنجاب بلکہ پاکستان کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ تھا۔ اُنھوں نے پورے

پاکستان میں ریلوے اسٹیشنوں پر بک اسٹال حاصل کرر کھے تھے۔ ان بک اسٹالوں پر کتابیں رسالے اور اخبار فروخت ہوتے تھے۔ صرف لاہور اسٹیشن پر ان کے پانچ اسٹال تھے جو اُنھوں نے ایک شخص کو ٹھیکے پر دے دیے تھے۔ سارا کام غلام حسین صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اُنھوں نے ایک دن میاں عبدالمجید صاحب سے کہا۔

"بیٹے آپ کام کریں گے؟"

"ضرور کروں گا۔" اُنھوں نے جواب دیا۔

اس وقت اقتصادی حالات بہتر ہونے شروع ہوئے تھے مگر اتنے بھی نہیں تھے کہ کسی کو آسانی سے نوکری یا کام مل جاتا۔ اس لیے جب میاں عبدالمجید صاحب کو خود پیش کش ہوئی تو ان کو بے حد خوشی ہوئی تھی اب کام یہ تھا کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے جو پانچ اسٹال تھے ان کو سپر وائز کرنا تھا۔ ٹھیکے دار نے ان کو پچیس یا تیس روپے ماہانہ دینے کی حامی بھری۔ کام مشکل نہیں تھا' جب کوئی گاڑی آتی تو کتابیں' رسالے اور اخبار بکتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کا کام یہ دیکھنا تھا کہ کتنے رسالے اور کتابیں بکی ہیں۔ فہرست کے مطابق کون سی کم پڑ رہی ہیں اور ان کو اور منگوانا ہیں۔ اخبارات کا حساب شام کو اخبار کے ایجنٹ خود کرلیا کرتے تھے۔ جتنے اخبار بچتے تھے وہ ساتھ لے جاتے تھے۔

فراغت زیادہ تھی۔ وہاں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں جاننے والے تھے ان کے لیے کمرے کھول دیا کرتے تھے۔ وہاں کرسیاں تھیں اور پنکھے بھی لگے ہوئے تھے تو میاں عبدالمجید صاحب کو جب فرصت ملتی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر مطالعہ ان ہی دنوں کیا تھا۔ ان کے پاس فرصت ہوتی تھی تو اسٹال پر جتنی کتب اور رسالے تھے سب پڑھ ڈالتے۔ خبارات وہ ویسے ہی باقاعدگی سے پڑھتے تھے مگر مطالعے کے لیے اتنا وقت نہ ان کو پہلے ملا تھا اور نہ

بعد میں ۔نسیم حجازی کو اُنھوں نے بہت پڑھا۔ ان دنوں نسیم حجازی کی کتابیں سب سے زیادہ بکتی تھیں۔ ان کے علاوہ شوکت تھانوی بھی زیادہ پڑھے جانے والوں میں سے تھے۔ اس کے بعد عورتوں کے لکھے ناول اور افسانے زیادہ بکتے تھے۔ منٹو اور دوسرے ادیبوں کی کتابیں بھی بکتی تھیں مگر ان کے خریدار کم تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب کے لیے یہ پہلی نوکری تھی۔ اس سے پہلے گاؤں میں کریانے کی دکان پر کام کیا تھا مگر ان کا پہلا کاروبار جو اُنھوں نے کیا وہ برف کی فروخت تھی۔ ان دنوں گاؤں میں شدید گرمی پڑ رہی تھی اور وہاں برف نہیں ہوتی تھی ان کو خیال آیا اگر وہ گوجرانوالہ سے برف کا بلاک لے آئیں اور اسے گاؤں میں بیچیں تو اچھا نفع مل جائے گا۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ گوجرانوالہ سے برف کا بلاک سائیکل پر رکھ کر گاؤں تک لائے اور اسے فروخت کر دیا۔ بلاک بہت وزنی تھا اور اسے گاؤں تک لاتے لاتے ان کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ اس جان توڑ محنت کا صلہ نفع کے دو روپے تھے۔ اس زمانے میں دو روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی جب ساٹھ ستر روپے ماہانہ میں پورے گھر کا خرچ آسانی سے پورا ہو جاتا تھا دو روپے سے زیادہ میاں عبدالمجید صاحب کو اس بات کی خوشی تھی کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے کمائی کی ہے۔

بی ایس سی میں داخلے کے وقت ان کے ذہن میں کوئی واضح کیریئر نہیں تھا کہ مستقبل میں اُنھیں کیا کرنا ہے۔ چھوٹے موٹے تجربات جاری تھے۔ میاں امام الدین صاحب کا خیال تھا کہ میاں عبدالمجید صاحب کو استاد بننا چاہیے اور کیونکہ وہ بی ایس سی کر رہے تھے تو ان کو ماسٹرز کر کے کالج میں لیکچرار بننا چاہئے۔ میاں عبدالرشید صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ مگر میاں عبدالمجید صاحب نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بی ایس سی کے بعد سوچیں گے۔ حالانکہ ان دنوں میٹرک کرنا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی جو لڑکا میٹرک کر لیتا تھا وہ فوراً گورنمنٹ نوکری کی فکر میں لگ

جاتا تھا۔ اس وقت میٹرک پاس کر کے بھرتی ہونے والے افسر کے درجے تک پہنچ جاتے تھے مگر میاں امام الدین صاحب نے تعلیم کے معاملے میں یہ بات اپنی اولاد کے ذہن میں بٹھادی تھی کہ تعلیم کا کوئی حرف آخر نہیں ہے۔

ایف ایس سی کے دوران میاں عبدالمجید صاحب نے کئی دوست بنا لیے تھے مگر جب وہ ایف سی کالج میں آئے اور نواں کوٹ منتقل ہوئے تو ان کے حلقۂ احباب میں تیزی سے وسعت آئی تھی۔ اچھے گھرانوں سے 'پڑھے لکھے خاندانوں سے ان کا تعلق بنا اس وقت ان کے بیشتر دوست ماڈل ٹاؤن سے تھے۔نواں کوٹ میں بھی تعلیم یافتہ لوگ آباد تھے۔ ان میں ایک ایف سی کالج کے پروفیسر بھٹی صاحب تھے ان کی کوٹھی یتیم خانے کے بالکل سامنے تھی۔ ان کا سارا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا ایک بیٹا ڈان میں بھٹی کے نام سے کالم لکھتا، جو پہلے سفیر رہ چکا تھا۔ ایک فیصل آباد ٹیکسٹائل کالج میں پرنسپل بنا' خود پروفیسر صاحب کی علمی شخصیت متاثر کن تھی۔ اور ان کو دیکھ کر میاں عبدالمجید صاحب کو ایف سی کالج میں جانے کا شوق ہوا تھا۔ اُنھوں نے ایک غریب گھرانے کے بچے گل زار قریشی کو لے کر پالا تھا۔ وہ بعد میں انکم ٹیکس کمشنر اور فیڈرل سکریٹری کے عہدے تک گئے۔

بھٹی صاحب سے میاں عبدالرشید صاحب کی گہری دوستی تھی دونوں مشترکہ ادبی ذوق رکھتے تھے اور شاعری پر اکثر ان کے مباحثے ہوتے تھے مگر میاں عبدالرشید صاحب نے ان سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ ان کا بھائی ایف سی کالج میں داخلے کا خواہش مند ہے۔ ان کے گھر میں تعلیم کے معاملے میں سفارش کا تصور ہی نہیں تھا۔ بعد میں میاں عبدالمجید صاحب نے اچھے نمبر لیے اور میرٹ پر ایف سی کالج میں گئے تو بھٹی صاحب ان کو دیکھ کر حیران ہوئے۔

"رشید میاں نے ذکر ہی نہیں کیا کہ تم اس کالج میں آرہے ہو۔"

”جی سر...... میں نے درخواست دی تھی اور انٹرویو میں پاس ہوگیا۔“

بھٹی صاحب اس بات سے خوش ہوئے کہ میاں عبدالمجید صاحب نے ان کے اتنے قریبی دوست کا بھائی ہونے کے باوجود ان سے سفارش نہیں مانگی تھی اور اپنے بل بوُتے پر ایف سی کالج جیسے اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے میں کامیاب رہے تھے۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کو شاباش دیتے ہوئے کہا تھا۔”برخوردار اس دنیا میں وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جو سفارش کی بے ساکھی قبول نہیں کرتے۔“

میاں عبدالمجید صاحب کی زندگی میں ان کے والد میاں امام الدین صاحب اور بھائی عبدالرشید کا کردار بے حد نمایاں رہا ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ فعال کردار ادا کرتے رہے اس لحاظ سے ہم دیکھیں تو ہمیں ان کی ماں جی کا کردار زیادہ فعال نظر نہیں آتا ہے لیکن کیا واقعی ایسا ہی تھا؟۔ ایک تناور پودا سورج کی روشنی اور بارش کے پانی سے پنپتا دکھائی دیتا ہے مگر اس دھرتی میں اس کی جڑیں کتنی گہری ہیں اوراس زمین نے اسے کس طرح سے سہارا دے رکھا ہے یہ کسی کونظر نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح ایک ماں کا کردار اپنے بچے کی پرورش اوراس کی زندگی میں کیا ہوتا ہے یہ صرف ماں جانتی ہے یا پھر بچہ جانتا ہے۔

ماں جی میاں عبدالمجید صاحب سے بے انداز محبت کرتی تھیں اس اولاد سے محبت کااندازہ کون کرسکتا ہے جسے روزانہ راتوں کوتہجد کی نماز کے بعد دعا کا ثمر کہا جاسکتا ہے۔ جب میاں عبدالمجید صاحب پیدا ہوئے تو ان کے بھائی مزید تعلیم کے لیے گھر سے جاچکے تھے اور اب ان کے پاس ایک ہی بچہ تھا۔ ساری توجہ، محبت اور ممتا اس کے لیے مخصوص تھی۔ ماں جی نے میاں عبدالمجید صاحب کی صرف جسمانی پرورش نہیں کی تھی بلکہ ان کی ذہنی ساخت کوبھی ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔

دین دار اور پرہیز گار ماں ایک بیٹے کو دین سے وابستگی اور اس سے محبت کے احساس کے سوا اور کیا دے سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی ان کے دونوں بچے بے پناہ ترقی کے باوجود اپنی دینی اقدار اور معاشرے سے جڑے رہے۔

میاں عبدالرشید صاحب شروع میں دین کی طرف زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے نماز بھی پابندی سے ادا نہیں کرتے تھے' جاننے والے جب یہ بات میاں امام الدین صاحب اور ماں جی کو بتاتے تھے تو وہ کہتے کہ ان کو امید ہے ان کی تربیت اور ان کے خون کا اثر رائیگاں نہیں جائے گا وہ صبر کے ساتھ خدا سے دعا کرتی رہتی تھیں کہ وہ میاں عبدالرشید صاحب کو دین کی راہ پر چلائے۔ رفتہ رفتہ میاں عبدالرشید صاحب د ین کی طرف آنے لگے اور پھر اُنھوں نے ایسی راہ پکڑی کہ مرتے دم تک اس پر قائم رہے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ ان کو مذہب کی طرف راغب کرنے میں سب سے اہم کردار ان کی ماں کی دعاؤں کا ہے۔

جب میاں امام الدین صاحب اور ماں جی مستقل بچوں کے پاس لاہور آ گئے تو ماں جی نے میاں صاحب سے اصرار شروع کر دیا کہ اب میاں عبدالمجید صاحب کی شادی کر دی جائے۔ اس وقت وہ بی ایس سی کر رہے تھے۔ میاں جی نے انکار کر دیا۔ ''ابھی یہ پڑھ رہا ہے اس کے گلے میں مصیبت مت ڈالو۔''

ماں جی نے کچھ اصرار کیا پھر چپ ہو گئیں۔ شاید ان کی چھٹی حس نے خبر دار کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے ان کے پیٹ میں مسلسل تکلیف تھی۔ جو کھاتیں وہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ وہ علاج کراتی رہیں مگر فرق نہیں پڑا۔ اچانک اُنھوں نے بچوں سے کہا کہ وہ ان ساری جگہوں پر جانا چاہتی ہیں جہاں وہ رہی ہیں۔ میاں امام الدین صاحب اور بیٹے یہ سن کر پریشان ہو گئے ان کو سمجھایا کہ وہ اکیلی کس طرح جائیں گی مگر اُنھوں نے ضد جاری رکھی تو مجبوراً بیٹے اور میاں امام الدین صاحب مان گئے تھے

اور اُنھوں نے ماں جی کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ گوندانوالہ چلی گئیں جہاں ایک زمانے میں میاں امام الدین صاحب اسکول میں ٹیچر تھے۔ وہاں ماں جی کی کئی سہیلیاں تھیں اوران سے قرآن کریم پڑھنے والی کئی لڑکیاں تھیں۔ ماں جی ان کے پاس گئیں تو اُنھوں نے ان کی خوب خدمت کی۔ اس کے بعد وہ پھرتی رہیں، مختلف گاؤں دیہاتوں میں جاتی رہیں وہاں ان کی سہیلیاں تھیں اور بہت ساری جاننے والیاں تھیں۔

جس طرح وہ اچانک گئی تھیں اسی طرح اچانک ان کا خط آ گیا کہ میں بیمار ہوں۔ مجھے آ کر لے جاؤ۔ وہ سب پریشان ہوگئے تھے کیونکہ یہاں سے تو اچھی خاصی گئی تھیں۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ ان سے چلا پھرا بھی نہیں جارہا۔ میاں عبدالرشید صاحب کے ایک دوست سے کار لے کر میاں عبدالمجید صاحب ماں جی کو لینے گئے، اور جب اُنھوں نے ماں جی کو دیکھا تو ان کے دل کو دھچکا لگا تھا وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں اور اسی وجہ سے چلنے پھرنے سے قاصر ہوگئی تھیں۔ ان کو لاہور لایا گیا، پیٹ کی تکلیف بہت بڑھ چکی تھی ان کو اسپتال میں داخل کروا دیا۔ ان کے ٹیسٹ بھی ہوئے مگر ڈاکٹروں کی سمجھ میں ان کا مسئلہ نہیں آرہا تھا۔ کمزوری حد سے زیادہ تھی اس لیے ڈاکٹروں نے کہا۔ ''ان کو خون کی ضرورت ہے۔''

میاں عبدالرشید صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب دونوں نے خون دیا۔ ان کا خون گروپ میچ کررہا تھا۔ اس سے کمزوری دور ہوئی تو ان کو اسپتال سے چھٹی دے دی گئی۔ مگر کچھ دن بعد تکلیف پھر بڑھی اوران کو دوبارہ اسپتال میں داخل کرانا پڑا تھا۔ وہاں پھر سے خون دیا گیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کو کئی بار اسپتالوں میں داخل کرایا۔ یہ سارے مختلف اسپتال تھے جہاں ان کو امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی تھی وہ ماں جی کو وہاں لے جاتے تھے آخر میں ڈاکٹروں نے ان کو بالکل جواب دے دیا۔

اُنھوں نے میاں امام الدین صاحب سے کہا۔ ان کو گھر لے جائیں اور ان کی جس حد تک ممکن ہو خدمت کریں، ان کے لیے اب یہی ہوسکتا ہے۔''

جب میاں عبدالمجید صاحب نے یہ سنا تو وہ سمجھ گئے، مگر ماں جی کے سامنے ظاہر بھی نہیں کرنا تھا، وہ ان کے سامنے ہنستے مسکراتے تھے اور اکیلے میں آنسو بہاتے تھے۔ ماں جی سب دیکھ اور سمجھ رہی تھیں وہ جانتی تھیں کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے یہ احساس ان کو بہت پہلے ہی ہوگیا تھا جب ماں جی نے اپنی پیدائش سے لے کر آج تک جن جگہوں پر رہی تھیں ان کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ وہ مرنے سے پہلے ایک بار اور ان جگہوں کو جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بچوں کے سامنے رہتیں تو ان کی تکلیف چھپی نہ رہتی۔ وہ ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لیے وہ گھر سے دور چلی گئیں اور جب آخری وقت آ گیا تو اُنھوں نے خط لکھ بھیجا، جب اسپتال والوں نے جواب دے دیا تو وہ اس کے بعد چند دن زندہ رہی تھیں۔

آخری وقت تک ان کو اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب کی پہلی بیوی سے بیٹا تھا۔ اس کا نام آصف تھا اور اُنھوں نے اسے کم سنی میں اس کی ماں سے لے لیا تھا۔ اور ماں جی کے حوالے کر دیا تھا۔ آصف میاں عبدالمجید صاحب سے آٹھ یا نو برس چھوٹا تھا مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس نے اس ننھی سی جان کے لیے ماں جی کے سینے میں ممتا کا چشمہ جاری کر دیا۔ آصف نے ان کا دودھ پیا تھا اور وہ ایک طرح سے میاں عبدالمجید صاحب کا رضاعی بھائی بھی ہے۔ ابھی آصف بہت چھوٹا تھا، نو سال کا، میاں عبدالرشید صاحب دوسری شادی کر چکے تھے اور ان کے بیوی بچے تھے۔ ماں جی کو آصف کی فکر تھی کہ اسے نظر انداز نہ کر دیا جائے وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ مرنے سے ایک دن پہلے اُنھوں نے

میاں عبدالمجید صاحب کو بلایا اور آصف کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"پتر...... اب آصف تیری ذمے داری ہے۔"

کیسے لوگ تھے...... سراپا محبت اور خلوص...... ذمے داریاں دینے اور لینے والے...... میاں عبدالمجید صاحب نے ماں جی سے وعدہ کیا کہ وہ آصف کا پورا خیال رکھیں گے۔ اُنھوں نے مرحومہ ماں جی سے کیا یہ وعدہ نبھایا۔ آصف نے تعلیم تو زیادہ حاصل نہیں کی مگر وہ میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ ہی رہا ہے۔

ماں جی نے ساری عمر ان کو دیا ہی دیا تھا۔ پیدا کرنے سے لے کر پرورش کر کے بڑے کرنے تک ان کے لیے اپنا آپ مٹا دیا۔ ماں جی گھر چلانے کے لیے کتنی محنت کرتی تھیں اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے وہ گھر میں استعمال ہونے والا صابن تک خود بناتی تھیں۔ صبح فجر سے لے کر عشاء کے بعد تک ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ بے حد مصروفیت میں گزرتا تھا۔ اس محنت کے صلے میں جب ان کے بیٹے تناور درخت بن گئے اور ان کی چھاؤں میں ستانے کا وقت آیا تو اُنھوں نے دنیا سے ہی منہ موڑ لیا۔ اپنی بیماری کو بھی چھپائے رکھا کہ ان کے بچے پریشان نہ ہوں، اور جب خدمت لینے کا وقت آیا تو چند دن سے زیادہ زحمت نہ دی۔

میاں عبدالمجید صاحب کے حواس گم ہو گئے تھے اُنھوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ماں جی اتنی جلدی ان کو چھوڑ جائیں گی، ان کو زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ وہ ماں جی کی خدمت بھی نہ کر سکے۔ اس وقت وہ پڑھ رہے تھے۔ اسپتال اور علاج کے سارے اخراجات میاں عبدالرشید صاحب کر رہے تھے میاں عبدالمجید صاحب صرف ہاتھ سے خدمت کر سکے تھے اور وہ بھی بہت کم وقت کے لیے۔ کتنے دن وہ بے قرار اور اشک بار رہے تھے۔ اس زمانے میں رسل و رسائل اتنے اچھے نہیں تھے اور دوسرے میاں امام الدین صاحب اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آدمی کے

نصیب میں جہاں کی مٹی ہو' یعنی جہاں اس کی وفات ہوئی ہو اسے اسی جگہ دفن کرنا چاہیے اس لیے ماں جی کو نواں کوٹ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں میاں امام الدین صاحب بھی ان کے پہلو میں دفن ہوئے تھے۔

جنازے میں کون کون شریک ہوا تھا' کلاسکے اور دوسرے جاننے والے گاؤں دیہاتوں سے کون کون آیا تھا یا نہیں' جنازہ کس نے پڑھایا تھا' میاں عبدالمجید صاحب کو اس بارے میں بالکل بھی یاد نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''ماں جی کی وفات کا صدمہ ایسا تھا کہ میں خود کو بھول گیا تھا۔ کتنے عرصے تک تو مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ ماں جی اب ہم میں نہیں ہیں۔''

ماں جی کے بعد زندگی کے سونے پن کا احساس ہونے لگا حالانکہ وہ پرائمری کے بعد زیادہ تر گھر سے دور رہے تھے مگر ماں جی تھیں تو وہ کہیں بھی ہوتے ان کو لگتا تھا وہ گھر میں ہیں ۔ گھر سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ میاں امام الدین صاحب تھے شفیق بھائی جان تھے مگر ایک ماں جی نہ رہیں تو سب بدل گیا تھا۔

جدوجہد کا آغاز

میاں عبدالمجید صاحب نے خود کو تعلیم میں مگن کرلیا تھا۔ بی ایس سی اس زمانے میں بہت دشوار تعلیم سمجھی جاتی تھی اور لڑکے عام طور سے اس سے جی چرا کر آرٹس اور کامرس کے شعبوں میں چلے جاتے تھے۔ ویسے بھی وہ ادبی دور تھا اس لیے آرٹس کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ بی ایس سی یا سائنس کی طرف کم لوگ آتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب چاہتے تھے کہ ان کی فرسٹ کلاس آئے تاکہ آگے کا امکان زیادہ بہتر ہو۔ اس وجہ سے وہ پوری محنت کررہے تھے۔ فیروز سنز والی ملازمت بھی جاری تھی۔ اس دوران میں غلام حسین صاحب فیروز سنز چھوڑ کر ملتان میں نئی قائم ہونے والی کالونی ٹیکسٹائل مل چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے مل کے اکاؤنٹس کا سیٹ اپ بنایا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی مل تھی۔ اسے مل کے بجائے شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ملتان شہر کے ساتھ ایک اور شہر آباد ہوگیا تھا۔

چنیوٹ کے ایک کاروباری نصیر اے شیخ صاحب اس کے مالک تھے۔ مل میں اسپننگ بھی تھی اور ویونگ بھی۔ کیونکہ ملتان کا خطّہ کپاس کی پیداوار کے لیے مشہور ہے اس لیے اُنھوں نے یہ مل قائم کی۔ اس میں افسران اور اوپرے درجے کے کارکنوں کے کوارٹرز بھی تھے۔ مل اور اس کے اطراف کے سارے علاقے کی ترقی کے لیے مل کی جانب سے ترقیاتی بجٹ مخصوص تھا۔ حد یہ کہ سڑکیں بنانے تک کے

لیے بجٹ تھا۔ مل کی اپنی ریل لائن تھی جس پر روزانہ صبح سویرے ملتان سے ایک ڈبا مزدور لے کر آتا تھا اور پھر شام کو ان کو لے جاتا تھا اور رات کی شفٹ کے مزدور لاتا تھا جن کو صبح چھوڑتا تھا۔۔ کیونکہ مل تک آنے والی سڑک خراب تھی اور مزدوروں کو آنے جانے میں بہت دشواری ہوتی تھی' اس لیے شیخ صاحب نے یہ بندوبست کیا تھا۔ مل کی منصوبہ سازی تو پاکستان بننے سے پہلے ہوگئی تھی مگر اس کا قیام پاکستان بننے کے بعد ہوا تھا۔

غلام حسین صاحب جب کالونی ٹیکسٹائل چلے گئے تو انھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کو بھی وہاں آنے کو کہا۔ ابھی وہ بی ایس سی کر رہے تھے۔ غلام حسین صاحب لاہور آتے تو ان سے کہتے تھے۔ ''یار کیا جان مار رہے ہو ابھی بی ایس سی ہے' پھر ایم ایس سی کرو گے' اس کے بعد کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کہیں لیکچرار لگ جاؤ گے۔ اس میں کتنا ملے گا اب ادھر دیکھو' ٹیکسٹائل مل بن رہی ہے' ابھی آغاز ہے آگے دیکھنا دور تک جائے گی۔ ایک ایک اسپننگ ماسٹر اور ویونگ ماسٹر ہزاروں روپے تنخواہ لے رہا ہے۔ میں کہتا ہوں' چھوڑو بی ایس سی ادھر آ جاؤ۔''

یہ اس دور کی بات ہے جب کلرک ڈیڑھ سو روپے تنخواہ لیتا تھا اور اس میں خود کو بادشاہ محسوس کرتا تھا۔ ہزاروں میں کمانے کا لوگ سوچا ہی نہیں کرتے تھے۔ بہت بڑے درجے کے افسران کی تنخواہ ہزاروں میں جاتی تھی۔ ممکن ہے میاں عبدالمجید صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سب چھوڑ کر نوکری کرنے پہنچ جاتا۔ مگر روپیا کمانا ان کا نصب العین نہیں تھا۔ میاں صاحب نے ان کے سامنے میاں عبدالرشید صاحب کی مثال رکھ دی تھی۔ وہ بی اے تھے اور ایم اے بھی کر سکتے تھے۔ عربی فارسی میں ایسی دسترس رکھتے تھے کہ کسی یونی ورسٹی میں اس کے پروفیسر بن سکتے تھے کمشنری اور تحصیل داری معمولی سی چیز تھی مگر میاں امام الدین صاحب نے میاں عبدالرشید صاحب

کو پڑھنے دیا اور سب ان کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔

جب میاں عبدالمجید صاحب نے میاں صاحب سے غلام حسین صاحب کی پیش کش کا ذکر کیا اُنھوں نے کہا۔ ''مجید پتر...... میرے لیے نوکریاں اور روپیا اہم نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی میں خودمختار ہو۔ بی ایس سی کرنے کے بعد بے شک تم چلے جاؤ مگر تم نے یہ سوچا ہے کہ ایک اسپننگ ماسٹر یا وہیلنگ ماسٹر بن کر تم کہاں تک جاسکتے ہو؟''

میاں عبدالمجید صاحب نے غور کیا' واقعی ان کو ہزاروں میں تنخواہ تو مل جاتی مگر اس کے بعد ان کا کیریئر بس یہیں تک محدود ہو کر رہ جاتا اس لیے اُنھوں نے غلام حسین صاحب سے معذرت کرلی کہ فی الحال وہ اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز رکھنا چاہ رہے ہیں۔ غلام حسین صاحب نے ان کے انکار کا برا نہیں منایا اور فراغ دلی سے بولے۔

''جیسی تمہاری مرضی...... مگر جب تم چاہو' میرے پاس کالونی ٹیکسٹائل آجانا۔''

وقت نے ثابت کیا کہ میاں عبدالمجید صاحب کا یہ فیصلہ درست تھا۔ اُنھوں نے تعلیم کو نوکری پر ترجیح دی تھی اور بی ایس سی مکمل کیا۔ اس سے ان کو بعد میں دوران تربیت بہت زیادہ آسانی رہی تھی۔ تعلیم کا فائدہ اس وقت کھل کر ان کی سامنے آگیا جب ٹیکسٹائل کی تربیت کے دوران وہ بات میاں عبدالمجید صاحب بہ آسانی سمجھ جاتے تھے جو ایک کم تعلیم یافتہ آدمی کو سمجھنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی اور وہ اسے سیکھنے میں بہت دیر لگاتا تھا۔ اس طرح وہ بہت تیزی سے سیکھتے چلے گئے تھے۔ اگر وہ بی ایس سی نہ کرتے تو ایک ہی شعبے میں ہو کر رہ جاتے اور اس سے آگے نہیں جاسکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ایک اوسط درجے کی کامیاب زندگی گزار لیتے مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ موجودہ شہرت' عزت اور مرتبہ حاصل کر پاتے۔

قیامِ پاکستان کے وقت حکومت کو جو مشکلات درپیش تھیں ان سے نمٹ کر حکومت نے پہلی بار ملک کی ترقی اور تعمیر کے ادارے اور منصوبے بنائے، ان منصوبوں میں ایک تھل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ تھا' شمال مغربی پنجاب میں تھل نامی ایک صحرا ہے جس کا وجود اب تقریباً ویسا نہیں ہے اور آبپاشی کے لیے نہریں بنانے سے اس کا بڑا حصہ اب سرسبز وشاداب کھیتوں میں بدل گیا ہے۔

تھل کا شمار صرف پنجاب میں نہیں پاکستان کے پس ماندہ ترین حصوں میں ہوتا تھا۔ حکومت نے اس کی ترقی کے لیے پروجیکٹ بنایا اس کے تحت وہاں ٹیکسٹائل کی صنعت قائم کی جانی تھی۔ کیونکہ ان علاقوں میں تعلیم اور فنی مہارت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس پروجیکٹ کے انچارج ظفر الاحسن صاحب تھے۔ (نائب ناظمہ کراچی نسرین جلیل کے والد) یہ منصوبہ سازی کے ماہر اور بہت قابل آدمی تھے۔ ملک کے ابتدائی دور میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تھل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ بھی اُنھوں نے بنایا تھا۔ اس کے بعد جب ایل ڈی اے یعنی لاہور ڈیولپمنٹ اتھارٹی بنی تو یہ اس کے پہلے ڈائریکٹر تھے اس دور میں اُنھوں نے جدید لاہور کا نقشہ تیار کیا۔ آج کا لاہور تقریباً اس نقشے کے مطابق ہے۔ سمن آباد اور گلبرگ جیسی بڑی اسکیمیں اُنھوں نے بنائی تھیں۔ جب ان کو تھل کا پروجیکٹ دیا گیا تو اُنھوں نے اس کے لیے قابل افراد بھرتی کرنا شروع کیے۔ میاں والی کے قریب (پپلاں) ٹیکسٹائل مل قائم کی جارہی تھی' اُنھوں نے اخبار میں اشتہار دیا کہ تعلیم یافتہ لڑکے یہاں آکر آپرنٹس شپ کریں۔

یہ اشتہار میاں عبدالمجید صاحب کی نظر سے گزرا اور یہ نوکری نہیں تھی محض آپرنٹس شپ تھی جس میں طلبہ کو بغیر نوکری کا وعدہ کیے تربیت دینے کی بات کی گئی تھی۔ مگر ان کو اس میں کشش محسوس ہوئی' خاص طور سے اس حوالے سے کہ یہاں

بھی تعلیم دی جا رہی تھی۔ بے شک یہ ایک قسم کی فنی تعلیم تھی پھر بھی میاں عبدالمجید صاحب نے یہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنھوں نے اس کے لیے درخواست دے دی۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت تھل ایک خوفناک صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا اور کسی بھی سلسلے میں وہاں جانا خود کو جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اُنھوں نے میاں امام الدین صاحب سے بات کی اور اُنھوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ایک مسئلہ تھا کہ اس پروجیکٹ کے لیے اور بھی بہت سارے لڑکوں نے درخواست دے رکھی تھی۔ نصف درجن تو ان کے جاننے والے تھے۔ اصل میں یہ ایک طرح کی رضا کارانہ ملازمت تھی اوراس وقت لوگوں اور خاص طور سے نوجوان نسل میں وطن اور قوم کے لیے کچھ کر دکھانے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے بہت سارے لوگ آ گئے تھے۔ اس وقت کی نوجوان نسل نے اس جوش وجذبے کے ساتھ ایسے کارنامے سرانجام دیے اور جو آج کی نسل تمام تر سہولیات رکھنے کے باوجود کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ اصل چیز جذبہ ہے نہ کہ وسائل ...... جذبہ ہو تو وسائل خود بہ خود مل جاتے ہیں اور جذبہ نہ ہو تو وسائل بھی بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

اس وقت لاہور میونسپل کارپوریشن کے سربراہ ملک غلام نبی صاحب تھے۔ وہ میاں عبدالرشید صاحب کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے امرتسر سے ہجرت کی تھی وہاں پر وہ مقامی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے میاں عبدالرشید صاحب سے کہا۔ ”آپ اُن سے کبھی میرا تذکرہ کر دیں۔“

”میں کہہ دیتا ہوں۔“ میاں عبدالرشید صاحب نے کہا اور ملک غلام نبی صاحب سے بات کی اُنھوں نے جواب دیا۔

”آپ فکر نہ کریں ظفر الاحسن سے میری بات چیت ہے میں ان سے کہہ

دوں گا۔''

یوں میاں عبدالمجید صاحب کو یہ آپرنٹس شپ مل گئی۔ ان کو خط ملا کہ وہ مقررہ تاریخ کو ماڑی انڈس کے ذریعے لیاقت آباد پہنچ جائیں۔ اس وقت یہ سارا علاقہ غیرآباد تھا۔ جوہر آباد اس وقت سرگودھا سے آگے آخری گاؤں تھا۔ اور اس کے بعد صرف ریت تھی۔ اس کے بعد بھکر آتا تھا۔ پپلاں بہت دور تھا بعد میں اس کا نام لیاقت آباد رکھ دیا گیا۔ اس ٹرین میں ان کے ساتھ درجن بھر لڑکے اور بھی شامل تھے ان سب کو آپرنٹس شپ ملی تھی۔ان سب کو پچاس روپے الاؤنس یا تنخواہ اور رہائش ملنا تھی۔ البتہ کھانا وہ خود تیار کرتے' اس کے لیے ان کو سہولیات ملتیں۔

یہ جگہ چشمہ سے زیادہ دور نہیں ہے ۔میاں والی بھی پاس ہے۔ یہاں چاروں طرف ریت تھی جب وہ اسٹیشن سے اتر کر مل کے مقام پر پہنچے تو وہاں چند کوارٹرز تھے جن میں باہر سے آنے والے ورکرز کو ٹھہرانا تھا مل کی عمارت بن رہی تھی۔ کچھ مشینری لگ گئی تھی اور کچھ آ رہی تھی۔ پہلی ہی رات شدید قسم کا طوفان آیا جس میں ریت اڑ رہی تھی اور اگلی صبح اُنھوں نے دیکھا تو آنے والا سامان ریت میں دبا تھا۔ سارا دن محنت کر کے اُنھوں نے مشینوں کی پیٹیاں نکالیں جب اُنھوں نے یہ محنت کر لی تو ایک مقامی کارکن نے بتایا۔

''جناب ایسے طوفان تو ہر رات آتے ہیں' یہاں ان کو اندھیری کہتے ہیں۔ آپ کو ہر صبح سامان ریت میں دبا ملے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ پھر روز رات کو طوفان آتا اور وہ روز سامان ریت سے نکال کر استعمال کرتے تھے۔ دن میں درجہ حرارت پچاس ڈگری تک چلا جاتا تھا۔ موسم بے حد خشک تھا۔ البتہ ایک اچھی بات تھی وہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔ جوہر آباد سے ٹینکروں میں پانی آتا تھا' وہاں زیرزمین پانی بہت نیچے اور کڑوا تھا۔ اس لیے پانی دور سے لانا

پڑتا تھا۔ صبح شام ٹینکر آتے تھے اور پانی بڑی بڑی ٹینکوں میں ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ پینے کے پانی اور نہانے دھونے میں آسانی رہتی تھی۔ اس وقت اسپننگ مل لگائی جارہی تھی۔ اس میں دھاگہ بنتا ہے اوراس کے بعد ویونگ مل لگتی اور ٹکسٹائل مل مکمل ہوجاتی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس علاقے میں تو کپاس تھی نہیں۔ کپاس جنوبی پنجاب اور سندھ میں کاشت کی جاتی تھی تو اس جگہ کیوں انڈسٹری لگائی جارہی تھی۔ دراصل یہ انگریز کا طریقہ تھا۔ وہ کسی ویران جگہ پر ایک صنعت لگاتے تھے' اس میں کام کرنے کے لیے اردگرد سے لوگ وہاں آجاتے' پھران کی سہولت کے لیے مکانات' اسپتال' اسکول اور دوسرے ضروری دفاتر بنادیے جاتے۔ سڑک' بجلی اور باقی ضرورت کی چیزیں مہیا کردی جاتی تھیں۔ اس طرح سے ایک قصبہ وجود میں آجاتا۔ برصغیر میں انگریزوں نے بے شمار شہر اسی طرح بسائے تھے۔ پنجاب میں لائل پور (فیصل آباد) اور منٹگمری (ساہی وال) اس کی مثال تھے جو آج کل بڑے شہر ہیں۔ خاص طور سے فیصل آباد کپڑے کی صنعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

تھل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ میں یہی طریقہ کار استعمال کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں نہریں نکالنے کا منصوبہ بن رہا تھا۔ اس سے علاقے میں کاشت کاری شروع ہوجاتی اور کسان کپاس اگاتے تو مل کو بھی کپاس ملنا شروع ہوجاتی۔ جب پاکستان بنا تو کپاس کی ساری کاشت پاکستان میں ہوتی تھی۔ جب کہ اس کی ساری صنعت بھارت کو مل گئی تھی۔ یہ انگریز کی پالیسی تھی اس نے مسلم اکثریتی حصے کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا تھا اور اسے صرف زرعی خام مال بنانے کے لیے مخصوص کردیا تھا اور ساری صنعتیں اس نے ان علاقوں میں لگائی تھیں جو بھارت کو ملے۔ یہی وجہ تھی صنعتی لحاظ سے پاکستان پسماندہ ملک تھا۔

حکومت نے فیصلہ کیا کہ ملک کو ترقی دینی ہے تو صنعت کو ترقی دینا ہوگی۔ صنعتوں میں سب سے آسان صنعت کپڑے کی ہوتی ہے۔ اس کا خام مال بے حساب تھا اور بھارت سے ٹیکسٹائل ملوں میں کام کرنے والے مسلمان بھی ہجرت کر کے آ گئے تھے ان کے ہنر سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس لیے ٹیکسٹائل کی صنعت پر خاص توجہ مرکوز کی گئی اور پورے ملک میں اس کے کارخانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔ تھل میں لگایا جانے والا کارخانہ بڑے اچھے طریقے سے بنایا جا رہا تھا' حالانکہ اس وقت سرمائے' سہولیات اور فنی افرادی قوت کی قلت تھی۔ اس کے باوجود محنت اور لگن سے کام ہو رہا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو دو اور ساتھیوں کی شراکت میں ایک کوارٹر ملا تھا۔ اس میں کھانا بنانے کا بندوبست تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں ساتھی جانے پہچانے تھے ایک ڈھولن وال کے زمانے کا دوست تھا اور دوسرا ٹی آئی کالج کا ایک ساتھی۔ یہ قادیانی تھا مگر ان سے اچھی دوستی تھی۔

تینوں کھانے پینے کا سامان مل جل کر لاتے تھے اور مل جل کر ہی پکاتے تھے۔ اس سے اخراجات میں بچت ہوتی تھی۔ صبح سورج نکلتے ہی کام کا آغاز ہو جاتا تھا جو سورج غروب ہونے تک جاری رہتا تھا۔ مل کی مشینری کا یہ حساب تھا کہ یہ پرزوں کی صورت میں ڈبوں میں پیک آتی تھی اور اسے جوڑنا ہوتا تھا۔ مل کی مشینری جاپان سے آ رہی تھی اسے جوڑنے اور چلانے کی تربیت دینے کے لیے جاپانی ماہر بھی ساتھ آئے تھے۔ مل کے لیے فنی افرادی قوت بھرتی کی جا رہی تھی احمد آباد سے آنے والے مہاجر اور بھارت کے دوسرے حصوں سے آنے والے افراد وہاں آ گئے۔ یہ زیادہ تر مہاجر ہی تھے ان کے فنی تجربے سے میاں عبدالمجید صاحب اور دوسرے زیرِ تربیت لڑکوں نے فائدہ اٹھایا۔ بعد میں یہ تین چار سو تربیت حاصل کرنے والے لڑکے پورے ملک میں پھیل گئے تھے اور اُنھوں نے ہی صحیح معنوں میں ملک

میں اس صنعت کی بنیاد رکھی تھی۔

تھل پروجیکٹ میں منصوبہ بنانے والوں نے یہ کام کیا کہ اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ فنی افرادی قوت، تعلیم یافتہ غیر فنی قوت اور غیر تعلیم یافتہ و غیر فنی افرادی قوت کو جمع کیا۔ تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ غیر ملکی تھے، اُنھوں نے مقامی تعلیم یافتہ کو تربیت فراہم کی۔ اپنی تعلیمی بنیاد کی بدولت ان کے لیے یہ کام سیکھنا آسان ثابت ہوا، اور انھوں نے اَن پڑھ فنی قوت کو جدید مشینوں کا استعمال سکھایا۔ ان سے کام کرنے کے طریقے سیکھے، صرف مشینیں چلانا یا بنانا نہیں سیکھا بلکہ ایک کارخانہ چلانا سیکھا۔ جن لڑکوں نے اس پروجیکٹ میں دو تین سال کام کیا وہ اس قابل ہو گئے کہ ایک پورا کارخانہ سپروائز کر سکتے تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب کو کام اچھا لگا تھا مگر گھر سے دوری سے ان کو وحشت ہوتی تھی جسے اس صحرا کی تنہائی نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ ان کو لاہور کے شب و روز یاد آتے تھے۔ وہاں کی رونقیں اور دوست احباب کا خیال آتا تھا۔ یہاں کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ صبح سے شام تک کام اور اس کے بعد کھانا بنا کر اور کھا کر سو جانا اوپر سے ریت عذاب تھی کوئی چیز اور جگہ اس سے بچتی نہیں تھی۔ حد یہ کہ کھانے کی چیزوں میں بھی ریت گھسی ہوتی تھی۔ ایک بار تنگ آ کر اُنھوں نے میاں امام الدین صاحب اور میاں عبدالرشید صاحب کو خط لکھے کہ وہ واپس آ کر ایم ایس سی میں داخلہ لینا چاہ رہے ہیں مگر ان کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں آیا۔ خطوط آتے رہے ان میں دوسری باتیں ہوتی تھیں لیکن ان کے آپرنٹس شپ اور نوکری چھوڑنے کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے دوبارہ خط لکھے، اس بار بھی جواب نہیں آیا اس کے بعد جب وہ پہلی بار گھر گئے تو وہاں میاں امام الدین صاحب نے ان سے کہا۔

"ایک آدمی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اتنی جلدی لائن بدلے۔ جب تک تم وہاں کچھ سیکھ رہے ہو تم کو کام کرتے رہنا چاہیے۔"

بات میاں عبدالمجید صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔ ویسے بھی اس وقت تک ان کا کچھ کچھ دل لگ گیا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے پھر وہاں سے آنے کی بات نہیں کی۔ شروع میں وہاں تھوڑے سے لوگ تھے لیکن جیسے جیسے مل کا کام بڑھتا گیا افرادی قوت بھی تیزی سے بھرتی کی جانے لگی۔ افسران کی تعداد ڈیڑھ سو سے اوپر ہو گئی تھی۔ خان بہادر اشفاق احمد جو ایک زمانے میں حیدرآباد دکن میں آئی جی پولیس رہے تھے ادھر پروجیکٹ انچارج بن کر آ گئے۔ اُنھوں نے آکر بے شمار تفریحی پروگرام شروع کیے۔ آفیسرز کلب بنایا جس کے تحت اسٹیج ڈرامے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ فن کاروں اور گلوکاروں کو بلایا جاتا تھا۔ پھر کھیل شروع کرائے' کرکٹ کی ٹیمیں بنائیں۔ مقامی لوگوں کے لیے یہ انوکھا کھیل تھا۔ ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ کرکٹ بھی کوئی کھیل ہوتا ہے۔ جب کوئی میچ ہو رہا ہوتا تھا تو لوگوں کی بڑی تعداد دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتی تھی۔

میاں عبدالمجید صاحب ڈیڑھ سال اس پروجیکٹ میں رہے اور اُنھوں نے بہ غور اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا جب وہ اس علاقے میں آئے تھے تو یہاں سوائے چند چھوٹے دیہات کے اور کچھ نہیں تھا۔ لوگوں کا پیشہ جانور چُرانا تھا۔ زراعت اور صنعت بالکل نہیں تھی۔ پھر یہ مل بنی' لوگوں کو روزگار ملا' اس کے بعد یہاں سہولتیں آئیں' سڑکیں بنیں' اسپتال اور اسکول بنے' لوگوں میں زندگی کا شعور بڑھا' بعد میں اس علاقے میں نہریں آئیں تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ ترقی یافتہ اور آباد علاقہ بنتا چلا گیا۔ لوگ مل سے روزگار حاصل کر رہے تھے۔ دوسرے ترقیاتی کام شروع ہوئے تو لوگوں کو اس میں بھی روزگار ملا' پھر جب مل نے پیداوار شروع کی تو

اس سے بھی مقامی افراد کو فیض پہنچا۔ ایک ترقی کی زنجیر تھی جو اس علاقے میں جاری تھی۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جو بعد میں یورپ میں تعلیم کے دوران ان کے کام آیا تھا۔

شروع میں ہر کام بے حد مشکل تھا۔ جاپانی انجینئرز کی زبان وہ نہیں سمجھتے تھے اور مقامی افراد جو مل میں کام کرنے آتے تھے وہ ان کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ سہولتیں کم تھیں اور دشواریاں زیادہ' اس پر بھی ایک نظام الاوقات کے مطابق کام کرنا ہوتا تھا کام میں رخنہ نہیں آنا چاہیے تھا۔ مقامی افراد ان پڑھ تھے اور کسی بھی تکنیکی کام کو بڑی مشکل سے سمجھتے تھے۔ ان کو بار بار سمجھانا پڑتا تھا۔ اس سے میاں عبدالمجید صاحب کو غصہ آتا تھا۔ جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ کام کا دباؤ بھی تھا۔ مگر اس کے بعد سب آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا گیا۔ مقامی لوگ ان کی بات اور کام سمجھنے لگے تھے مشینوں کے کام کرنے کا طریقہ جان گئے تھے اور ان کو بھی ہنر کاری کی سمجھ آ گئی تھی۔ یہ تجربہ سب سے قیمتی شے تھا جو اُنھوں نے تھل پروجیکٹ سے حاصل کیا۔ یہ تعلیم ان کو برسوں میں اور ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی نہیں مل سکتی تھی۔

تھل میں آنے والے لڑکے بڑے اچھے گھرانوں اور اعلیٰ درجے کے کالجوں کے گریجویٹ تھے۔ یہاں ان کو سخت حالات میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ پینٹ کوٹ اور ٹائی میں رہنے والے لڑکے جن کے ہاتھ گندے نہیں ہوتے تھے۔ اب صبح سے شام تک مٹی میں اَٹے مشینوں کے پرزے اپنے ہاتھ سے صاف کر کر کے لگاتے تھے۔ صبح کام پر وہ صاف ستھرے ہو کر جاتے تھے اور جب شام کو آتے تو حلیہ ہی خراب ہوتا تھا۔ واپس آ کر صاف ستھرے ہوتے اور جلدی جلدی کھانا بنا کر رات ہونے سے پہلے کھا لیا کرتے تھے۔ کیونکہ رات ہوتے ہی ریتلی ہوا چلنا شروع ہو جاتی اور اس وقت کھانا کھانے سے اس میں بھی ریت شامل ہو جاتی تھی۔ یہ ریت اتنی باریک تھی کہ

ہر جگہ گھس جاتی تھی۔ بند پیٹیوں میں موجود اشیا بھی اس سے محفوظ نہیں تھیں۔ ریت کے خلاف ایک جنگ تھی جو پورے عرصے میں جاری رہی تھی۔

شروع میں ان کی تفریح یہ تھی کہ ذرا دور واقع ریل اسٹیشن پر چوبیس گھنٹے میں ایک گاڑی آتی تھی۔۔ گاڑی اسٹیشن پر ایک منٹ کے لیے رکتی تھی۔ شہر سے آئے لڑکے ایک منٹ کے لیے رکنے والی گاڑی کو دیکھنے جاتے تھے۔ پھر خان بہادر اشفاق احمد ڈائریکٹر بن کر آئے تو اُنھوں نے تفریحی سرگرمیاں شروع کیں، وہ اپنی فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی فیملیاں لے کر آئے اور اس سے ماحول بہتر ہوا تھا۔ پارٹیاں دی جانے لگیں، فنکشن ہوتے تھے، اس طرح نامحسوس طریقے سے سب بدلتا چلا گیا تھا۔ ان کے نزدیک ترین گاؤں کا نام لیاقت آباد رکھا گیا تھا۔ یہ بھیڑ بکریاں پالنے والوں کا گاؤں تھا۔ وہاں نہ تو کوئی پھل ملتا تھا، اور نہ سبزیاں تھیں۔ ان کی زبان بھی عجیب سی تھی پورے گاؤں میں ایک بھی پڑھا لکھا شخص نہیں تھا۔

جب پروجیکٹ نے پورے طور پر کام شروع کیا تو باہر سے آنے والے اس گاؤں میں آباد ہوئے۔ یہاں اسکول کھلا، فیکٹری کے پاس اسپتال بن گیا۔ مل کی وجہ سے بجلی آئی اور ترقی ہونے لگی۔ خواجہ ناظم الدین کا دور تھا اور ابھی تک حکومت خلوص نیت سے کام کر رہی تھی۔ اس لیے پاکستان میں وہ کام ہو رہے تھے جو اس کے بعد کبھی نہیں ہوئے۔ لوگوں میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ موجود تھا۔ جیسا کہ بتایا گیا کہ کام اس طرح شروع ہوا کہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ لڑکے اس شعبے کی الف بے سے بھی ناواقف تھے مگر اُنھوں نے بڑی محنت سے کام سیکھا۔ پلاننگ کرنے والوں نے درست پلاننگ کی۔ اُنھوں نے اپنے وسائل کا درست اندازہ لگایا اور بین الاقوامی امداد حاصل کرتے ہوئے تیز رفتاری سے کام کیا۔ محض دو سال کے عرصے میں مل تیار ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے علاقے میں ماحول بدلا تھا اور یہی اس وقت کے حکمرانوں

کی حکمت عملی تھی وہ ترقی کے اثرات کو پورے ملک میں پھیلانا چاہتے تھے مگر آنے والے حکمرانوں نے اس حکمت عملی پر عمل نہیں کیا اور اُنھوں نے ملک کے پسماندہ حصوں کو ترقی دینے کے بجائے صنعتوں اور ترقی کے عمل کو چند شہروں اور علاقوں تک محدود کر دیا۔ اس سے بہت سارے مسائل نے جنم لیا اور اس کی وجہ سے پاکستان کی معیشت اور سیاست دونوں کو نقصان پہنچا۔

میاں عبدالمجید صاحب اس دور کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''ابتدائی مشکلات کے بعد ہماری ٹیم میں ہم آہنگی آنے لگی تھی۔ تھل پروجیکٹ کے چیئرمین ظفرالاحسن صاحب باقاعدگی سے وہاں آتے تھے اور ہمارے ساتھ قیام کرتے تھے۔ ان کی آمد سے ہم سب کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ ان کی موجودگی سے ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم اپنے ملک کے لیے بہت اہم کام کر رہے ہیں۔ ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ صبح سویرے ہم سب سے پہلے پیٹیوں سے ریت ہٹا کر اور نمبر کے حساب سے ان کے پرزے نکال کر مشینوں میں لگاتے تھے اس کے لیے ہمارے پاس ایک باقاعدہ مینول تھا۔ اس کے مطابق پرزے نکالتے۔ یہ پرزے کیونکہ سمندر کے راستے ڈبوں میں بند ہو کر آتے تھے اس لیے ان کو سمندر کی آب وہوا سے بچانے کے لیے ان پر چکناہٹ لگا دی جاتی تھی تو پرزے نکال کر پہلے ان کو مٹی کے تیل سے صاف کرنا ہوتا تھا اس کے بعد مشین میں اس کی مخصوص جگہ نصب کرتے تھے۔

لڑکوں کے گروپ تھے۔ شروع میں تو سب اسمبلنگ کا کام کرتے تھے' ہمارے فورمین اور ان پر سپروائزر ہوتا تھا جو اس سارے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ ایک ایک کر کے مشینیں تیار ہونا اور اپنی جگہ پر لگنا شروع ہو گئیں۔ ان کی وجہ سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا' پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کون سا پرزہ مشین میں کون سا کام کرتا ہے۔ ہمیں مشین کی سمجھ آنی شروع ہوئی۔ اس کے بعد جب مشین نصب کی

جاتی تو ہمیں یہ پتا چلتا تھا کہ یہ مشین کیا کام کرتی ہے اور مل میں اس کا کیا کام ہے۔ ٹیکسٹائل مل بہت وسیع ہوتی ہے۔ اس میں سیکڑوں طرح کی مشینیں کام کرتی ہیں اور ہر مشین میں سیکڑوں پرزے ہوتے ہیں۔ دنیا کی کوئی ٹیکسٹائل یونی ورسٹی، کوئی ٹیکنیکل کالج ان سب مشینوں کے بارے میں تعلیم نہیں دیتا ہے، مگر تھل پروجیکٹ میں ہم نے یہ سب سیکھا تھا۔

پروجیکٹ کا اسپنگ ماسٹر ایک جاپانی کواسے تھا۔ ناقابل یقین حد تک محنتی اور اپنے کام سے لگن رکھنے والا آدمی۔ جنگ عظیم کو ختم ہوئے صرف چھ سال گزرے تھے اور راکھ کے ڈھیر سے جاپان کی قوم نے اٹھ کر یہ مقام بنالیا تھا۔ اس کے باوجود ان کے ملک میں کپاس کا ایک پودا نہیں اگتا تھا اور وہ ٹیکسٹائل کی جدید ترین مشینری بنا کر نہ صرف دنیا بھر کو بیچ رہے تھے بلکہ ان کے ماہرین ان ملکوں میں جا کر ان مشینوں کو لگا رہے تھے اور ان کو چلانے کی تربیت بھی دے رہے تھے۔ کواسے کے ذمے مل میں مشین لگانا اور اُسے پروڈکشن میں لانا تھا۔ مگر اس نے ہمیں مشینوں کے بارے میں بتانے اور عملی طور پر ان کے استعمال کی تربیت کی ذمے داری بھی لے رکھی تھی۔ وہ سارا دن مل میں کام سکھاتا، اس کے بعد رات کو لڑکوں کو چھ چھ کے گروپ میں بانٹ کر ان کو ٹیکسٹائل کے بارے میں لیکچر دیتا تھا۔ تربیت اور لیکچر کے علاوہ اس کے گھر جانا ہمارے لیے الگ معاشرتی سرگرمی بھی تھی۔ کیونکہ اس کی بیوی آئس کریم سے ہماری خاطر تواضع کرتی تھیں۔ ایک گروپ کی باری تین چار دن بعد آتی تھی۔ اور ہم سب بے تابی سے اپنی باری کے دن کا انتظار کرتے تھے۔ تھل میں آئس کریم مل جائے اس سے بڑی اور کیا بات ہوسکتی تھی۔

مسز کواسے ایک پڑھی لکھی جاپانی خاتون تھیں جو اپنے شوہر کی مدد کے لئے ہزاروں میل دور اس جنگل میں موسم کی سختیاں جھیل رہی تھیں۔

ہم دو درجن لڑکے تھے اور ان دو سالوں میں ہم نے جو وہاں پر سیکھا وہ ہمیں دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں اتنی مضبوط بنیاد ہمیں کہیں سے نہیں مل سکتی تھی۔ جب یہ کام مکمل ہوگیا تو سب لڑکوں کو ان کی پسند کے شعبے دے دیے گئے۔ بعض اسپنگ میں رہے۔ بعض ویونگ میں چلے گئے اور کچھ نے ورکشاپ پسند کی۔ یہ تو ہماری حالت تھی اس مل کی وجہ سے علاقہ ہی بدل گیا۔ گندے کپڑے اور گندے چہرے والے لوگ اب صاف ستھرے نظر آنے لگے۔ اسکول' اسپتال بن گئے۔ لیاقت آباد میں بازار لگنے لگا۔ جس میں عام استعمال کی چیزیں مل جاتی تھیں۔

لیاقت آباد سے سب سے قریبی شہر میانوالی تھا۔ سب لڑکے چھٹی کے دن گھومنے پھرنے وہاں جاتے تھے۔ میانوالی کے ڈپٹی کمشنر ایک نوجوان آدمی تھے۔ کھیلوں کے شوقین تھے اُنھوں نے ایک کرکٹ ٹیم بنائی تھی وہ لیاقت آباد میں مل کی ٹیم سے میچ کھیلنے آتی تھی اور کبھی یہ لوگ میانوالی جاکران کی ٹیم سے میچ کھیلتے تھے۔ بعض لڑکے مطالعے کے شوقین تھے ادبی ذوق رکھتے تھے اُنھوں نے کہا' میانوالی چل کرکتابوں کی دکان تلاش کرنی چاہیے۔ اگلی بار جب میانوالی گئے تو وہاں کتابوں کی دکان تلاش کی۔ بڑی کوشش کے بعد ایک چھوٹی سی دکان ملی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے بھی وہاں سے ایک کتاب لی جو آج تک اُن کے پاس محفوظ ہے۔ یہ اختر شیرانی کا مجموعہ کلام تھا۔ ان دنوں نوجوانوں میں ان سے زیادہ مقبول شاعر اور کوئی نہیں تھا۔ ان کے حوالے سے ایک عجیب واقعہ آج تک میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے۔

''جب وہ لاہور کے ایف سی کالج میں پڑھتے تھے تو میانی صاحب قبرستان کے پاس سے اکثر گزر ہوتا تھا۔ وہاں ایک قبر پر کتا کھڑا دکھائی دیا۔ کئی روز تک یہ لوگ یہی تماشا دیکھتے رہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختر شیرانی کی قبر ہے اور یہ کتا

ان کا پالتو تھا۔ اتنا وفادار نکلا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان سے دور رہنا گوارا نہیں کیا۔ لوگوں نے کہا اب یہ مستقل یہیں رہتا ہے۔ جب میاں عبدالمجید صاحب نے میانوالی میں یہ کتاب دیکھی تو انھیں اختر شیرانی اور ان کا کتا یاد آ گیا۔ میانوالی اس وقت چھوٹا سا شہر تھا شام ہوتے ہی وہاں سناٹا چھا جاتا تھا اور گولیاں چلنے لگتی تھیں اس لیے میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھی جب بھی میانوالی جاتے تھے شام ہونے سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ میانوالی کے علاوہ دوسری قابل دید شے کالاباغ تھا۔ یہ بے حد خوبصورت اور چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا مقام تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یہ تو نہیں معلوم کہ کالاباغ ڈیم کی جگہ کہاں تھی۔ مگر وہ جگہ دیکھی ضرور تھی جہاں دریا کسی آبشار کی طرح گرتا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے وہاں چند انگریز دیکھے جو شاید ڈیم کے لیے پیمائش کر رہے تھے اور اعدادوشمار جمع کر رہے تھے۔ مگر عوام کے لحاظ سے بے حد پس ماندہ علاقہ تھا۔ نواب کالاباغ کی حکمرانی تھی۔ گھروں پر چولہا ٹیکس بھی لگا رکھا تھا۔ بغیر اجازت کسی کو ریڈیو تک رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ تعلیم کا تناسب بے حد کم تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس علاقے میں ترقی ہوئی، سڑک اور ریل کا نیٹ ورک بنا، انڈسٹری لگی، تعلیمی ادارے کھلے تو میانوالی اور کالاباغ کی پسماندگی دور ہونے لگی تھی۔ اصل ترقی وہاں نہریں آنے سے ہوئی تھی۔ زمینیں آباد ہوئیں، لوگوں کی غربت کم ہوئی تھی اور یہ سب میاں عبدالمجید صاحب نے اپنے سامنے ہوتے دیکھا۔

ان ہی دنوں تھل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے تحت بھکر میں بھی مل بننا شروع ہوگئی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے جو لیاقت آباد میں سیکھا تھا اب اس کی مدد سے بھکر کی مل چلانی تھی۔ بلکہ مل لگانی بھی تھی تو میاں عبدالمجید صاحب کبھی بھکر جاتے اور کبھی لیاقت آباد آ جاتے تھے۔ راستہ کچا اور ریت سے اٹا ہوا تھا لیکن آنے جانے

کے دوران میں رات ہوجاتی تھی اور ریت کا طوفان چلنے لگتا جسے اندھیری کہتے تھے ایسے میں ڈرائیور جیپ روک کر بیٹھ جاتا اور ریت جیپ پر گر کر جمع ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات تو میاں عبدالمجید صاحب گھبرا جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیپ ریت تلے دب جائے گی۔ اور یہ سب اس میں زندہ دفن ہوجائیں گے۔ مگر ڈرائیور جو مقامی تھا مطمئن رہتا تھا۔ وہ بچپن سے یہ سب دیکھتا آیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ طوفان کتنی دیر برقرار رہے گا اور اس کی شدت کتنی ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کیوں کہ نئے تھے اس لیے گھبرا جاتے تھے۔

پھر اس سفر کے دوران میاں عبدالمجید صاحب نے ایک اونٹ کا ڈھانچہ دیکھا۔ وہ طوفان میں کھڑا تھا اور اس پر ریت اس طرح گری کہ وہ اس میں پھنس کر کھڑا ہی رہ گیا اور اسی حالت میں مر گیا اس کا ڈھانچہ بھی کھڑا تھا۔ بعد میں ریت اڑ گئی اور وہ سامنے آ گیا۔ صحرا میں اس قسم کے بہت سارے عجوبے تھے۔ راتوں میں کوئی اکیلا صحرا میں نہیں جاتا تھا ورنہ وہ ریت کے طوفان میں دب کر مر جاتا۔ اِنھیں ان باتوں سے ڈر لگتا تھا مگر اللہ کا شکر ہے اِن کے یا اِن کے کسی ساتھی کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

ان دنوں کندیاں جنکشن اسٹیشن تھا۔ ریل ٹریک آہستہ آہستہ آگے آیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں چشمہ پاور پلانٹ لگایا گیا ہے۔ خام مال لانے اور تیار مال لے جانے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لیے ریل ٹریک مل تک لایا گیا پھر آگے یہ بھکر تک چلا گیا اس سے سفر کی سہولت ہوگئی تھی اور خام مال یعنی کپاس بہت آسانی سے مل تک آنے لگی تھی۔ علاقے کی ترقی میں ریل نیٹ ورک کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ شروع میں سارا کام ٹرکوں سے ہوتا تھا۔ ظفر الاحسن صاحب اس پروجیکٹ کو، جو سرکاری طور پر سب سے بڑا پروجیکٹ تھا غیر ملکیوں میں خوب تشہیر کرتے تھے' جب غیر ملکی آتے تو

ان کو خاص ریسٹ ہاؤسز میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ علاقے کو سرسبز و شاداب دکھانے کے لیے باہر سے بڑے بڑے درخت ٹرکوں میں لاد کر وہاں لگائے جاتے تھے۔ حد یہ کہ پھلوں سے لدے پھل دار درخت تک جڑوں سے اکھاڑ کر وہاں لائے جاتے تھے۔ مقصد غیر ملکیوں کو بتانا تھا کہ تھل کے علاقے میں ترقی ہو رہی ہے۔ حالانکہ ابھی وہاں ترقی کا آغاز تھا۔ بہرحال بعد میں سچ مچ ترقی ہوئی اور اس کا کریڈٹ ظفر الاحسن صاحب کو جاتا ہے۔

پروجیکٹ انچارج اشفاق احمد صاحب ایک انوکھا آئیڈیا لائے۔ اُنھوں نے مل کے اسپننگ کے شعبے ریلنگ کے لیے صرف عورتوں کو رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پر بے حد ہلکی مشینیں تھیں جن کو عورتیں بھی آسانی سے چلاسکتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے عورتوں کا ایک ہاسٹل بنایا۔ شہروں اور بڑے دیہاتوں سے آپرنٹس شپ پر لڑکیاں لائے۔ ان کو تربیت دلوائی اور مل میں ملازم رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ملکی ترقی میں برابر حصہ لیں۔ مزے کی بات ہے کہ مل میں ظفر الاحسن صاحب کی پی اے ایک لڑکی مس زیدی ہوتی تھیں اور وہ مہینے میں ایک بار صرف چند دن کے لیے آتے تھے تو اس لڑکی نے جو بے چاری زیادہ تر بے کار بیٹھی رہتی تھی ان سے کہا کہ اسے بھی ٹریننگ کرنی ہے اور اس نے ظفر الاحسن صاحب سے اپنی بات منوا لی تو کچھ دن بعد وہ بھی پتلون قمیض میں کارکنوں کے ساتھ پرزے صاف کر رہی تھی اور اس نے یا میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ وہ لڑکی ہے۔

جب مل کا کام پوری طرح چلنے لگا اور میاں عبدالمجید صاحب کو کچھ فارغ وقت ملتا تھا تو ان لڑکوں نے جو کالج سے آئے تھے وہاں پر ایک اسٹیج ڈرامہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب نے تیاری کی جس لڑکے نے جو کردار ادا کرنا تھا اس کا لباس خود ہی سلوایا

تو جب ڈرامہ شروع کیا تب انہیں پتا چلا کہ ڈرامے کی شہرت تو اس سارے علاقے میں پھیل گئی تھی ۔ لوگ دور دراز کے گاؤں دیہات سے اونٹوں پر سوار ڈرامہ دیکھنے آئے تھے۔ سامنے زمین پر اور چار پائیوں پر بیٹھے تماشائی تھے' ان کے عقب میں لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر دیکھ رہے تھے۔ تین دن یہ ڈرامہ چلتا رہا اور تینوں دن لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے تھے۔

تھل پروجیکٹ میں رونق زیادہ ہوگئی تھی اور وہاں پر تفریح کے مواقع بھی زیادہ ہوگئے تھے۔ دوست احباب بن گئے تھے۔ مگر میاں عبدالمجید صاحب نے محسوس کیا کہ جس مقصد کو لے کر وہاں آئے تھے وہ پورا ہوگیا۔ اُنھوں نے جو سیکھنا تھا وہ سیکھ لیا۔ اب اِنھیں مزید سیکھنے کو نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے ملک غلام حسین صاحب کو خط لکھا کہ اب میں کالونی ٹیکسٹائل میں آنا چاہتا ہوں۔ ان کا جواب آیا۔

"ملتان آجاؤ۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے ایک دن کی چھٹی لی اور غلام حسین صاحب کے پاس چلے گئے۔ ایچ آر کے انچارج نے ان کا انٹرویو لیا اور انھیں ملازمت کے لیے منتخب کرلیا۔ انھیں یہاں پر سنیئر سپروائزر کے عہدے کی پیش کش ہوئی جب کہ تھل میں وہ سپروائزر تھے۔ یہاں پر تن خواہ بھی زیادہ تھی تو یہ ترقی کی جانب میاں عبدالمجید صاحب کا پہلا قدم تھا۔ اُنھوں نے واپس آ کر تھل میں استعفیٰ دیا اور مقررہ وقت پر وہ ملتان پہنچ گئے۔ وہاں ماحول خاصا بہتر تھا۔ سہولیات زیادہ تھیں اور انھیں الگ سے پورا کوارٹر ملا تھا۔ اس میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ وہاں بجلی اور پانی کی سہولت تھی۔ حد یہ کہ چار پائی اور بستر تک مل کی طرف سے ملتا تھا۔ تمام سہولتیں تھیں۔ انھیں صرف کپڑے ساتھ لانے پڑے تھے۔ ملتان ایک تاریخی شہر ہے' یہاں قدم قدم پر قدیم آثار

اور مزارات بکھرے ہیں۔ موسم بے حد خشک اور گرم ہوتا ہے یہ جب وہاں پہنچے تو سردی کا موسم تھا اور بے حد ٹھنڈی خشک ہوا چل رہی تھی۔

ملتان کی مل تھل والی مل کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔ یہاں پر باہر سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہوئے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ فنی شعبوں میں زیادہ تر انڈیا سے آئے لوگ کام کر رہے تھے۔ ان کے پاس فنی تجربہ تھا۔ یہاں پر ٹیکسٹائل انجینئر تھے۔ اس شعبے کے ٹیکنالوجسٹ تھے۔ یہاں پر بھی جاپانی کام کر رہے تھے۔ مل کا منیجر جاپانی تھا اور بھی کئی شعبوں میں جاپانی کام کر رہے تھے۔ یہاں پر آفیسرز کلب اور اسپورٹ کورٹس تھا۔ جہاں کام سے فارغ ہو کر کھیلتے اور ورزش کرتے تھے۔ آسائشیں تھیں، تھل والی مل کے مقابلے میں یہاں بہت کچھ تھا مگر انھیں اس مل میں زیادہ عرصے کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سال بھر سے بھی کم کام کیا تھا اس کے باوجود انجینئرز اور ماہرین سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ خاص طور سے جدید ٹیکسٹائل اور اس کی انتظام کاری کے بارے میں پتا چلا تھا۔

1951ء میں پاکستان میں تعمیر و ترقی کے لیے کولمبو پلان منظور ہوا۔ اس کے تحت پاکستان کو خاص طور سے صنعت اور تعلیم کے شعبے میں مدد دی جاتی تھی۔ کولمبو پلان کے تحت بڑے بڑے کام ہوئے تھے۔ اس میں فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل کالج کے قیام کا منصوبہ بھی تھا۔ بعد میں یہ کالج قائم ہوا اور آج کل یہ ٹیکسٹائل یونی ورسٹی ہے پھر فیصلہ ہوا کہ قابل طلبہ کو برطانیہ میں ٹیکسٹائل کی اعلیٰ فنی تعلیم کے لیے بھیجا جائے گا۔ اس کا ذکر اخبارات میں آیا۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب ملتان میں تھے۔ جب انھیں پتا چلا تو وہ چھٹی لے کر لاہور آ گئے اور اُنھوں نے بھی تعلیمی اسکالر شپ کے لیے درخواست دے دی اور واپس آ گئے۔ ملتان والی مل میں تین شفٹوں میں کام چلتا تھا۔ یعنی مل کبھی بند نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شفٹیں بدلتی رہتی

تھیں۔ پندرہ دن صبح کی' پندرہ دن شام کی اور پھر پندرہ دن رات کی۔

خواجہ ناظم الدین صاحب کے بعد حکومت میں کرپشن آئی تھی مگر ابھی بھی اچھے کام کرنے والے زیادہ تھے۔ اُنھوں نے ملک کی ترقی کے لیے منصوبے شروع کیے تھے۔ اس دور میں صنعتی ترقی کے لیے پی آئی ڈی سی بنی۔ یہ ادارہ ملک بھر میں صنعتی یونٹ بنا کر ان کو نجی شعبے کے سپرد کر دیتا تھا۔ اس زمانے میں لوگوں میں ازخود یونٹ لگانے کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ کسی کے پاس سرمایہ تھا تو یہ ادارہ کارخانے بناتا تھا اور ان کو چلا کر نجی شعبے کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اس نے پس ماندہ ترین علاقوں میں صنعتیں لگائیں۔ ان میں بنوں وولن مل اور بلوچستان میں بھی وولن مل لگائی تھی۔ بڑے کاروباریوں کو حکومت اس شرط پر لائسنس دے رہی تھی کہ وہ پورے ملک میں ملیں لگائیں۔ لائسنس اس شرط پر دیے جا رہے تھے کہ ایک یونٹ وہ مغربی پاکستان میں لگائیں گے تو ایک مشرقی پاکستان میں لگائیں گے۔ تو اس طرح ملک کو ترقی دینے کے منصوبے بنے تھے۔ بین الاقوامی امداد بھی آئی تھی مگر کم تھی۔ البتہ اس کا دانش مندانہ استعمال ہوا تھا۔ بعد میں کہیں زیادہ مدد آئی مگر وہ ضائع کر دی گئی۔ یہ پاکستان کا المیہ ہے۔ ہم نے شروع کے بیس سال میں جو کام کیا درحقیقت وہی ہمارا اثاثہ ہے۔ آنے والے چالیس سالوں میں کام کم ہوا اور خرابیاں زیادہ ہوئیں۔ پی آئی ڈی سی نے ایک تربیتی ادارہ بنایا تھا۔ یہ آج کل پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف منیجمنٹ کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اب یہاں منجمنٹ میں ایم بی اے بھی کرایا جا رہا ہے۔ یعنی اعلیٰ ترین پیمانے پر تعلیم دے رہے ہیں۔ اس وقت ان کے تربیت دینے کا انداز ایسا تھا کہ اُنھوں نے موبائل کورسز شروع کرا دیے۔ ان کے آدمی مختلف ملوں میں جاتے۔ لیکچر دیتے اور چھوٹے چھوٹے چھپے ہوئے کارڈز تقسیم کرتے جن پر مینجمنٹ کے اصول چھپے ہوتے تھے۔ یہ لوگ ان پر عمل کرتے تھے اور اس طرح یہ

لوگ کسی یونی ورسٹی یا تعلیمی ادارے میں جائے بغیر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کارکن، سپروائزر اور افسران سب سیکھ رہے تھے۔ یہ ایسا دور تھا کہ لگ رہا تھا یہ ترقی کی طرف جا رہے ہیں اور جلد ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو جائیں گے۔ انھیں اپنے ملک پر فخر ہوتا تھا۔ قومی ادارے درست سمت میں کام کر رہے تھے۔ منصوبہ بندی درست تھی۔ یہی منصوبے لے کر تو کوریا اور سنگاپور نے ترقی کی شاندار منازل طے کی تھیں ۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ 1958ء کے مارشل لا نے سیاسی ماحول کو تباہ کیا اور فوج کو حکومت کا راستہ دکھایا پھر ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا۔

اس وقت مارشل لا کی ہیبت ایسی تھی کہ تمام غلط اور غیر قانونی کام بند ہو گئے تھے۔ حد یہ کہ لوگ سائیکل پر رات کو بتی کے بغیر سفر نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کی سائیکل میں بتی نہیں ہوتی تھی تو وہ پیدل جاتا تھا۔اس سے پہلے جب ختم نبوت کی تحریک شروع ہوئی تو عوام سڑکوں پر نکل آئے۔قادیانیوں کے خلاف نفرت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب اور دوسرے لڑکے بھی بہت متحرک تھے۔۱۹۵۳ء میں بی ایس سی کا زمانہ تھا یہ لوگ جلسوں میں جاتے تھے۔اس زمانے میں سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ بہت سرگرم تھے۔ ان کی تقریریں سننے جاتے تھے۔ پھر شورش کشمیری تھے اور بھی بہت سارے لوگ تھے مگر کہتے ہیں یہ تحریک دولتانہ نے شروع کرائی تھی۔ اس سے دو طبقوں نے اپنی طاقت پہچان لی۔ ایک فوج نے اور دوسرے مولویوں نے۔ اس چیز نے پاکستان کو بعد میں بہت نقصان پہنچایا۔ ان دونوں طبقات نے ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال کر محض اپنے لیے کام کیا۔

تحریک کے حوالے سے ایک عدالتی کمیشن بیٹھا تھا۔ جس کے سربراہ جسٹس منیر تھے اُنھوں نے مختلف علمائے کرام کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ آپ کا مسلک کیا

ہے۔ بہ حیثیت طالب علم میاں عبدالمجید صاحب وہاں کمیشن جاتے تھے اور کارروائی دیکھا کرتے تھے تو یقین جانئے اکثر علماء میں سوائے کلمے اور روزے نماز کے کسی چیز میں اتفاق نہ تھا تو اس سے انھیں شرمندگی ہوتی تھی۔ اسی دوران شہر بھر میں افواہ گردش کر رہی تھی کہ بادشاہی مسجد لاہور سے کوئی خصوصی اعلان ہونے والا ہے۔ اور سب لوگ حیران و پریشان تھے اور کچھ لوگ اعلان سننے کے لیے بے تاب بھی تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ایک دوست کلب عباس (کلب عباس بعد میں ایئر وائس مارشل ریٹائر ہوئے) شاید بادشاہی مسجد گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو پتا چلا لاہور میں کرفیو لگ گیا ہے اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے تو یہ لوگ بڑی مشکل سے گھر واپس آئے۔ گھر والے سمجھ رہے تھے کہ انھیں آرمی پکڑ کر لے گئی ہے' اس زمانے میں حالات ہی ایسے تھے۔ لوگوں پر پہلی بار ایسی افتاد پڑی تھی۔ اُنھوں نے راتوں کو چھتوں پر چڑھ کر اذان دینا شروع کر دی۔ سی ایم ایل اے جنرل اعظم خان تھے انھوں نے حکم دیا کہ اذانیں بند کی جائیں ورنہ اسے گورنمنٹ کے خلاف چیلنج سمجھا جائے گا۔

افسوس کہ ابھی ہمارے ملک نے ترقی شروع کی تھی۔ اگر ہمیں ایسی باتوں میں نہ الجھایا جاتا تو ہم بہت آگے جاتے۔ مفاد پرستوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے قوم کو جذباتی باتوں میں الجھایا اور ہماری ترقی کا راستہ رک گیا۔ جب معاملات سیاست دانوں کے ہاتھ سے نکل کر بیوروکریسی کے ہاتھ میں آئے تو اُنھوں نے ملک کا بیڑا غرق کرنا شروع کیا۔ پھر آرمی والے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ عوام کو اُلجھانے کے لیے سب سے موثر حربہ یہ تھا کہ عوام کو بتایا جائے پاکستان خطرے میں ہے اور اسلام خطرے میں ہے۔ اس پر عوام کو سڑکوں پر لایا جاتا تھا اور ان کی مدد سے فیصلے کرا لیے جاتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کے بعد یہ تماشا شروع

ہوا جو ایوب خان کے آنے تک جاری رہا۔ اس نے ملک کے حالات کو ایک بار پھر سنبھال لیا تھا اس کے اولین دور میں بہت سارے کام ہوئے تھے جو اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہوئے۔

پاکستان کے سیاست دانوں میں قائداعظم کے بعد میاں عبدالمجید صاحب کو سہروردی صاحب پسند تھے۔ حسین شہید سہروردی صاحب اس معیار کے سیاست دان تھے اگرچہ ان کا انداز سیاست اتنا صاف ستھرا اور شفاف نہیں تھا مگر پھر بھی ان کی ذہانت میں شبہ نہیں۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے بنگال کے چیف منسٹر رہے تھے۔ ان کے پاس صلاحیت کے ساتھ وسیع تجربہ تھا۔ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو خواجہ ناظم الدین صاحب کے بعد ہونے والا قیادت کا خلا پورا ہوسکتا تھا۔ وہ ۱۹۵۵ء میں وزیراعظم بنے، مگر حالات بدل چکے تھے اور ملک کے اصل حکمران اب بیوروکریسی کے لوگ تھے۔ سہروردی صاحب نے چین سے تعلقات قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس سال میاں عبدالمجید صاحب کو تعلیم کے لیے برطانیہ کا اسکالرشپ مل گیا تھا۔ وہ وہاں چلے گئے، اس لیے سہروردی کا دور نہیں دیکھ سکے۔ ہاں بعد میں ان سے ملاقات رہی تھی۔ واپس آنے کے بعد میاں عبدالمجید صاحب نے کراچی میں کاروبار شروع کیا۔ اس زمانے میں کراچی سے لاہور کے لیے نائٹ کوچ چلنی شروع ہوئی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب کی ساتھ والی نشست پر ایک نوجوان بیٹھے تھے۔ جو سوسن (SUESSEN) کمپنی کے انجینئر تھے۔ یہ کمپنی بھی بال بیرنگ بناتی تھی اور اس کی ایجنسی میاں عبدالمجید صاحب کی کمپنی کے پاس تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے بال بیرنگ پر بات شروع کی۔ اس زمانے میں سب سے اچھا بال بیرنگ جرمن کمپنی ایس کے ایف بناتی تھی۔ یہ لوگ بحث کررہے تھے اور انھیں پتا نہیں تھا کہ عقبی نشست پر سہروردی صاحب بیٹھے ہیں۔ اُنھوں نے اچانک مداخلت

کی۔ ''کیا ایس کے ایف کے علاوہ بھی کوئی اور کمپنی بال بیرنگ بناتی ہے؟''

یہ جملہ اُنھوں نے انگریزی میں کہا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے مڑ کر دیکھا اور ان کی خدمت میں سلام کے بعد عرض کیا کہ ایک بار ''میری آپ سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔'' اُنھوں نے کہا کہ ان کو نام یاد نہیں ہے لیکن ان کا چہرہ یاد ہے۔ اس وقت وہ میکلوروڈ پر اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ ذاتی پریکٹس کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے کہا کہ ''میں آپ سے ملنے آپ کے دفتر آؤں گا۔'' تو اُنھوں نے منع کر دیا۔ ''نہیں نوجوان تم میرے دفتر مت آنا۔''

میاں عبدالمجید صاحب پریشان ہو گئے۔ ''مجھ سے ایسی کون سی گستاخی ہو گئی ہے سر جو آپ مجھے منع کر رہے ہیں۔''

''نوجوان تم نے ابھی نیا نیا بزنس شروع کیا ہے اور میرے دفتر کے باہر چوبیس گھنٹے سی آئی ڈی والے گھومتے رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں نقصان ہو۔''

قائداعظم کو میاں عبدالمجید صاحب نے ایک ہی بار سامنے سے دیکھا تھا۔ وہ 1948ء میں لاہور آئے تھے۔ جلسہ تھا اور اُنھوں نے عوام سے خطاب کرنا تھا۔ ان کا خطاب چار بجے تھا مگر میاں عبدالمجید صاحب آگے جگہ حاصل کرنے کے لیے گیارہ بجے ہی وہاں پہنچ گئے۔ اُنھیں آگے جگہ مل گئی۔ اس روز بے پناہ گرمی تھی۔ رضا کار مشکیزوں کے ذریعے لوگوں کو پانی پلا رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب اور دوسرے لوگ چلّو میں پانی لے کر پی رہے تھے۔ یا سروں پر ڈال رہے تھے۔ چار بجے قائداعظم نے خطاب شروع کیا۔ اُنھوں نے شروع کے ایک دو جملے اردو میں کہے اس کے بعد انگریزی پر آ گئے۔ ان کے الفاظ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھی۔ وہ بات بات پر قائداعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ تقریر دیکھنے کے لیے قائداعظم نے ایک

آنکھ پر مونوکل عینک لگا رکھی تھی۔ ان کی ایک آنکھ کمزور تھی اور دوسری بالکل ٹھیک تھی اور جب وہ کسی بات پر زور دے کر بات کرتے تو یہ مونوکل گر جاتی تھی اس کے ساتھ ایک ڈوری ہوتی تھی جس سے یہ بندھی رہتی تھی۔ ان کے بعد لیاقت علی خان صاحب کو دیکھا وہ منٹو پارک آئے تھے ان دنوں جہاد کشمیر چل رہا تھا اور میاں عبدالمجید صاحب اے آر پی میں رضا کار تھے۔ ان دنوں نواں کوٹ میں سول ڈیفنس بنا رکھی تھی۔ یہ لوگ بلیک آؤٹ اور دوسری مشقیں کرتے تھے اس تقریر کے دوران لیاقت علی خان صاحب نے اپنا مشہور زمانہ مکاّ دکھایا تھا۔ اس کے بعد ان کا مکاّ اتحاد اور قوت کی علامت بن گیا تھا اور بھی بہت سارے لیڈروں کو دیکھا تھا۔

ملک بننے کے بعد میاں عبدالمجید صاحب کو جو پہلا دھچکا لگا۔ وہ قائداعظم کی وفات کا تھا۔ اس روز شاید ہی ایسا کوئی پاکستانی ہو جس کی آنکھ میں آنسو نہ ہوں۔ لیاقت علی خان کی شہادت نے بھی سب کو دکھی کر دیا تھا۔ ملک میں بے انتہا مسائل تھے مگر ان کے ہوتے لوگوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ معاشی حالات اور مہاجرین ...... یہ دو مسائل سرفہرست تھے ۔ سہروردی صاحب کے دور تک مہاجرین کی آمد تو رُک گئی تھی مگر آباد کاری کا مسئلہ باقی تھا۔ پھر الاٹمنٹ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس میں بدعنوانی کی باتیں ہونے لگیں جس کو نہیں ملا وہ بھی شکوہ کر رہا تھا اور جسے ملا وہ بھی رو رہا تھا کہ پورا نہیں ملا۔ لوگوں میں ابتدائی جذبہ بھی سرد پڑتا جا رہا تھا۔ آپس میں حسد اور دولت کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی تھی کہ ملک کی معاشی حالت بہت بری ہے۔ سارا معاشی نظام پرمٹوں کے گرد گھوم رہا تھا۔ وزرا اور افسران پرمٹ بیچتے تھے اور اس کی مدد سے کاروباری طبقہ پیسے بنا رہا تھا۔ پاکستان میں کرپشن کی بنیاد پرمٹ تھے اگرچہ ان کی وجہ سے ترقی ہوئی تھی مگر خرابی کی وجہ بھی یہی تھے۔

آغاز میں پاکستان کا سب سے مضبوط شعبہ تعلیم کا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے

بھی بے شمار اچھے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ادارے تھے ان سے پڑھ کر وہ نسل نکلی جس نے پاکستان بنایا۔ اس وقت نوجوانوں میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ تھا۔ تعلیم کے بعد ان میں پڑھے لکھے لوگ سامنے آئے۔ اُنھوں نے ادارے قائم کیے یا وہ تعلیمی اداروں کے سربراہ رہے۔ اس وقت ہر بڑی شخصیت نے کوئی نہ کوئی تعلیمی ادارہ بنا رکھا تھا۔ مخیّر حضرات ان اداروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس وجہ سے مسلمان تعلیم کے معاملے میں تیزی سے آگے بڑھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ معیار برقرار رہا۔ بعد میں جب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے نیشنلائزیشن شروع کی اور تعلیمی اداروں کو بھی قومیا لیا تو ان کا بیڑا غرق ہوگیا۔

میاں عبدالمجید صاحب ملتان میں تھے اور اس بات سے مایوس تھے کہ اب اسکالرشپ ملنے کا چانس نہیں ہے تو اچانک ہی لاہور سے کال آئی کہ ان کا نام اسکالرشپ کے لیے منتخب ہوگیا ہے اور انھیں فوری طور پر لاہور میں رپورٹ کرنا ہے۔ ان کے پاس کپڑوں کے چند جوڑے تھے وہ لے کر روانہ ہوگئے۔ انھیں وہاں جاکر پتا چلا کہ چند دن کا وقت ہے۔ شاید پانچ یا چھ دن کا۔ انھیں کراچی جانا تھا جہاں کولمبو پلان والوں کا دفتر تھا، ان کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب کے ایک جاننے والے اس وقت پنجاب کے چیف سکریٹری تھے یہ لوگ ان کے پاس گئے۔ اُنھوں نے اُسی وقت فارم منگوایا اُس پر ان کی تصویر لگی اور دو دن میں پاسپورٹ مل گیا۔ اب کراچی جانا تھا۔ بڑے بھائی میاں عبدالرشید صاحب نے میاں عبدالمجید صاحب سے کہا۔ ”تم نے اسکول میں داخلہ لیا تو خود گئے...... کالج میں داخلہ لیا تب بھی خود گئے۔ اب کراچی تم کو چھوڑنے میں جاؤں گا۔“

بھائی جان میاں عبدالمجید صاحب کو کراچی چھوڑنے آئے۔ یہ 1956ء کا سال تھا اور یہ پہلی بار کراچی آئے تھے۔ میاں عبدالرشید صاحب اس سے پہلے بھی کراچی

اسمبلی سیشن کی رپورٹنگ کے لیے آتے رہتے تھے۔ کولمبو پلان کے دفتر سے پتا چلا کہ ابھی وقت ہے، تو میاں عبدالمجید صاحب نے آٹھ دس دن کراچی گھوم کر دیکھا۔ قائداعظم کے مزار پر حاضری دی۔ پہلی بار سمندر اور کیماڑی کی بندرگاہ دیکھی۔ ایک دوست کے گھر مقیم رہے پھر ان کے لیے برطانیہ کا ٹکٹ آ گیا۔ اس کے بعد ایک طویل سفر تھا۔

ایک نئی دنیا

کولمبو پلان کی وجہ سے پاکستان کو ابتدائی دور میں بہت سہارا ملا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ہمارے ہاں صنعتی ترقی ہوئی بلکہ بے شمار پاکستانیوں کو جن کی تعداد لاکھوں میں چلی گئی تھی اس وقت اعلیٰ تعلیم اور خاص طور سے سائنس اور فنی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جب ہمارے تعلیمی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان تربیت یافتہ پاکستانیوں نے آنے والے برسوں میں ملک کے اندر صنعتی اور معاشی ترقی کی بنیاد رکھی۔ میاں عبدالمجید صاحب بھی ان پاکستانیوں میں سے ایک ہیں۔ ستمبر 1956ء کو وہ برٹش ایرویز کے ذریعے لندن کی طرف روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں فضائی سفر بہت عام نہیں تھا اور طویل مسافت طے کرنے والے طیارے وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لیے آج جو مسافت سات آٹھ گھنٹے میں طے ہوجاتی ہے اُنھوں نے چوبیس گھنٹے میں طے کی۔ پہلے طیارہ کسی عرب ملک میں رکا' اس کے بعد قاہرہ میں رکا' جو اس زمانے میں مسلم دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ پھر یورپ میں متعدد جگہوں پر اترا۔ جرمنی میں آخری بار رکنے کے بعد بالآخر طیارہ لندن جا اُترا۔

طویل سفر کے باوجود وہ بور نہیں تھے۔ کیونکہ ان کے ساتھ کئی لڑکے اور بھی جارہے تھے۔ ان میں ایک اقبال حمید دستی تھے۔ یہ پنجاب کے ایک وزیر عبدالحمید دستی کے صاحبزادے تھے۔ ویسے اقبال حمید دستی نے میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ تھل

پروجیکٹ میں اپرنٹس شپ کی تھی اور خوش مزاج آدمی تھے۔ ان کی وجہ سے وقت اچھا گزرا تھا۔ جب طیارے نے بحیرہ روم اور یورپ پر پرواز شروع کی تو پتا چلا کہ ایک ترقی یافتہ دنیا سے گزر رہے ہیں۔ نیچے بڑی بڑی تعمیرات تھیں۔ کارخانے تھے' سڑکوں اور ریلوے کا جدید نظام تھا۔ سمندر میں دیوہیکل بحری جہاز سفر کر رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم سے یورپ کے تین بڑے ملک جرمنی' فرانس اور برطانیہ متاثر ہوئے تھے مگر دس گیارہ سال کے اندر اُنھوں نے تباہی کے آثار تک مٹا کر قابل رشک ترقی کرلی تھی۔ وہ کسی طرح ترقی یافتہ ممالک سے کم نہیں تھے۔ بلکہ یہی دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک تھے۔ پاکستان صرف دو سال بعد آزاد ہوا تھا اوراس کی حالت یورپ جیسی تھی۔ مگر اپنی تعلیم یافتہ افرادی قوت کی وجہ سے یورپ نے بہت جلد ان مسائل پر قابو پالیا تھا جن سے پاکستان ابھی تک نبرد آزما تھا۔

کراچی سے چلے تو سخت گرمی تھی اور جب لندن میں اترے تو فراٹے کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ ان کو لینے کے لیے برٹش کونسل کا آدمی آیا ہوا تھا۔ ان کو ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی ہوٹل میں رکے تھے۔ اس میں باتھ روم کمرے کے ساتھ نہیں تھا۔ اور پہلی رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ وضو کرنے باتھ روم میں گئے تو پیچھے چابی کمرے میں رہ گئی۔ اور اب وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے اوران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور اندر کیسے جائیں اتنے میں ایک انگریز وہاں سے گزرا ان کو کھڑے دیکھ کر اس نے کہا۔

''نوجوان تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

میاں عبدالمجید صاحب نے بتایا کہ ان کی چابی اندر رہ گئی ہے۔ اس نے مسکرا کر ان سے کہا۔ ''میرے ساتھ آئیں'' اوران کو لے جا کر استقبالیہ والوں سے کہہ کر کمرا کھلوا دیا اور یوں اُنھوں نے لندن میں پہلی رات گزاری۔ اگلے روز ان کو برٹش

کونسل جانا تھا۔ وہاں ان کو کچھ رقم دی گئی کہ کپڑے وغیرہ لینا ہیں تو لے لیں۔ ان کا داخلہ مانچسٹر کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ہوا جو مانچسٹر یونی ورسٹی ہی کا ایک حصہ تھا۔ یہ داخلہ بی ایس سی آنرز (Tec) میں ہوا تھا۔ جبکہ اقبال حمید دستی کا داخلہ مانچسٹر سے باہر ایک ڈپلومہ کالج میں ہوا تھا۔ ان کو دو دن لندن میں رکنا تھا اس کے بعد تیسرے دن ریل گاڑی کے ذریعے مانچسٹر چلے جانا تھا۔ دو دن اُنھوں نے لندن گھوم پھر کر دیکھا۔ بکنگھم پیلس گئے' برٹش میوزیم دیکھا اس کی انڈیا آفس لائبریری دیکھی جس کی ساری دنیا میں شہرت تھی، ٹرالفگر اسکوائر گئے۔ اس وقت پورے انگلینڈ میں صرف دو ادارے تھے جو ٹیکسٹائل کے شعبے میں اعلیٰ درجے کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی تھا یہ بعد میں یونی ورسٹی بنا اور فنی تعلیم دینے والے متعدد اسکول اور کالجز اس کے ماتحت آ گئے اس طرح یہ بہت بڑی درس گاہ بن گئی تھی۔ دوسری لیڈز یونی ورسٹی تھی' بعد میں اور بھی ادارے آ گئے جو ٹیکسٹائل کے مختلف شعبوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ ان کا ساری دنیا میں نام اور معیار تھا۔ مانچسٹر کے بارے میں سب جانتے ہیں اسے ٹیکسٹائل سٹی کا نام دیا گیا تھا جیسے پاکستان میں فیصل آباد کو ٹیکسٹائل سٹی کہا جاتا ہے۔ مانچسٹر شہر انگلینڈ کی کاؤنٹی لنکاشائر میں ہے۔ ساری ٹیکسٹائل انڈسٹری لنکاشائر میں تھی۔ صنعتی انقلاب کا مرکز مانچسٹر تھا۔

دو دن بعد انھیں مانچسٹر تک کا ٹکٹ دیا گیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ مانچسٹر میں تھے۔ انگلینڈ چھوٹا سا ملک ہے۔ کہیں بھی اس کا عرض وطول ایک سو چالیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے ٹرین سے کہیں بھی چند گھنٹوں کے اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ مانچسٹر میں بھی برٹش کونسل کا ایک آدمی ان کو لینے آیا تھا۔ اس نے ان کو ایک دن کے لیے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اگلے روز ان کا ایک گھر میں بندوبست کر دیا گیا۔ انگلینڈ

میں رواج ہے وہاں پر لوگ گھر میں کسی کو ٹھہرا لیتے ہیں اور اس سے کرایہ اور کھانے پینے کے اخراجات لے لیتے ہیں۔ اس کو وہاں پے انگ گیسٹ یعنی ادائیگی کرنے والا مہمان کہتے ہیں۔ اس کے بعد یونی ورسٹی میں رجسٹریشن کا مرحلہ تھا۔ وہ بھی ہو گیا تو آگے پڑھائی شروع ہو گئی۔ میاں عبدالمجید صاحب جن کے گھر میں رکے تھے وہ خوش مزاج اور ملنسار لوگ تھے۔

مانچسٹر اچھا شہر تھا بس وہاں کی دو باتیں ان کو اچھی نہیں لگتی تھیں ایک تو وہاں بارش بہت ہوتی تھی اور جب بارش ہو جاتی تو موسم خاصا سرد ہو جاتا تھا اس لیے وہاں سارے سال ہی سردی رہا کرتی۔ قسمت سے سال میں چند دن ہوتے تھے جب بارش نہیں ہوتی تھی۔ وہاں نمی بہت زیادہ تھی اور نمی کی وجہ سے وہاں ٹیکسٹائل کی صنعت نے ترقی کی تھی۔ اس صنعت کے لیے نم ماحول اچھا ہوتا ہے مگر زیادہ بارش کی وجہ سے وہاں کائی ہو جاتی تھی عمارتیں کالی ہو جاتی تھیں اور زمین اسفنج کی طرح نرم تھی۔ مٹی دھول کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ ملتان کی آب و ہوا کے بالکل الٹ آب و ہوا تھی۔ اس ڈگری کورس میں ٹیکسٹائل کی مکمل معلومات آجاتی تھیں۔ بنیادی طور پر دو کورس تھے ایک ٹیکنالوجی کا اور ایک انجینئرنگ کا۔ ٹیکنالوجی میں ٹیکسٹائل کے متعلق تمام ٹیکنالوجی آجاتی تھی اور انجینئرنگ مکینکل تھی اس میں ٹیکسٹائل ملوں میں استعمال ہونے والی مشینری کے بارے میں پڑھایا جاتا تھا۔ جیسے دھاگا بنانے کی مشینیں اور کپڑا بننے کی مشینیں۔ تجربہ گاہ میں بھی جانا ہوتا تھا۔ مگر پہلے سال میں صرف تعارف تھا، تھیوری پڑھائی جا رہی تھی۔ اس میں فزکس تھی اور کیمسٹری کا تعارف تھا اس کے علاوہ انجینئرنگ کی تھیوری بھی پڑھائی جا رہی تھی۔ یہ بی ایس سی آنرز کی ڈگری تھی۔ تین سال میں اس کا کورس مکمل ہو گیا تھا۔ 1959ء میں میاں عبدالمجید صاحب نے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ وہ اوّلین پاکستانیوں میں تھے جنھوں نے ٹیکسٹائل ڈگری

حاصل کی تھی۔

ان کے علاوہ بھی پاکستانی کولمبو پلان کے تحت بڑی تعداد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک کے تعلیمی اور فنی اداروں میں آئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ صرف مانچسٹر یونی ورسٹی میں دو درجن پاکستانی طلبہ تھے اُنھوں نے وہاں پاکستانی طلبہ کی ایسوسی ایشن بھی بنالی تھی۔ طلبہ کے علاوہ کشمیری آرہے تھے خاص طور سے بھارت کے مقبوضہ کشمیر سے آنے والے افراد کو برطانیہ بے حساب ورک ویزا دے رہا تھا اصل میں دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی معاشی حالت سنبھالنے کے لیے اُنھیں افرادی قوت اور کپڑے کی بے پناہ ضرورت تھی اس وجہ سے ٹیکسٹائل انڈسٹری کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ ٹیکسٹائل ا س وقت دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری بن گئی۔

جنگ عظیم دوم نے یورپ اور ایشیا کے بڑے حصے کو تباہ کردیا تھا۔ یورپ کی بحالی کے لیے امریکہ نے مارشل پلان بنایا۔ اس کے تحت پیسہ اور تکنیکی امداد بہت تیزی سے فراہم کردی گئی مگر ایک مسئلہ تھا جسے کسی طرح سے حل نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ افرادی قوت کی شدید کمی تھی۔ جنگ عظیم میں کروڑوں افراد مارے گئے تھے خاص طور سے کام کرنے والے جوان مرد۔ اس مسئلے کو عارضی طور پر حل کرنے کے لیے یورپی ممالک نے تیسری دنیا سے افرادی قوت درآمد کی۔ جرمنی نے لاکھوں کی تعداد میں ترک بلوالیے۔ فرانس نے افریقہ میں اپنی کالونیوں سے افرادی قوت منگوائی۔ اٹلی اور برطانیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ دوسرا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افرادی قوت مزید تعلیم دینے کے بہانے بلوائی۔ ان کو تعلیم دلانے کے بہانے ان کو تین چار سال اپنے کارخانوں میں استعمال کرتے تھے اس کے بعد تربیت دینے کے بہانے ان کی صلاحیتوں کو بغیر تنخواہ کے استعمال کرتے تھے۔ اس طریقے سے وہ اعلیٰ

تعلیم یافتہ افرادی قوت کی کمی پوری کر رہے تھے۔

مگر اس کا فائدہ تیسری دنیا کے ممالک کو بھی ہوا۔ تعلیم کے لیے جانے والے سب افراد واپس نہیں آئے تھے۔ پچاس فی صد افراد وہیں رک گئے اور اُنھوں نے جس ملک میں تعلیم حاصل کی اس کا ایک حصہ بن گئے مگر نصف افراد واپس آئے اور اُنھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں ترقی کے لیے بنیاد رکھی۔ اس طرح یہ ممالک بھی فائدے میں رہے۔ تیسری دنیا سے آنے والے افراد نہ صرف ان کے کارخانوں میں کام کر رہے تھے بلکہ فارغ اوقات میں یہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چھوٹے موٹے بھی کام کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے دیکھا کہ تارکین وطن نہ صرف بڑے پیمانے کی معیشت بلکہ چھوٹے پیمانے کی معیشت کو بھی سہارا دے رہے ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کو تعلیم اور انگریزی کے مسئلے سے دوچار نہیں ہونا پڑا جو کہ اکثر طلبہ کا مسئلہ رہتا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے پنجاب یونی ورسٹی سے ایف ایس سی اور بی ایس سی کیا تھا اور یہاں اس زمانے میں تعلیم کا معیار بہت اونچا تھا اس لیے ان کی انگریزی بھی بہترین تھی۔ تعلیم کے معاملے میں بھی وہ پیچھے نہیں تھے بلکہ ان کے پاس عملی تجربہ بھی تھا۔ مسئلہ صرف یہ ہوا کہ وہ گزشتہ تین سال سے ملازمت کر رہے تھے بے شک یہ بھی ایک قسم کی تعلیم تھی مگر عملی کام تھا اور اس کی نوعیت ملازمت جیسی تھی۔ اور اب ان کو یونی ورسٹی میں پڑھنا تھا جو ملازمت سے ایک قطعی مختلف کام تھا۔ دوسرے یہ کہ آدمی ایک بار تعلیم مکمل کر کے ملازمت کرے اور اس کے بعد پھر سے تعلیم شروع کرنا چاہے تو اسے دشواری پیش آسکتی ہے۔ یہ دشواری میاں عبدالمجید صاحب کو بھی پیش آئی تھی مگر اُنھوں نے اس پر قابو پا لیا۔

البتہ موسم کا مسئلہ رہا تھا۔ سورج شاذ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اکثر بارش اور کہر کا

سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہاں پر صنعتیں زیادہ تھیں اور ان کو چلانے کے لیے کوئلے کا استعمال ہوتا تھا اس لیے آلودگی بہت زیادہ تھی۔ اس وقت ایٹمی ری ایکٹرز زیادہ نہیں تھے اور برطانیہ کو بجلی پیدا کرنے اور گرمایش کے لیے کوئلے پر انحصار کرنا پڑتا تھا اس لیے آلودگی بہت زیادہ تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب کو صبح سویرے جلدی جانا پڑتا تھا اور شام کو دیر سے واپسی ہوتی تھی۔ اس لیے آتے وقت بھی اندھیرا ہوتا تھا اور جاتے وقت بھی۔ ان کی مالک مکان ایک بوڑھی اور بیوہ عورت تھی۔ اس کا شوہر دوسری جنگ عظیم میں مارا گیا تھا۔ خاتون بہت اچھی تھی اور اس نے میاں عبدالمجید صاحب کا پورا خیال رکھا لیکن ساتھ ہی اس نے کچھ اصول بنا رکھے تھے کہ میز پر کھانا کس طرح لگانا ہے اور کھانا کس طرح سرو کرنا ہے۔ کھانے کے بعد کیا کرنا ہے، بات کس طرح کرنی ہے اور اپنے کمرے سے بلاوجہ نہیں نکلنا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اُن کی ساری باتیں مان لی تھیں اس سے بھی اُنھوں نے سیکھا تھا۔

اکیلاپن بہت تھا۔ یونی ورسٹی میں پھر بھی دل بہلا رہتا تھا مگر گھر میں تنہائی کا احساس ہوتا۔ میاں عبدالمجید صاحب کو گھر والے بہت یاد آتے۔ پھر ان ہی دنوں پاکستان سے ایک نوجوان محمد ظفر اقبال آگئے۔ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ شاعر بھی تھے ان کے والد پنجاب یونی ورسٹی پوسٹ آفس میں تھے۔ برٹش کونسل والوں نے ظفر اقبال کو بھی ان خاتون کے گھر پے انگ گیسٹ رکھوادیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلطان صاحب آئے یہ پی ایچ ڈی کرنے آئے تھے اور یہ بھی اسی جگہ رکے۔ ان کے آنے سے میاں عبدالمجید صاحب کا اکیلاپن دور ہوا اور کالج سے آنے کے بعد اچھا وقت گزرنے لگا تھا۔

اُنھوں نے ایک بات نوٹ کی کہ ٹیکسٹائل مل کی تعلیم میں مقامی لوگ کم تھے اور بیرون ملک سے آنے والے طلبہ زیادہ تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ہاں یہ صنعت زوال پذیر تھی دراصل برطانیہ کے ہاتھ سے وہ ساری کالونیاں نکل گئی تھیں جہاں روئی پیدا ہوتی تھی اور وہ اسے برائے نام قیمت پر حاصل کرلیا کرتے تھے اور اپنے ملک میں کپڑا تیار کرکے اسے منہگے داموں ان کالونیوں میں فروخت کرتے تھے۔ اب یہ صورت حال نہیں تھی ان کو خام مال منہگے داموں خریدنا پڑ رہا تھا اور ان کے کپڑے کے خریدار نہیں رہے تھے اس لیے برطانیہ کی انڈسٹری جو ایک زمانے میں سب سے بڑی ٹیکسٹائل انڈسٹری تھی اب زوال کا شکار تھی۔ اس کے باوجود یہ برطانیہ کی حد تک سب سے بڑی صنعت ضرور تھی اور اس میں لاکھوں افراد کام کرتے تھے۔ تعلیم اور تربیت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ساری دنیا سے لوگ ٹیکسٹائل کی تعلیم اور تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ انڈیا میں ٹیکسٹائل انڈسٹری موجود تھی اور وہاں پر تعلیمی ادارے بھی تھے مگر اس کا بھارت کو نقصان ہوا اس کے طلبہ ٹیکسٹائل کی جدید تعلیم حاصل نہ کرسکے اور ان کے ہاں انڈسٹری جمود کا شکار ہوگئی۔

اس دوران میں میاں عبدالمجید صاحب کی جن پاکستانیوں سے میل ملاقات ہوئی تو یہ اس کے بعد بھی ساری عمر برقرار رہی بہت ساروں سے ان کی فیملی کی سطح پر تعلق رہا۔ وہاں جانے والے پاکستانیوں میں سے اکثر واپس نہیں آئے اور اُنھوں نے برطانیہ میں قیام کرلیا تھا۔ بعد میں جب میاں عبدالمجید صاحب جاتے تھے تو ان لوگوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی وہ پاکستان آتے تو ان سے ملا کرتے تھے۔ اب تو ان میں سے بیشتر انتقال کرچکے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ جو وقت گزارا وہ میاں عبدالمجید صاحب کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہا۔ اس زمانے میں ہر شعبے کے لیے الگ کلاسز نہیں ہوتی تھیں اگر الیکٹرک کی کلاس ہوتی تھی تو وہاں انجینئرنگ والے بھی

آ جاتے تھے اور فزکس کی کلاس ہوتی تھی تو اس میں کیمسٹری والے بھی آ جاتے تھے۔

جب میاں عبدالمجید صاحب کراچی سے برطانیہ آ رہے تھے تو میاں صاحب (والد) نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ ہفتے میں ایک بار خط ضرور لکھیں گے تو میاں عبدالمجید صاحب نے تین سال کے دوران یہ وعدہ نبھایا وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے۔ اس طرح پاکستان سے بھی ہفتے میں ایک بار خط آتا اکثر میاں عبدالرشید صاحب لکھتے تھے اور کبھی کبھی میاں امام الدی صاحب بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اس طرح وہ تین سال تک گھر سے دور رہنے کے باوجود بھی گھر سے جڑے رہے۔ اس زمانے میں فون عام نہیں تھا۔ برطانیہ میں تو یہ سہولت گھر گھر آ چکی تھی مگر پاکستان میں اس وقت کسی بہت خوش قسمت آدمی کے گھر ہی فون ہوتا تھا۔ اس لیے تین سال میں ایک بار بھی ان کی میاں امام الدین صاحب یا میاں عبدالرشید صاحب سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ ان خطوط میں حالات حاضرہ اور معمول کی باتیں ہوتی تھیں نہ تو عبدالرشید صاحب یا والد صاحب نے ان سے انکوائری کی یا ان سے کہا کہ وہ ایسا کریں اور ایسا نہ کریں اور نہ ہی میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی ان کو اپنے بارے میں صفائی پیش کی۔ باپ اور بھائی دونوں کو ان پر پورا اعتماد تھا اور وہ بھی خود کو جانتے تھے اس لیے تین سالہ تعلیمی قیام کے دوران اللہ کے فضل سے کسی برائی میں ملوث ہونا تو ایک طرف رہا، ان سے ایسی کوئی حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی جو ان کو خود اپنی نظر میں شرمندہ کر دیتی۔ شراب اور کباب سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ یونی ورسٹی میں بھی کبھی ایسی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی جہاں شراب موجود ہو۔ یونی ورسٹی میں طلبہ کی دو یونینز تھیں اور میاں عبدالمجید صاحب دونوں کے ممبر تھے تو یہ یونینز طلبہ کی تفریح کے لیے پارٹیاں کرتی تھیں اور ان پارٹیوں میں طلبہ ادائیگی کر کے شریک ہو سکتے۔ جس میں سوئمنگ پول ہوتا تھا کھانے پینے کا بندوبست ہوتا تھا، ڈانس

اور ہلا گلا کیا جاتا تھا' اس کے ساتھ ہی یونینز تفریح کے سنجیدہ کام بھی کرتی تھیں جیسے تقریروں اور کھیلوں کے مقابلے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے نوٹ کیا کہ انگریز مردوں میں شام کی تفریح کا رواج تھا یعنی مرد کام کاج سے فارغ ہو کر آتا اور پھر تیار ہو کر کسی شراب خانے میں چلا جاتا۔ اُس کو پب Pub کہتے ہیں۔ وہاں تین طبقے تھے نچلا طبقہ جس کے اپنے پب تھے۔ غریبانہ سے جہاں سستی اور گھٹیا شرابیں ملتی ہیں۔ دوسرے درمیانے طبقے کے لوگ تھے جو نسبتاً بہتر پب میں جاتے تھے جہاں درمیانے درجے کی شرابیں مہیا کی جاتی تھیں۔ ان میں ماحول بھی اچھا ہوتا تھا۔ سب سے اوپری طبقہ جس کے لیے کلب تھے یہاں دولت مندوں کے لیے تمام سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ وہاں کے معاشرے کا رواج تھا۔

بہ ظاہر ان کے اور ہمارے معاشرے میں بے پناہ تضاد تھا ان کی تفریح پینا پلانا اور عورتوں سے ملنا تھا اس کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ کوئی کھلے عام ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر ساتھ ہی وہ انسان بھی ہیں ان میں انسانوں والی خوبیاں اور خامیاں بھی ہیں۔ ان کو جاننے کے لیے ان کے قریب جانا ضروری تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب اکیلے یہ ہمت نہیں کر سکتے تھے اگرچہ اپنے کردار پر بھروسہ تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انسان غلطی کا پتلا ہوتا ہے اور اکیلے انسان پر شیطان بڑی آسانی سے حاوی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے کبھی ازخود کسی ایسی جگہ جانے کی کوشش نہیں کی جہاں آدمی کا نفس اسے للچائے۔

میاں عبدالرشید صاحب کے ایک کشمیری دوست تھے ظہیر الدین صاحب۔ یہ آزاد کشمیر حکومت کے سکریٹری رہے تھے جس زمانے میں وہاں جہاد شروع ہوا تھا تو میاں عبدالرشید صاحب بھی جہاد کے لیے وہاں گئے تھے۔ ان سے ملاقات رہی اور

خاصے عرصے ان کے ساتھ رہے۔ جب سہروردی صاحب وزیراعظم پاکستان تھے تو اس وقت لندن میں پاکستانی طلبہ کے لیے ایک ہاسٹل بنایا گیا تھا جو پاکستانی سفارت خانے کے قریب ہی تھا۔ وہاں پاکستانی طلبہ کو سستی رہائش فراہم کی جاتی تھی۔ برطانیہ میں زیر تعلیم طلبہ جب بھی لندن آتے تو اکثر یہاں قیام کرتے۔ اس کے علاوہ پاکستان سے آنے والے نئے طلبہ کا بھی یہاں مختصر قیام ہوتا تھا۔ 1956ء کے موسم سرما میں ظہیرالدین صاحب سے میاں عبدالمجید صاحب کی یہیں ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات اچانک اور خوش گوار تھی۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ کشمیر والوں کے لیے برطانیہ کی ویزا پالیسی نرم تھی۔ اور ہزاروں لاکھوں کشمیری وہاں آگئے تھے ان میں ایک ظہیر صاحب بھی تھے۔ وہ ملے اور بہت خوش ہوئے۔

"میاں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میاں عبدالمجید صاحب نے عرض کیا۔ "ٹیکسٹائل کی تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔"

"کچھ گھومے پھرے بھی ہو۔"

"خاص نہیں۔ ابھی تک تو پڑھائی سے فرصت نہیں ہے۔"

ایک روز اُنھوں نے کہا۔ "آؤ تمہیں ایک جگہ لیے چلتے ہیں۔"

"کہاں لے جائیں گے۔" میاں عبدالمجید صاحب نے پوچھا۔

"ایک جگہ ہے' کچھ موسیقی ہوگی اور ناچ ہوگا۔ میرے ساتھ ہوگے تو راہ بھٹکنے کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

"یعنی آپ سمجھتے ہیں میں بھٹک سکتا ہوں' پھر مجھے کیوں ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

''بس آدمی کو دنیا میں سب دیکھنا چاہیے۔''

میاں عبدالمجید صاحب کو لگا جیسے وہ اکیلے نہیں جانا چاہ رہے تو اُنھیں لے جا رہے تھے۔ وہ انھیں ایک میوزک شو میں لے گئے۔ وہاں خاصی دیر موسیقی سنتے رہے ان کو مغربی موسیقی سے شغف تھا۔ اس کے بعد ایک روز نائٹ کلب چلنے کو کہا۔ یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ وہ سیر و تفریح کے شوقین تھے۔ اس کے بعد وہ لندن چلے گئے' ان سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئے۔ بعد میں جب میاں عبدالمجید صاحب پاکستان آئے تو اتفاق سے ان کو پتا چلا ظہیر الدین صاحب سرگودھا میں کسی اچھے درجے کے اسکول میں پرنسپل ہیں۔ وہ سرگودھا ٹیکسٹائل مل کے میاں محمد اسلم صاحب سے ملنے ان کے دفتر میں گئے تو وہاں اُنھوں نے ایک تصویر دیکھی۔ شکار کھیلتے ہوئے ظہیر الدین میاں محمد اسلم کے ساتھ تھے۔

''یہ آپ کے ساتھ ہیں۔'' میاں عبدالمجید صاحب نے پوچھا۔

''ہاں آپ انھیں جانتے ہیں۔''

''جی یہ لندن میں میرے ساتھ تھے۔''

''آج کل یہ سرگودھا اسکول میں پرنسپل ہیں۔'' میاں محمد اسلم صاحب نے ان کو بتایا۔

ان کے ساتھ میاں عبدالمجید صاحب بہت گھومے پھرے تھے اور ان کو اعتراف تھا کہ ظہیر الدین صاحب نے ان کے کردار کو محفوظ رکھتے ہوئے انھیں لندن کے وہ گوشے دکھائے جو وہ از خود نہیں دیکھ سکتے تھے اور اگر وہاں جاتے تو ان کے بہک جانے کا خدشہ تھا۔ ان کے ساتھ مشہور زمانہ انڈیا آفس لائبریری بھی گئے۔ وہاں پاکستان اور انڈیا سے متعلق شاید ہی کوئی کتاب ہو جو وہاں نہ ہو۔ یہ بھی دیکھنے والی جگہ تھی۔

انگریز ہمارے حکمران تھے اور ہم پر سو سال سے زائد حکومت کر کے گئے تھے۔ ہمیں غلام بنانے کے لیے اُنھوں نے ظلم وستم سے کام لیا تھا۔قدرتی بات تھی کہ کوئی ان کو پسند نہیں کرتا تھا۔اس لیے جب میاں عبدالمجید صاحب انگلینڈ آئے تو ان کا تاثر انگریزوں کے بارے میں خراب تھا۔اُنھوں نے لاہور میں خاکساروں پر ہونے والے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ جنرل ڈائر کا نام برصغیر اور خاص طور سے پنجاب میں نفرت کی علامت تھااس زمانے میں یہ بھی دیکھا کہ لوگوں نے اپنے کتوں کا نام ڈائر رکھا تھا اگرچہ یہ اچھی حرکت نہیں تھی مگر لوگوں میں نفرت تھی۔

جب میاں عبدالمجید صاحب کا واسطہ اُن لوگوں سے پڑا تو انھیں احساس ہوا کہ ان میں بہت ساری خوبیاں بھی ہیں۔ اگرچہ خامیاں بھی تھیں' مجموعی طور پر وہ سچ بولنے والے اور جھوٹ سے نفرت کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے ہاں ملاوٹ' رشوت اور بے ایمانی محال تھی ۔ اپنے ملک اور معاشرے سے محبت کرتے تھے' مثبت اقدار پر یقین رکھتے تھے' صفائی ستھرائی اور پودوں سے عشق تھا۔ اگر کسی کے گھر میں جگہ نہیں تھی تو اس نے کھڑکی میں ہی چند گملے رکھ لیے تھے۔ دولت مند قوم ہونے کے باوجود بے حد کفایت شعار اور ہر شے کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ حد یہ کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں کو بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ اپنے گھر کے آس پاس صفائی رکھنا ہر شخص اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

برطانیہ کا تعلیمی نظام بہت اچھا تھا وہاں پر طلبہ کو تمام سہولیات مہیا کی جاتی تھیں اور اس کے بعد ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ پوری محنت سے پڑھیں۔ نظام کچھ اس قسم کا تھا کہ کمزور طالب علم اور خاص طور سے محنت سے جی چرانے والا چل ہی نہیں سکتا تھا۔ معیار کی چھلنی سے گزر کر صرف محنتی اور باصلاحیت طلبہ اوپر آتے تھے۔ وہاں طلبہ کے لیے لائبریری کی سہولت تھی جہاں ان کو تمام حوالہ جاتی کتابیں مل جاتی

تھیں اور لائبریریوں کی بھی کثرت تھی۔ ایک تو کالج کی لائبریری تھی اور یہ خاصی بڑی تھی اس میں تمام سہولتیں اور کتابیں دست یاب تھیں اگر اس سے تسلی نہ ہو تو یونی ورسٹی کی لائبریری تھی طلبہ وہاں چلے جاتے تھے۔ پھر مانچسٹر کی پبلک لائبریری تھی۔ طلبہ کے لیے وہاں جا کر پڑھنے کے سارے مواقع تھے۔ ان کو پرسکون ماحول مہیا کیا جاتا تھا اور وہاں پر کینٹین کی سہولت بھی تھی جہاں ارزاں نرخوں پر کھانا مہیا کیا جاتا تھا۔ چائے، کافی اور کولڈ ڈرنک کی سہولت بھی تھی۔ اس زمانے میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تو نہیں تھا مگر ٹی وی اور پروجیکٹر کی سہولت دی جاتی تھی۔ تاکہ طلبہ دوسری تعلیم سے بھی استفادہ کرسکیں یہی وجہ تھی کہ اکثر طلبہ گھر کے بجائے لائبریری میں جا کر پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب لائبریری میں پڑھتے تھے مگر ساتھ ہی گھر پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اتوار کے دن سارے ہفتے کے کام نمٹانے کے علاوہ وہ آنے والی کلاسوں کی بھی پیشگی تیاری کرتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے حساب لگایا کہ وہ ہفتے میں کوئی ستر سے پچھتر گھنٹے پڑھتے تھے۔ ان کو تعجب ہوا اتنا اُنھوں نے کبھی پاکستان میں نہیں پڑھا تھا۔ یہ دراصل نظام تعلیم کا فرق تھا۔ برطانیہ کا نظام تعلیم طلبہ کی مکمل توجہ چاہتا ہے اور جو طالب علم پوری توجہ نہیں دیتے ہیں وہ باہر ہو جاتے ہیں وہاں اسکول کے لیول سے طلبہ چن لینے کا رواج ہے۔ جو تعلیم میں بالکل گئے گزرے ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کالج میں داخلہ ملتا ہے اور نہ کسی فنی تربیت کے ادارے میں، یہ اسکول سے نکل کر محنت کرنے والے غیر فنی پیشوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد درمیانے درجے کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کو فنی کالجوں اور اداروں میں داخلہ ملتا ہے اور یہ تعلیم حاصل کر کے کارخانوں اور ملوں میں سپروائزر اور فورمین بن جاتے ہیں۔ سب سے اچھے طلبہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں جاتے ہیں۔ وہاں

پر ان کو اعلیٰ ترین فنی اور انتظامی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے اداروں، کارخانوں اور دفتروں کی باگ دوڑ سنبھالتے ہیں۔ تعلیمی نظام بنانے والوں اور اس کو چلانے والوں کا اندازہ کم ہی غلط نکلتا ہے۔ اس لیے اس سے نکلنے والے سارے طلبہ کھپ جاتے ہیں، پالیسی بنانے والے ساری صورت حال کا جائزہ لے کر تعلیمی اداروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کس کس شعبے میں کتنے طلبہ کو داخلہ دیں۔ اس سے ملک میں تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کی تعداد قابو میں رہتی ہے۔ جس شعبے میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہاں زیادہ طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے اور جہاں ضرورت کم ہوتی ہے وہاں کم طلبہ آتے ہیں مگر طلبہ کی کمی بیشی سے معیار تعلیم پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ وہاں تعلیم سب کے لیے اوریکساں ہے۔ ہر طالب علم کا ایک خاص استاد ہوتا ہے اور اسے تعلیمی لحاظ سے جو بھی مسئلہ درپیش ہو وہ اسے لے کر استاد کے پاس جاسکتا ہے۔

جب میاں عبدالمجید صاحب وہاں پہنچے تو ان کو بتایا گیا کہ دوران تعلیم برٹش کونسل کی جانب سے ان کو وظیفہ دیا جائے گا یہ نو دس پاؤنڈز کی رقم تھی۔ اگرچہ یہ کم نہیں تھی اس زمانے میں برٹش پاؤنڈ خاصی مالیت کا ہوتا تھا اور ان کا ہفتے بھر میں آرام سے گزارا ہو جاتا تھا۔ یہ رقم کھانے پینے اور کرائے وغیرہ کے لیے تھی۔ اس سے وہ مہینے میں ایک آدھ لباس بنا لیا کرتے۔ ضرورت کی دوسری چیزیں لے لیا کرتے تھے۔ تعلیم تو مکمل طور پر مفت تھی ہر شے کالج کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ جو طلبہ مکمل طور پر تعلیم حاصل کرنے پر توجہ دیتے وہ نوکری سے گریز کرتے تھے اور اس رقم سے گزارا کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے بھی نوکری کا نہیں سوچا تھا۔

دس مہینے تک پوری توجہ سے پڑھنے اور پہلے سال کا امتحان دینے کے بعد کالج

اور یونی ورسٹی میں دو مہینے کی چھٹیاں آئیں۔ وہاں کے طلبہ ان دو مہینے کی گرما کی چھٹیوں کو یوں استعمال کرتے کہ وہ مختلف کام کر کے پیسہ کما لیتے اور اپنے دوسرے اخراجات پورے کرتے تھے جن کو پیسے کے لیے ملازمت کی ضرورت نہیں تھی وہ تفریح کرتے اور سیر کرنے کے لیے نکل جاتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو دوسرے کاموں کے لیے الاؤنس مل رہا تھا اُنھوں نے سوچا کہ وہ ان دو مہینوں میں آگے کی تیاری کریں گے مگر ان کے ایک کالج فیلو نے مشورہ دیا۔

''تم کوئی کام کرو کچھ رقم ہاتھ آئے گی اور تم مختلف تجربات سے گزرو گے۔''

''ملازمت کہاں کروں؟''

مانچسٹر سے کچھ دور سمندر کے کنارے ایک اچھی تفریح گاہ تھی۔ جہاں برطانیہ اور یورپ سے لوگ تفریح کرنے آتے تھے۔ گرمیوں میں وہاں سیاحوں کی بھرمار ہو جاتی تھی۔ ہوٹل اور ریستوران خوب چلتے تھے اور اس وجہ سے وہاں کام کرنے والوں کی ضرورت پڑ جاتی تھی تو گرمیوں میں طلبہ وہاں کا رخ کرتے تھے اور دو مہینے تک کام کر کے رقم کما لیتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے بھی اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں کا رخ کیا۔ وہاں کالج اور یونی ورسٹی کے بے شمار طلبہ آئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی ایک ریستوران میں ملازمت مل گئی۔ یہ عارضی ملازمت تھی۔ ملازمین اپنا ناشتہ خود بناتے اور کھاتے تھے اس کے بعد ریستوران کا وقت شروع ہو جاتا تھا۔ لوگ ناشتے کے لیے آنے لگتے۔ ناشتے کا وقت دس بجے تک ہوتا تھا۔ اس کے بعد میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھی برتن سمیٹ کر ان کو دھوتے، کچن اور ڈائننگ روم کی صفائی کرتے۔ اس کے بعد بھی لنچ میں وقت ہوتا تو ان کو ایک دو گھنٹے کے لیے چھٹی مل جاتی تھی۔ اس دوران میں وہ جا کر سمندر کے کنارے تفریح کرتے یا تیراکی کر لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد لنچ کا وقت ہو جاتا۔ دوبارہ سے کھانا کھلانے اور

برتن اٹھانے کی ذمے داری شروع ہوجاتی۔ یہ کام کوئی تین گھنٹے تک جاری رہتا اس کے خاتمے پر ان کو اور دوسرے ملازمین کو پھر ایک گھنٹے کی چھٹی دی جاتی۔ ڈنر لوگ جلدی کرلیا کرتے تھے اس لیے ان کو بھی جلدی فراغت مل جاتی اور اس کے بعد کا وقت ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ان کو رہائش اور کھانا بھی ریستوران کی طرف سے مہیا کیا جاتا۔ اس طرح جتنی بھی تنخواہ ملتی وہ سب بچ جاتی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے جب وہ واپس آئے تو ان کے پاس بیس پاؤنڈز سے زیادہ رقم تھی۔ جو اس زمانے میں خاصی معقول رقم تھی۔

ابتدائی مشکل دور گزر جانے کے بعد ان کو ذرا فراغت ملی۔ پھر دو مہینے کی گرما کی چھٹیوں میں اُنھوں نے جو کام کیا اس سے ان کو برطانوی معاشرے کو سمجھنے کا موقع ملا اور اُنھوں نے اب تفریح کے لیے بھی جانا شروع کیا۔ ہفتے اور اتوار کو ڈانسنگ ہال چلے جاتے۔ اتوار کو پارکوں کی سیر کو یا سینما گھر چلے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں انگریزی فلموں کے ساتھ بھارتی اور پاکستانی فلمیں بھی چلا کرتی تھیں جو بھی اچھی فلم لگتی تھی اسے دیکھنے ضرور جاتے۔ تفریح سے پہلے اُنھوں نے وقت کو آرگنائز کرنا سیکھا کہ آپ نے دن کے چوبیس گھنٹے اور ہفتے کے سات دنوں میں وقت کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ پڑھائی کو کتنا وقت دینا ہے اور دوسرے کاموں کو کتنا وقت دینا ہے۔ ہر جگہ وقت پر جانا ہے کیونکہ وہاں سب وقت کے مطابق چلتے تھے جو شخص وقت کی پابندی نہیں کرتا تھا وہ پیچھے رہ جاتا تھا۔ اس لیے وقت آرگنائز کرنا بے حد ضروری تھا۔ پروگرام کرنے کے بعد اس پر عمل درآمد بھی کرنا تھا۔ کیونکہ ذرا سی غفلت سے ہر کام تاخیر کا شکار ہوجاتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اگلے سال ان کی میزبان بدل گئی۔ اب وہ ایک گھر میں دو پاکستانی طلبہ رفیق احمد صاحب اور سلطان صاحب کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کی

میزبان خاتون ایک گرلز اسکول کی ٹیچر تھیں اوران کے شوہر لائبریرین تھے۔ ایک دن اُنھوں نے رفیق احمد صاحب سے کہا کہ ان کے اسکول میں آکر طالبات کو پاکستان کے بارے میں بتائیں کیونکہ وہاں عام طور سے پاکستان اور ہندوستان کو ایک ہی ملک سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ دس برس پہلے وہ ہم پر حکمران تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مغربی دنیا میں پاکستان کے بارے میں کس قدر لاعلمی تھی۔ رفیق احمد صاحب گئے اور اُنھوں نے وہاں پر لڑکیوں کو پاکستان کے بارے میں بتایا کہ پاکستان کیوں کر بنا اور اس کے بنانے کے مقاصد اور وجوہات کیا تھیں۔ اسکول میں ایک ہیڈ اسٹوڈنٹ تھیں، مارگریٹ الزبتھ الیگزینڈر، وہ ڈاکٹر رفیق احمد کے لیکچر سے متاثر ہوئی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد خاتونِ خانہ جنھوں نے رفیق احمد صاحب کو لیکچر کے لیے بلایا تھا اُنھوں نے رفیق صاحب اور اسکول کی لڑکیوں کو اپنے گھر مدعو کیا ان لڑکیوں میں مارگریٹ بھی تھیں۔ یہیں پر عبدالمجید صاحب کی مارگریٹ سے اوّلین ملاقات ہوئی۔ یہ خاتون بعد میں ان کی بیوی بنیں۔ اور آج بھی ان کی رفیقۂ حیات ہیں۔

مگر شادی کا مرحلہ بعد میں آیا۔ اس وقت ملاقات سرسری نوعیت کی تھی۔ البتہ ان کے درمیان ملاقاتیں جاری رہی تھیں۔ ایک سال اُنھوں نے ریستوران میں کام کیا مگر اگلے سال جب گرما کی چھٹیاں آئیں تو اُنھوں نے اپنے ٹیوٹر سے کہا کہ وہ اس دوران میں کسی مل میں کام کرکے تجربہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ان کو ایک کمپنی کے ڈائریکٹر کے نام خط دے دیا اور میاں عبدالمجید صاحب وہاں چلے گئے۔ اتفاق سے اس مل میں نئی مشینری لگ رہی تھی وہی تھل والا کام تھا۔ مگر یہ جدید ترین مشینری تھی۔ ان کی خوش قسمتی کہ ان کو سیکھنے کا موقع ملا کہ ان مشینوں اور کارکنوں کے ساتھ کس طرح کام کرنا ہے۔ ان کالے آؤٹ کیا ہے، یہاں اُنھوں نے پہلی بار ٹیکسٹائل کو جدید انداز میں دیکھا۔ اگلے سال وہ پھر اس کارخانے میں آئے اور اس

دوران میں ان کا تین سالہ ڈگری کورس ختم ہو گیا تھا۔

اس وقت تک وہ مارگریٹ الزبتھ سے شادی کا فیصلہ کر چکے تھے اور ان کا ارادہ شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے جانے کا تھا۔ مارگریٹ کی یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا۔ انھیں مانچسٹر میں اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلے کے لیے وظیفہ ملا تھا۔ اُس زمانے میں دو سے تین فی صد طلبہ کو یونی ورسٹی کی سطح پر داخلہ دیا جاتا تھا ان کی زیادہ تر کفالت حکومت کرتی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے سوچا کہ ایک سال کے لیے ملازمت کر لیتے ہیں تو اُنھوں نے اُسی کارخانے سے رجوع کیا مگر اُنھوں نے نوکری دینے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے پاس گنجائش نہیں تھی اگر وہ ان کو ملازمت دیتے تو قانون کے مطابق تنخواہ اور دوسری سہولیات بھی دینا پڑتیں۔ وہ مشکل میں پڑ گئے‘ اُنھوں نے تجویز دی۔

''آپ مجھے نوکری نہ دیں ایسے ہی رکھ لیں۔''

وہ مان گئے۔ ''اچھا ہم آپ کو لیبر کے حساب سے رکھ لیتے ہیں۔''

تو اس شرط پر ان کو رکھ لیا گیا کہ وہ لیبر میں شمار ہوں گے اور اپنی ڈگری کے حساب سے تنخواہ نہیں مانگیں گے۔ تنخواہ مسئلہ نہیں تھی ان کو گزارے لائق رقم مل جاتی وہی کافی تھا۔ اگرچہ وہاں عام ورکرز کو بھی اچھی تنخواہ ملتی تھی اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ مانچسٹر میں رہتے تھے اور مل وہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی روز اتنی مسافت طے کرنا بہت مشکل تھا اور کام پر دیر سے جانے کی گنجایش نہیں تھی۔ تین بار دیر سے جانے پر چھٹی ہو جاتی تھی اور وہاں بس کے لیٹ ہونے کا سوال نہیں تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کچھ پاکستانی لڑکے مل کے نزدیک ایک شہر برنلے **(Burnley)** میں رہتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ میاں عبدالمجید صاحب تھل ٹیکسٹائل مل میں کام کر

چکے تھے۔ ان کے ساتھ پرانی شناسائی تھی ۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے بات کی، اُنھوں نے عبدالمجید صاحب کو مِل کے قریب برنلے میں جگہ دلوا دی۔ وہاں سے وہ دس منٹ میں مِل پہنچ جاتے تھے۔

رہنمائے تقدیر

اللہ کہتا ہے مجھ سے جیسا گمان کرو گے میں ویسا ہی پورا کر دوں گا۔ عبدالمجید صاحب کے دل میں بات تھی کہ اپنا کام کرنا ہے تو اللہ نے راستہ نکال دیا۔ میاں عبدالمجید صاحب برنلے کی جس ٹیکسٹائل مل میں کام کر رہے تھے وہ ایک مشہور گروپ Smith & Nephew کی تھی۔ NIVEA کا نام تو سب نے سنا ہے۔ یہ میڈیکل ٹیکسٹائل کے حوالے سے بڑی شہرت کی حامل تھی اب بھی اس کا نام ہے۔ ان کی اُس علاقے میں کئی ملز تھیں جس میں اسپننگ، ویونگ اور میڈیکل ٹیکسٹائل کی متعدد جدید پروڈکٹس تیار ہوتی تھیں۔ اگرچہ یہاں میاں عبدالمجید صاحب نے مزدوروں میں بھرتی ہونا قبول کیا تھا مگر ان کی محنت اور اَن تھک جدوجہد کو دیکھتے ہوئے چند ہی ہفتوں میں ان کا تبادلہ Research and development کے شعبے میں کر دیا گیا۔ جس کے لیے اس گروپ نے جدید ترین لیبارٹری قائم کر رکھی تھی۔ یہ ڈیپارٹمنٹ کوالٹی کنٹرول کو بھی دیکھتا تھا اور Productivity پر بھی نظر رکھتا تھا۔ وہاں پر کوالٹی اور Productivity کو لازم وملزوم گردانا جاتا ہے۔ اس طرح میاں عبدالمجید صاحب ڈگری کے بعد ماڈرن ماحول میں نت نئے طریقوں کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ قدرت اُن کو پاکستان ٹیکسٹائل میں نئی ٹیکنالوجی کو روشناس کرانے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

انٹرنیشنل ٹیکسٹائل مشینری کی نمائش جو ہر چار سال بعد ہوتی تھی اس مرتبہ 1959ء میں برسلز میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ نمائش دیکھ کر مانچسٹر آئے تھے۔ ویسے ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا ایک دفتر مانچسٹر میں بھی تھا۔

دعوت ان کے ایک مشترکہ دوست جناب بخت صاحب کے ریستوران میں ہوئی تھی۔ بخت مرحوم بنگالی تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اُنھوں نے اپنے پاس پاکستانی شہریت ہی رکھی وہ ایک سچے پاکستانی تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب کے اکثر قریبی دوست مانچسٹر میں ہی رہتے تھے۔ ویک اینڈ کی چھٹی ہوتی تو وہ وہاں آجاتے تھے ورنہ ایسا ہوتا تھا کہ اتوار کو ضرور مانچسٹر چلے جاتے تھے۔ وہاں سارا دن مانچسٹر میں دوستوں کے ساتھ گزرتا اس کے بعد پھر وہ اُسی دن واپس آجاتے۔ ان کا ایک دوست ابھی بھی مانچسٹر میں ہے، اس کا نام عبداللہ آزاد ہے آج کل بے چارے کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ اس وقت بہت قریبی دوست تھا اور وہاں پر ٹیکسٹائل کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ اس کا تعلق بوہری طبقے سے ہے۔ اس نے میاں عبدالمجید صاحب کو فون کیا کہ یار بات یہ ہے کہ کل میں نے ولیکا ٹیکسٹائل مل کے لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے ان میں کچھ ڈائریکٹرز بھی ہیں۔ ہفتہ کے روز تم میرے پاس آجانا۔ وہاں پر ہم لوگ ساتھ کھانا کھائیں گے اس کے بعد پھر مانچسٹر میں رہنا اور دوسرے دن واپس برنلے چلے جانا۔ ولیکا ٹیکسٹائل کے مالک سیف الدین ولیکا اور غالباً نورالدین ولیکا بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ اُن کے جاننے والے خالد حسین بھی ساتھ تھے۔

تعارف ہوا اس کے بعد بات چیت شروع ہوئی۔ میاں عبدالمجید صاحب کے پاس ٹیکسٹائل کے نئے آئیڈیاز تھے۔ باتوں کے دوران یہ نئے تصورات سامنے آنے لگے۔ ان کا مقصد اپنی بڑائی ظاہر کرنا نہیں تھا مگر بات ٹیکسٹائل پر ہو رہی تھی۔ یوں

اس موضوع پر سلسلۂ کلام چلتا رہا۔ یہ نئی چیزیں ہیں، یہ نئی ٹیسٹنگ ہے، اس طرح ہوتا ہے، ریسرچ یہ ہوتی ہے اور پروڈکٹ ڈیولپمنٹ اس طرح ہوتی ہے، اس طرح اپلائی کرو تو یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ بس بات سے بات نکلتی گئی۔ کھانا ختم ہوگیا اس کے بعد جب وہ جانے لگے تو خالد حسین صاحب نے ان سے کہا ''بھئی آپ کل مجھے آکر ملو۔''

میاں عبدالمجید صاحب نے پوچھا ''کس وقت؟''

وہ بولے ''۔ یہ سیٹھ لوگ ہیں یہ تو گیارہ بجے اٹھیں گے تو آپ خود گیارہ بجے کے قریب آؤ کھانا میرے ساتھ کھانا۔''

اب وہ دوسرے دن وہاں گئے۔ ان کو لگ رہا تھا کوئی خاص بات ہے تب ہی خالد صاحب نے بلایا ہے۔ خالد صاحب بخت صاحب کے ہوٹل میں تھے اُنھوں نے کہا'' یار وہ سیٹھ تو ابھی آئے نہیں۔ پتہ نہیں وہ کب آئیں۔ چلو ہم ذرا گھوم آئیں۔'' وہ پب پر چلے گئے۔ پب کا ایریا نزدیک ہی تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جو مانچسٹر میں ان کے کالج کے اردگرد تھا۔ اُنھوں نے جوس پیا اس دوران میں خالد صاحب مطلب کی بات پر آگئے۔ ''پاکستان آنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟''

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا'' ہاں بالکل ہے۔ میں ضرور پاکستان جاؤں گا۔ میں نے جو کرنا ہے اپنے ملک میں ہی کرنا ہے۔''

''تو کیا کرنا ہے، مل میں کام کرنا ہے یا کوئی اور کام کرنا ہے؟'' خالد صاحب نے پوچھا۔

اُنھوں نے کہا'' یار ابھی تک سوچا ہی نہیں ہے۔ ابھی تک تربیت ہورہی ہے۔''

وہ ان کی باتوں سے کچھ زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔ یورپ سے ہم نے بہت سی مشہور مشینری بنانے والوں کی ایجنسیاں لے لی ہیں۔ ''ہم نے ایک کمپنی شروع کی

ہوئی ہے۔ کمپنی میں ڈائریکٹر ہوں اور ایک میرے ساتھ وقار حسن صاحب ہیں، آپ ان کو جانتے ہوں گے“۔

وہ بولے۔”سنا تو ضرور ہے ملا نہیں ہوں“۔

اس وقت خالد حسین صاحب نے انگلینڈ سے ٹیکسٹائل میں ڈپلوما کیا ہوا تھا۔ ولیکا والوں کے ساتھ ہی آئے ہوئے تھے۔ ذرا ان کا تعارف بھی ہو جائے۔”یہ لاہور سے ہیں۔ ایم اے او کالج کے پرنسپل تھے دلاور حسین یہ ان کے عزیز ہیں۔ ان کے والد الطاف حسین ریلوے میں افسر تھے۔ ایک ہی بیٹا ہے، چار پانچ بہنیں ہیں۔ تعلیم میں تیز تھے اس لیے انگلینڈ پڑھنے آئے ہیں۔“ خالد حسین صاحب نے ان سے کہا۔”آپ واپس آ جاؤ تو میرے ساتھ ہی شامل ہو جاؤ۔ ہمارے سپلائرز کے پاس جا کر تربیت حاصل کرو“۔

میاں عبدالمجید صاحب نے پوچھا۔”تربیت کا انتظام کیسے ہوگا“

”اس کی آپ فکر مت کریں۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“ خالد صاحب نے کہا۔”میں نے کچھ اور انجینیئر لی ہیں تو میں چاہوں گا کہ آپ واپس آنے سے پہلے تھوڑا عرصہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں جہاں پر یہ مشینری مینوفیکچررز ہیں، ان کے ساتھ گزاریں، ٹریننگ لیں اور اس کے بعد آپ پھر آئیں۔ آپ کو ان کی مشینریز کا بھی پتا چل جائے گا اور ہمیں بھی تھوڑی آسانی ہوگی آگے بڑھنے کی۔ میں خود ٹریننگ کے لیے کسی کے پاس نہیں جا سکتا میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا” جی ٹھیک ہے۔ اگر آنے جانے کا انتظام ہو جائے تو میں جاؤں گا۔“

” میں واپس جاؤں گا تو وقار حسن سے بات کروں گا، ویسے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اسے پکی بات سمجھیں پھر بھی مجھے اس سے بات کرنی ہے میں وہاں

سے آپ کو خط لکھ دوں گا۔'' خالد صاحب بولے۔

وہ اپنے کام میں لگ گئے۔اس وقت ان کو خیال آیا کہ خالد صاحب زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں۔وہ معمول کے مطابق مانچسٹر آجاتے تھے وہاں پر دوستوں میں وقت گزارتے۔ تین مہینے کے بعد اچانک خالد صاحب کا خط آیا''میں آپ کواپاؤنٹمنٹ لیٹر بھیج رہاہوں اور ہم آپ کوسیلز انجینئر کے طور پر اپوائنٹ کرتے ہیں۔ ہم آپ کو چار یا پانچ سو روپے دیں گے اور کچھ الاؤنس بھی ہوگا کراچی سے باہر جائیں گے تو اس کا الگ سے ہوگا۔ آپ وزٹ کریں گے، ٹریننگ لیں گے اور وہاں ٹریننگ کے دوران آپ کے رہنے سہنے کا اور الاؤنس وغیرہ کا انتظام ہوجائے گا۔''

اب دیکھیں یہ قدرت کا انتظام تھا کچھ عرصے پہلے ان کو پتا نہیں تھا خالد صاحب کون ہیں۔ان کے دوست نے بلایا تھا کہ پاکستان سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں تم کھانے پر آجاؤ۔ ان کونہیں پتا تھا آنے والے ولیکا کے لوگ ہیں۔ پھر ان سے ملاقات طے ہوئی مگر وہ نہیں آئے۔ خالد صاحب ان کو اٹھا کر دوسری جگہ لے گئے۔ ولیکا والوں سے ملاقات نہیں ہوئی تو یہ راہ کھل گئی۔ان کا کنٹریکٹ تھا برٹش کونسل کے ساتھ، پاکستان گورنمنٹ کے ساتھ کہ وہ واپس آئیں گے اور فیصل آباد میں بننے والے ٹیکسٹائل کالج میں ملازمت کریں گے۔ اور وہ جو اساتذہ انگلینڈ سے وہاں پر آکر پڑھا رہے تھے ان کی جگہ لیں گے۔ یہ طے تھا اُنھوں نے واپس جانا تھا۔ اس وقت تک ان کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ فیصل آباد والا کالج بنا ہے کہ نہیں بنا، کس اسٹیج پر ہے۔ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ پاکستان جانا ہے۔اور وہاں کام کرنا ہے۔

ان کو ایک اور موقع مل رہا تھا کہ مشینری مینوفیکچررز کے پاس جاکر ٹریننگ لیں۔ان کو صرف دیکھنے کا ہی نہیں بلکہ یہ جاننے کا بھی موقع ملا کہ مشینیں کس طرح

بنتی اور کام کرتی ہیں۔ اس وقت برطانیہ کے پاس جدید مشینیں تھیں مگر یورپ کے دوسرے ممالک اس سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ ابھی مارگریٹ کی گریجویشن میں دو تین مہینے باقی تھے۔ اس وقت وہ ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ اُنھوں نے لیٹر کی کاپی کے ساتھ مشینری مینوفیکچررز کو خط لکھا اور اپنی ملازمت کے بارے میں بتایا۔اور اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کو پروگرام بھیجنے شروع کیے کہ آپ ان دنوں میں وہاں آجائیں ہم آپ کو کرایہ دیں گے اور اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔

کالج میں اُنھوں نے ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی ڈگری لی تھی۔ اب ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی بات ہورہی تھی۔ ان کو مشینوں کا کورس کرایا جارہا تھا، ان کے لیے یہ نئی چیز تھی۔ ان کی بنیاد بن رہی تھی۔ یہ ان کی پہلی ملازمت مختلف نوعیت کی تھی اور اس کے لیے وہ سیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے جو پڑھا تھا اس کو ریفریش کر رہے تھے۔ جب وہ اسٹوڈنٹ تھے اُنھوں نے لیبارٹری میں کام ضرور کیا تھا لیکن وہ دوسری نوعیت کا تھا۔ ہالینڈ میں ان کا پہلا دورہ این شیڈے کا تھا۔ یہ ہالینڈ کا ایک بہت بڑا ٹیکسٹائل کا مرکز تھا۔مگر ان کو اس سے بھی آگے بہت دور جانا تھا۔ اس وقت تک اُنھوں نے انگلینڈ سے نکل کر یورپ کے کسی اور ملک کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ چار سال سے تھے اور ان کے ساتھ آنے والے بعض لوگ پورا یورپ ہی دیکھ چکے تھے۔ کمپنی نے میاں عبدالمجید صاحب کو خط بھیجا، کہ ہالینڈ میں آپ نے این شیڈے جانا ہے۔ اس تاریخ کو آپ نے پہنچنا ہے اور آپ کو فلاں ہوٹل میں رکنا ہوگا۔ یہ بڑا شاندار ہوٹل تھا۔ان کو پتا نہیں تھا کہ کمپنی ان کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ دے گی۔ایک طالب علم کے طور پر وہ کسی ایسے ہوٹل میں نہیں رکے تھے۔ وہاں کا کھانا بھی شاندار تھا۔صبح بریک فاسٹ ہی کئی قسم کے ہوتے تھے۔ آدمی کو کبھی قدرت غیر متوقع انعام دیتی ہے تو یہ ان کے لیے ایسا ہی انعام تھا وہ مزے سمیٹتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کیا موقع

دے رہا ہے کس طرح ان کو عزت مل رہی ہے۔ ہوٹل سے کمپنی والوں نے انھیں دوسرے دن لے لیا۔اور اپنی فیکٹری میں لے گئے وہاں دو ہفتے کی ٹریننگ دی۔ وہ فنشنگ مشینیں بناتے تھے کہ کپڑے کو کس طرح Finish کیا جاتا ہے اور مشینوں کی ٹیکنالوجی کیا ہے، ڈرائی کس طرح کرتے ہیں کپڑے کو رنگ کس طرح کرتے ہیں، اس کی ٹیکنالوجی کیا ہوتی ہے، مشینری کس قسم کی ہونی چاہیے۔ یونی ورسٹی میں یہ معلوم نہیں ہوتا، پریکٹیکل میں یہ چیزیں طلبہ کو بعد میں ملتی ہیں۔تو دو ہفتے وہاں پر رہے۔ اس دوران میں اتوار کے دن وہ ایمسٹرڈم دیکھنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ یہ بڑا خوب صورت شہر تھا۔ زندگی میں بہت کم اتنی خوبصورت جگہیں دیکھی تھیں۔یہ شہر پانی سے نیچے آباد ہے۔ہالینڈ کی اکثر زمین سمندر سے نیچے ہے۔اور اس میں کئی بلڈنگز ہیں جو پانی میں کھڑی ہوئی ہیں۔ اس وقت ان کو ہالینڈ دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ بعد میں وہ کئی بار گئے مگر پھر بھی اس ملک کو تفصیل سے نہیں دیکھ سکے۔ زیادہ تر وہ شہروں سے ہو کر آ گئے تھے جب تک ان کی ٹریننگ مکمل ہوئی وہاں کا معاشرہ دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ٹیکسٹائل ان کی سب سے بڑی انڈسٹری تھی۔کیوں کہ اس وقت ان کے پاس انڈونیشیا کی بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ انڈونیشیا نے ہالینڈ سے آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن ابھی بھی انڈونیشیا کی مارکیٹ ان کے قبضے میں تھی اور کپڑے کی سپلائی وغیرہ ہالینڈ سے ہوتی تھی۔انڈونیشیا بہت بڑی مارکیٹ تھی اب بھی ہے کوئی پندرہ کروڑ کی آبادی تھی۔ جس طرح انگریز کے پاس برصغیر اور دوسری اپنی کالونیاں تھیں۔جن کو وہ بعد میں فروخت کرتے رہے اسی طرح ہالینڈ والے زیادہ تر کپڑا انڈونیشیا کو سپلائی کرتے تھے۔ بعد میں ان کی انڈسٹری بھی ختم ہوگئی۔ کیونکہ انڈونیشیا نے اپنی ٹیکسٹائل انڈسٹری شروع کردی۔ انڈونیشیا میں سادہ کپڑا اچھا بننا شروع ہو گیا تھا۔ جس طرح پنجاب میں بنتا ہے۔اسی طرح جب پاکستان اور انڈیا نے کپڑے کی صنعت

میں ترقی کی تو انگلینڈ کی صنعتیں بند ہو گئیں۔استعمار نے لوٹا بہت تھا مگر اب اس کا وقت گزر چکا تھا

ٹیکسٹائل کے علاوہ سائیکلیں بھی ہالینڈ میں بڑی تعداد میں بنتی تھیں۔ اس وقت کاریں بہت کم ہوتی تھیں، میاں عبدالمجید صاحب نے برطانیہ میں دیکھا وہاں تین سالوں میں کاروں کا رواج بہت بڑھ گیا تھا۔اس کے مقابلے میں ہالینڈ میں ہر آدمی سائیکل استعمال کرتا تھا۔آج بھی یہی رواج ہے سائیکل ہالینڈ کی قومی سواری ہے۔چھوٹا سا ملک ہے کام اور رہائش کی جگہوں میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔اس لیے لوگ سائیکل استعمال کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے اس سے ان کو دو فائدے ہیں ایک تو ان کی ورزش ہو جاتی ہے، دوسرے ان کا ملک آلودگی سے پاک رہتا ہے وہاں سڑکوں پر گاڑیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ جیسے ہی لنچ بریک ہوتا سڑک سائیکلوں سے بھر جاتی تھی۔ شاذ و نادر ہی کوئی آدمی پیدل چل رہا ہوتا۔اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہالینڈ میں زمین کم ہے شہروں میں راستے تنگ ہیں اس وجہ سے گاڑیاں کم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہالینڈ کی ایک اور خاص چیز وہاں کی ہوائی چکیاں ہیں۔یہ بہت مشہور ہیں۔اصل میں اس ملک کی سطح زمین سمندر سے نیچے ہے۔اور سمندر کا پانی دور کرنے کے لیے یہ دیوار بنا کر اندر رہ جانے والا پانی ہوائی چکی کی مدد سے دور پھینک دیتے تھے۔رفتہ رفتہ اُنھوں نے سمندر سے بہت ساری زمین حاصل کر لی۔آج ہالینڈ کی بیشتر زمین سمندر سے حاصل کی ہوئی ہے۔تو یہ عبدالمجید صاحب کا ہالینڈ کا سفر تھا۔

خالد حسین صاحب کی طرف سے ہدایت آ گئی کہ اب ان کو بلجیم جانا تھا۔ بلجیم میں ایک کمپنی تھی۔اس کا نام GILBOS تھا۔یہ ٹیکسٹائل مل کے لیے کون وائنڈر بناتے تھے۔ اس کی ایجنسی خالد صاحب نے لی تھی۔ اگرچہ وہ صرف ایک چھوٹی سی

مشین بناتے تھے۔ مگر اس مشین کے لیے ایک بڑی فیکٹری بنا رکھی تھی۔ اُنھوں نے میاں صاحب کے لیے ہوٹل میں انتظام کردیا۔ یہ ان کا فیملی بزنس تھا اور بڑی اچھی فیملی تھی۔ بڑی عزت سے پیش آئے تھے۔ کمپنی کے مالک اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر یہ فیکٹری چلاتے تھے۔ان کے ساتھ خاندان کے اور لوگ بھی تھے۔ بڑے سادہ لوگ تھے اور ان کے بچے پیارے تھے۔ رہنے سہنے کا طریقہ بہت اچھا تھا اُنھوں نے نئی نئی فیکٹری شروع کی تھی تو ان سے بھی میاں عبدالمجید صاحب نے بہت کچھ سیکھا۔ نئی ٹیکنالوجی تھی۔ یہ کون وائنڈنگ کی ٹیکنالوجی کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، یہ مشین کیوں بنتی ہے، یہ کس طرح بنتی ہے، اس میں کیا کیا چیز بن سکتی ہے، کیا نہیں بن سکتا۔ اس کو اسٹارٹ کرنے کے لیے کس طرح اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ دیکھ بھال کس طرح کرنی چاہیے، وہ ان کو یہ ساری چیزیں بتاتے رہے۔ یہاں بھی وہ تقریباً دو ہفتے رہے۔ ہالینڈ اور بلجیم میں ایک چیز جو مشترک ہے وہ یہ کہ کھانا بہت اچھا بناتے ہیں کیونکہ ہالینڈ میں گائے کا گوشت بہت ہوتا ہے۔ ہالینڈ زرعی ملک ہے اور بلجیم کے فرائیڈ چپس بہت مشہور ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے آپ وہاں جائیں تو تفریح کے لیے میوزک بج رہا ہوتا تھا۔ ان میں ایک اصول تھا کہ آپ کھانا کھاتے ہیں جب تک آپ وہاں سے اٹھ کر نہیں جاتے وہ میوزک بجاتا رہے گا۔ میاں عبدالمجید صاحب اپنے جاننے والوں کے ساتھ مذاقاً وہاں بیٹھے رہتے شغل میلے کے لیے۔ بلجیم کے لوگ مقامی زبان بولتے تھے۔ جب کہ ایک طبقہ فرنچ بولنے والوں کا تھا۔ بلجیم والوں اور ان کی آپس میں مخالفت چلتی تھی زبان کی وجہ سے مگر کبھی فساد کی نوبت نہیں آئی۔ وہاں پر بڑی تاریخی جگہیں تھیں وہ بھی دیکھیں۔ اپنا تربیت کا کام الگ کرتے رہے۔ اور ساتھ ہی تفریح بھی کرتے رہے۔ وہاں پر ان کا بہت اچھا وقت گزرا۔ کراچی سے جو پروگرام آیا تھا اُس میں چار اور

کمپنیوں کا دورہ (Visit) کرنے کو کہا گیا تھا۔ اِن میں ایک جرمنی دوسری دو سوئٹزرلینڈ اور ایک آسٹریا میں تھی۔ اُس کے ساتھ میاں عبدالمجید صاحب کو شادی اور واپسی کا پروگرام بھی طے کرنا تھا۔

اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ دو بڑی کمپنیاں جن میں سے ایک جرمنی میں تھی اور دوسری (زیورچ) کے نزدیک تھی، شادی سے پہلے ٹریننگ ختم کر لی جائے اور باقی دو کو پاکستان کے سفر کے دوران پروگرام میں شامل کیا جائے۔ اس حساب سے بلجیم سے جرمنی جانا تھا۔ وہاں کی کمپنی کا نام Dornier تھا۔ یہ کمپنی دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی ایئرفورس کے لیے جہاز بناتی تھی۔ جرمنی کی شکست کے بعد ان کو جہاز بنانے کی صنعت بند کرنی پڑی۔ کیونکہ اُن کے پاس بہت بڑی ورکشاپ تھی اس لیے ان کو ٹیکسٹائل مشینری بنانے کی اجازت ملی۔

انجینئرنگ کی صنعت کا یہ خوبصورت پہلو ہے کہ وہی مشینیں مختلف صنعتوں کی مشینیں بنانے میں استعمال ہو سکتی تھیں۔ Doriner کمپنی ایک انتہائی خوبصورت جگہ Lindau میں ہے جو کہ جھیل Lidau پر واقع ہے۔ اس بڑی جھیل کے ایک کونے پر آسٹریا اور دوسرے کونے پر سوئٹزرلینڈ واقع ہے۔ اس شہر میں سیاح بہت آتے ہیں۔ یہ کمپنی ٹیکسٹائل کی صنعت کے لیے کپڑا Finish کرنے کی مشینیں اور کپڑا بننے کی مشینیں بناتی ہے۔ یہاں پر میاں عبدالمجید صاحب کا قیام تقریباً ایک ماہ کا تھا۔ اس کمپنی میں باہر کے اور مقامی لوگ تربیت حاصل کر رہے تھے جن میں ہندوستانی بھی تھے۔

انجینئرنگ کی نئی ایجادات پر کام ہو رہا تھا۔ یہاں میاں عبدالمجید صاحب کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اُس کے علاوہ اس خوبصورت چھوٹے سے شہر میں رہتے ہوئے جرمن قوم کو نزدیک سے دیکھا۔ خاص طور پر ایک مفتوح قوم کہ کس طرح وہ

اپنے مستقبل کے لیے کام کر رہی ہے اور اس میں انجینئرنگ انڈسٹری کا کیا مقام ہے۔ وہیں پر میاں عبدالمجید صاحب نے اپنی فوکس ویگن خریدی جس پر پاکستان تک سفر کرنا تھا۔ یہاں بھی ان کو ایک جرمن گھر میں بطور Paying Guest ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ ایک اُستاد کا گھر تھا۔ اس طرح جرمن تعلیم، نصاب اور تربیت سے واقفیت ہونے سے برٹش سسٹم اور جرمن سسٹم کے موازنے کا موقع ملا۔

اس جگہ کی خوش گوار یادیں اور وہاں سے جو علم حاصل کیا جو نصابی بھی تھا اور عملی بھی۔ یہاں پر رہ کر میاں عبدالمجید صاحب نے جرمن زبان پر بھی کچھ عبور حاصل کیا۔ مانچسٹر کی ڈگری میں جرمن زبان کا ایک پرچہ تھا مگر اُنھوں نے جرمنی میں رہ کر جرمن زبان بولنی سیکھی۔ یہ تجربہ پاکستان میں آکر بہت کام آیا۔ جرمنی کی ٹریننگ ختم کرنے کے بعد اپنی کار پر زیورچ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر لمبا نہیں تھا لیکن سوئٹزرلینڈ کی خوبصورتی نے پہلے تمام سفروں کو مات کر دیا۔

یہاں کمپنی کا نام SHARER تھا جو مالک کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان کی فیکٹری زیورچ سے چند کلومیٹر پر ایک چھوٹی جگہ Erlen Beach جھیل کے کنارے پر واقع تھی۔

Sharer صاحب سوئس پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ ان کو گھوڑ سواری، کشتی رانی اور تیراکی کا بہت شوق تھا۔ ان کا گھر بھی جھیل کے کنارے پر تھا۔ خوبصورت ماحول اور جھیل کے دوسری طرف پہاڑی سلسلہ جنت نظیر سے کم نہیں۔

اس کمپنی نے ایک نئ مشین بنائی تھی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہاں پر بھی سوئس انجینئرنگ، ان کی باریک بینی اور اپنی مشینوں کی سروس کا سسٹم انتہائی قابل دید تھا۔ جناب Sharer صاحب مشینوں کو اپنی اولاد گردانتے تھے اور ہر سال دو سال میں اپنے صارفین کے لیے یہاں دورہ کرتے تھے اور خود اپنی مشینوں

پر جاکر ان کی حالت کا جائزہ لیتے اور مشین پر کام کرنے والوں کو انعام دیتے جو معمولی نوعیت کا ہوتا مگر وہ ان لوگوں کو ملتا جنھوں نے ان کی مشینوں کو اچھی حالت میں رکھا ہو۔

یہ بھی اپنی مشینوں کو مارکیٹ کرنے کا ایک گُر ہے اور خاصا کامیاب۔ یہاں پر دو ہفتے قیام کے بعد میاں عبدالمجید صاحب نے گاڑی وہیں چھوڑ دی اور مانچسٹر کا رُخ کیا تاکہ شادی اور وطن واپسی کا انتظام کریں۔

نئی منزل، نئے راستے

1959ء میں جب میاں عبدالمجید صاحب نے اپنا گریجویشن مکمل کیا تو اس وقت تک ان کو یقین ہوگیا تھا کہ مارگریٹ کے ساتھ ان کا نباہ اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ ان میں ذہنی ہم آہنگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔ حالات اور بین الاقوامی واقعات کو وہ ایک نظر سے دیکھتے۔ جب اُنھوں نے شادی کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہ وہ شادی کر کے ایک ساتھ ہی پاکستان جائیں گے تو ابھی مارگریٹ کی تعلیم مکمل ہونے میں ایک سال باقی تھا۔ اس لیے میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے کہا ''میں ایک سال یہاں پر رکوں گا۔ اس کے بعد ہم اکٹھے شادی کر کے واپس پاکستان چلے جائیں گے''۔

مارگریٹ خوش ہوگئیں کیوں کہ وہ بھی یہی چاہتی تھیں شاید ان کے دل میں ڈر تھا کہ میاں صاحب ان سے دور نہ ہو جائیں۔ مگر قدرت تو میاں صاحب کو آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہی تھی۔ ابھی ان کے پاس ایک سال تھا تو اُنھوں نے سوچا کہ اس دوران میں کوئی جاب کر لیں۔ یہ تو اُنھوں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس ایک سال میں وہ اتنا سیکھ جائیں گے جو دوسرے دس سال میں بھی نہیں سیکھ پاتے ہیں۔ اور یہ تربیت اور تجربہ ساری عمر اُن کے کام آیا۔ اس دوران میں اُنھوں نے کئی ممالک میں کام کیا۔

وہ ایک پاکستانی کمپنی کے ساتھ ہو گئے تھے جو ٹیکسٹائل مشینری کی ایجنسیاں لیتی تھی۔ وہ مشینری ساز اداروں میں جا کر ان کی مشینیں انسٹال کرنے کی تربیت لے رہے تھے۔ یہ مشین ساز ادارے پورے مغربی یورپ میں بکھرے تھے اس لیے ان کو جگہ جگہ جانا پڑتا تھا۔ پھر ایک سال گزر گیا اور ان کی ہونے والی بیوی نے گریجویشن کر لی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے کہا" اب تاریخ مقرر کرنی چاہیے کہ کس طرح شادی کرنی ہے اور اس کے بعد واپسی کا سفر کرنا ہے۔" اُنھوں نے مل کر تاریخ مقرر کر دی۔ جب وہ پاکستان آئے اور یہاں پر اے ایچ ایس اینڈ کمپنی میں کام شروع کیا تو یہ کار ان کے بہت کام آئی۔ کیوں کہ ان کو پورے پاکستان میں گھومنا پڑتا تھا۔ اگر ان کے پاس یہ کار نہ ہوتی تو ان کو اپنا کام کرنے میں بہت مشکل ہوتی یہ بھی قدرت کی جانب سے ان کے کامیاب مستقبل کے لیے ایک مدد تھی۔

کار چھوڑتے ہوئے اُنھوں نے سوچا تھا کہ شادی کرنے کے بعد دیکھیں گے کہ کس طرح اُنھیں واپس جانا ہے۔ جب وہ انگلینڈ واپس آئے تو جو پیسے تھے وہ تو سارے اُنھوں نے خرچ کر دیے تھے۔ گاڑی خرید لی تھی۔ برٹش کونسل کا جو اسکالر شپ تھا۔ اس کے تحت ان کو واپسی پر ایک ٹکٹ کے پیسے ملنا تھے۔ ایک ٹکٹ کے پیسوں میں دو آدمی کیسے جا سکتے تھے، وہ مشکل میں پڑ گئے۔ اب ان کے پاس ایک ہی حل تھا اُنھوں نے بیوی سے کہا۔" چلو گاڑی کے اوپر ہی ہم پاکستان چلتے ہیں۔"

وہ بھی راضی ہو گئیں۔ پھر مانچسٹر کے ایک ہال میں شادی ہوئی اسی دن اُنھوں نے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی شادی میں وہاں جتنے بھی دوست تھے وہ سب شریک ہوئے۔ بیوی کے سارے خاندان والے تھے، سب لوگوں نے انھیں بہت اچھی طرح پذیرائی دی۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالاں کہ اس زمانے میں کسی انگریز خاتون کا کسی غیر ملکی اور خاص طور سے کسی ایشیائی سے شادی کرنا بہت معیوب

سمجھا جاتا تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے والد صاحب کو خط لکھ کر باقاعدہ اجازت طلب کی۔ اُنھوں نے اجازت تو دے دی، مگر ظاہر ہے کہ اُنھیں پریشانی تو ہوئی تھی۔ کیونکہ جب وہ بعد میں واپس پاکستان آئے تو میاں عبدالرشید صاحب نے ان کو بتایا کہ والد صاحب بہت پریشان تھے اور وہ بھی۔ کیوں کہ سب کا خیال تھا کہ وہ شادی کرکے آئیں گے تو پھر واپس چلے جائیں گے۔ یہ ان کے لیے بڑی دُکھ کی بات تھی۔ مگر خطوط میں اُنھوں نے یہی لکھا کہ یہ فیصلہ آپ کا ہے، آپ ضرور شادی کریں ہم ہمیشہ آپ کی مدد کرتے رہیں گے۔ اس سے انھیں بڑی مدد ملی کیونکہ جس ماحول میں وہ پلے بڑے اس میں شادی ہمیشہ ماں باپ کی مرضی سے ہوتی تھی۔

ایک ہال میں شادی ہوئی۔ ان کی بیوی کے پاسپورٹ پر ان کا نام تبدیل ہونا تھا کیونکہ اُن کا پہلا پاسپورٹ تو پرانے نام سے تھا اور جب شادی ہوجاتی ہے تب بیوی کا نام بدل کر شوہر کے سرنیم پر آ جاتا ہے۔ اس لیے پاسپورٹ بدل دیا گیا۔ اُس کے لیے وہ قریبی کلیسا میں گئے جہاں شادی رجسٹر ہوئی۔ اُنھوں نے وہیں پر پاسپورٹ دے دیا۔ شادی سے پہلے بیوی کا نام مارگریٹ ایلزبتھ الیگزینڈر تھا۔ شادی کے بعد پاسپورٹ پر مارگریٹ الزبتھ مجید لکھا گیا۔ مانچسٹر سے وہ اسی دن روانہ ہو گئے۔ لندن میں وہ دو دن رکے تھے۔ کیوں کہ برٹش کونسل کا دفتر لندن میں تھا اور اُن سے رہنمائی لینی تھی کہ واپس کس طرح جائیں گے۔ ان کی مالی حالت کا جان کر برٹش کونسل والوں نے ان کے لیے واپسی کا پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ وہ عراق تک گاڑی میں جائیں گے، پھر بصرہ سے بحری جہاز میں گاڑی سمیت سوار ہو کر کراچی پہنچیں گے۔ اُن کا بنایا پروگرام کچھ اس طرح سے تھا کہ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کے لیے جو فنڈز مختص کیے ہوئے تھے اس میں وہ پورا ہوجاتا یورپ سے وہ سڑک کے راستے بصرہ تک جاتے۔ بصرہ سے پاکستان تک بحری جہاز کا سفر

تھا۔ یہ اُس فنڈ میں کور ہو جاتا۔ اُنھوں نے میاں صاحب کو ٹکٹ کے پیسے دے دیے۔ لندن سے اُنھوں نے چینل کے ذریعے فیری میں پیرس تک سفر کیا۔ پیرس سے ٹرین لے کر وہ سوئٹزرلینڈ گئے جہاں پر ان کی گاڑی کھڑی تھی۔

سوئٹزرلینڈ سے گھومتے ہوئے وہ آسٹریا پہنچے۔ آسٹریا کا جو مشین مینوفیکچرر تھا اس کے پاس جانے سے وہ گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ مگر اب وہ سڑک کے راستے جا رہے تھے اس لیے اُن کے پاس ٹھہر گئے وہاں تین چار دن رکے۔ آسٹریا سے وہ یوگوسلاویہ گئے، اور وہاں سے یونان آئے۔ یونان سے وہ ترکی آ گئے۔ اور ترکی سے دمشق پہنچ گئے۔ اُس وقت شام اور عراق کی سرحد بند تھی۔ اس لیے دمشق میں گھومتے پھرتے رہے۔ پاکستانی سفارت خانے بھی گئے، اُنھوں نے بڑی خاطر تواضع کی۔ وہاں پر جتنی بھی اچھی جگہیں تھیں وہ دیکھیں کیونکہ شام تاریخ کے لحاظ سے زرخیز ملک ہے۔ وہاں سارے مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ وہاں بہت پرانے چرچ اور پرانی مساجد ہیں۔ بڑے مدرسے اور درس گاہیں ہیں۔ وہ کوششیں کرتے رہے کہ انھیں ویزا مل جائے۔ عراق کے ویزے کے لیے تو پرابلم نہیں تھی، ویزا تو ان کے پاس تھا۔ مگر امیگریشن والوں نے کہا۔ ”آپ گاڑی نہیں لے جاسکتے، گاڑی کی رجسٹریشن نہیں ہے، آپ خود جاسکتے ہیں“۔

اب وہ گاڑی تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ عراق نہیں جائیں گے۔ گاڑی پر ہی پاکستان جائیں گے۔ اس کے لیے ان کو پھر سے واپس ترکی آنا پڑا۔ ترکی سے ایران میں داخل ہوئے۔ اب ان کے پاس ایران کا ویزا نہیں تھا۔ تو ترکی میں ان کے قونصل جنرل سے رجوع کیا اور ویزا لیا۔ اس کے بعد ترکی میں سمندر کے اُس طرف ایشیا کی سرحد عبور کر کے ایران میں داخل ہوئے۔ ایران سے ہوتے ہوئے کوئٹہ روانہ ہوئے۔ اب تک کا سفر بہت سہل رہا

تھا۔اصل میں برٹش کونسل نے اُنھیں مکمل شیڈول بنا کر دیا تھا، شیڈول میں تھا کہ کس طریقے سے آپ نے کہاں پر جانا ہے، کس ادارے سے سروس لینی ہے، کہاں آپ کو ہوٹل ملے گا اور کون کون سی جگہ پر آپ کو کس قسم کے ہوٹل ملیں گے۔ جتنی بھی ان کے پاس رقم تھی اُس کے حساب سے گائیڈ لائن بھی تھی۔ صرف ایران سے آگے کا کوئی شیڈول نہیں تھا۔ان کے پاس ایک کیمرہ تھا تو وہ تصویریں بھی لیتے رہے۔

جب وہ شام سے ترکی کی حدود میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک چوکی تھی۔ چوکی میں پاسپورٹ کا تو مسئلہ نہیں تھا لیکن گاڑی کے اوپر ان کو کچھ رقم دینا تھی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ان کو پتا چلا کہ ان کے پاس تو مقامی کرنسی نہیں ہے۔ وہ ابھی یہاں پہنچے تھے انھوں نے سوچا تھا کہ جہاں پر جا کر ٹھہریں گے وہاں اپنے پیسے تبدیل کرا لیں گے، ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ ان کو کسٹم بھی دینا پڑ سکتا ہے۔ اُنھوں نے چوکی کے افسر سے کہا ان کے پاس مقامی کرنسی نہیں ہے۔ ان کے پاس پاؤنڈز ہیں۔ ان کو تبدیل کرایا جا سکتا ہے۔ جب اُنھوں نے تبدیل کرانے کی بات کی۔ تو اس نے کہا ”یہاں کرنسی تبدیل نہیں ہوتی۔“

اُنھوں نے کہا ”اب میں کہاں جا کر تبدیل کراؤں۔“

افسر نے بتایا۔ ”یہاں سے چار، پانچ میل دُور جگہ ہے وہاں پر بینک مل جائے گا“۔

میاں عبدالمجید صاحب بولے ”اب میں کیسے جاؤں ؟ ،گاڑی تو آپ لے جانے نہیں دیں گے۔“

وہ مسکرایا، اس نے اپنی جیب سے پیسے دے دیے اور انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے کہا ”وہاں جا کر آپ کرنسی تبدیل کر لینا اور میرے پیسے پھر مجھے واپس دے دینا“۔

وہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ ایک اجنبی آدمی جس کا پتا ہی نہیں ہے کہ وہ کون

ہے۔ اُس نے میاں عبدالمجید صاحب پر پھر بھی اعتماد کرلیا کہ بھئی یہ پاکستانی ہے، مسلمان ہے، باہر سے سالوں بعد اپنے وطن واپس جا رہا ہے۔ وہ اسے اس کی رقم دینے واپس آئے تھے۔ ان کے لیے یہ یادگار واقعہ ہے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ جب وہ آرہے تھے تو ایک جگہ پر ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ایک ٹرک الٹ گیا تھا۔ ٹرک کے اوپر جو بندہ بیٹھا تھا وہ زخمی ہوگیا تھا۔ اب وہ چونکہ نئے نئے یورپ سے وہ ساری تہذیب دیکھ کر آئے تھے کہ ہنگامی حالات میں کسی کی مدد کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اُنھوں نے اس کو گاڑی میں بٹھا لیا اور اس کے ساتھ جو ڈرائیور تھا اُس کو بھی بٹھالیا۔ نزدیک ہی ایک جگہ تھی، وہاں ایک اسپتال تھا، وہاں اُسے لے گئے۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ بندہ زخمی ہے تو وہ میاں صاحب پر شک کرنے لگے کہ شاید اُنھوں نے زخمی کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی مصیبت آتی وہ جو زخمی تھا اس نے بتایا کہ اُنھوں نے تو اس کی مدد کی ہے۔ اسے اسپتال چھوڑ کر جانے لگے تو اُس نے میاں صاحب کو گلے لگایا، اس نے سب کو بتایا کہ اس کے ٹرک کو حادثہ پیش آیا تھا اور یہ ہمیں لے کر آئے ہیں۔ بڑے پیار محبت سے اُنھوں نے رخصت کیا۔ وہ مُصر تھے کہ یہ لوگ کچھ دن ان کے پاس رکیں مگر اِنھیں تو آگے جانا تھا اس لیے وہ روانہ ہوگئے۔ تو ان کو ترکی میں یہ دو واقعات پیش آئے۔

وہ شام سے ترکی میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے شام کی چوکی آتی ہے اُس کے بعد ترکی کی چوکی آتی ہے بارڈر کو کراس کرنے کے بعد۔ شام میں ان کا بڑا اچھا وقت گزرا، وہ وہاں پر رُکے، چوکی کے لوگوں نے ان کے لیے کافی منگوائی۔ وہاں سے شاذ ہی کوئی پاکستانی گزرتا تھا۔ اُنھوں نے انھیں بڑے پیار محبت سے بٹھایا، باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد اُٹھ کر وہ دوسری چوکی پر آگئے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ پاکستانی پاسپورٹ ہیں، مسلمان ہیں۔ وہاں پر اخبار پڑا ہوا تھا، ان سے پوچھنے

لگے کہ آپ عربی جانتے ہو۔ اُنھوں نے کہا ہاں تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ اُنھوں نے ہیڈلائن عربی میں پڑھ دی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور انھیں بٹھا لیا۔ کافی وغیرہ منگوائی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے جانے کو کہا۔ تو وہ کہنے لگے تم ڈیڑھ، دو گھنٹے شام کی چوکی پر گزارو۔ اُس سے پہلے ہم نہیں جانے دیں گے۔ تو یہ اُن کی محبت تھی جو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ اُنھوں نے راستے میں کہیں خطرہ محسوس نہیں کیا کہ کوئی لوٹ لے گا، اُس وقت بہت امن و امان تھا۔

البتہ اس زمانے میں راستے اتنے اچھے نہیں تھے۔ سب سے بُری سڑکیں یوگوسلاویہ میں تھیں۔ اُس وقت یوگوسلاویہ میں سڑکیں بن رہی تھیں اور جگہ جگہ پر کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اُن کیمپوں میں اسٹوڈنٹس اور والنٹیئرز کام کرتے تھے، انجینئرز بھی اُن کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ وہ سڑکیں بہت خراب تھیں۔ اس کے بعد سب سے زیادہ خراب سڑکیں تہران سے زاہدان تک کی تھیں۔ اب معلوم نہیں کیا حال ہے۔ اُس وقت تو بہت بُرا حال تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے کسی ایرانی سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ سیکنڈ ورلڈ وار میں کوئٹہ سے ٹینک اس راستے آتے تھے، اس کی وجہ سے سڑکیں تباہ ہوگئی تھیں۔ زاہدان سے آگے پہاڑی سلسلہ تھا۔ سوائے خشک پہاڑوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کہیں کہیں پرندے وغیرہ نظر آتے تھے۔ زاہدان میں قیام کر کے دوسرے دن پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ پہلی پاکستانی چوکی بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان نوکنڈی کے مقام پر ہے۔ یہاں پر داخل ہوتے ہی ایک ڈاک بنگلے میں ان کا قیام ہوا۔ وہاں کے ایک ملازم نے دونوں میاں بیوی کے لیے کھانے کا بندوبست کیا۔ کھانا بہت سادہ مگر لذیذ تھا۔ اس ملازم نے کھانے کی میز انگریزی طرز پر سجائی تھی۔ جس کو دیکھ کر میاں صاحب کی اہلیہ بے اختیار کہہ اُٹھیں ہم ایک مہذب علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ نوکنڈی سے محکمہ

ایکسائز والوں نے اپنا ایک سپاہی کوئٹہ تک کے لیے ان کے ساتھ روانہ کر دیا کیونکہ ابھی گاڑی کی ڈیوٹی ادا کرنا تھی۔

کوئٹہ میں میاں عبدالمجید صاحب اور بیگم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔اس کے بارے میں میاں عبدالرشید صاحب کو بھی نہیں پتا تھا۔لیکن میاں عبدالمجید صاحب کو یہ ضرور احساس تھا کہ اُن کے بڑے بھائی میاں عبدالرشید صاحب ان کو لینے آئے ہوں گے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کی گاڑی ایکسائز والوں نے روک لی تھی اس پر ڈیوٹی لگنا تھی اب سامان آ کر ہوٹل میں اتارا ور گاڑی ایکسائز والوں کا ایک گودام تھا، وہاں پر جا کر کھڑی کر دی۔ اس کے بعد ابھی وہ ہوٹل میں نہا دھو کے بیٹھے ہی تھے کہ میاں عبدالرشید صاحب ان کو تلاش کرتے تشریف لے آئے۔ وہ پتا کرتے رہے تھے مختلف ہوٹلوں میں اور ان کا پتا چلا لیا۔ برسوں بعد دونوں بھائی ملے تو ان کا ایک دوسرے سے الگ ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔وہ رو دیے تھے۔ یہ بڑی خوشی تھی، ایک تو وطن آنے کی اور دوسرے بھائی سے ملنے کی خوشی۔ وطن واپسی کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے اور اتنے سالوں بعد آپ واپس آتے ہیں تو ایک نیا احساس ہوتا ہے۔ ایک تبدیل شدہ انسان واپس آ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں میں بھی تبدیلی آ چکی ہوتی ہے۔جب وہ گئے تھے تو اکیلے تھے اور اب ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھیں۔وہ چائے پیتے رہے خیریت کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس گفتگو سے ان کو تھوڑا سا اندازہ ہوا کہ میاں عبدالرشید صاحب نے ان کو کبھی خط میں نہیں لکھا کہ نوکری چھوڑ دی ہے، وہ روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہوگئے تھے۔ گزر اوقات کے لیے وہ کوئی کاروبار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ایک میگزین ''حیاتِ جاوداں'' بھی اس وقت نکالا۔ اس میگزین کے وہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر بھی خود ہی تھے، باہر سے وہ خود پبلش کرواتے تھے۔ یہ بھی ایک ذمہ داری اُنھوں

نے اپنے سر پر لے رکھی تھی اور ان چار سالوں کے دوران ان کے بچے بھی ماشاء اللہ بڑے ہو گئے تھے اور ان کی تعلیمی ضروریات بھی بڑھ گئی تھیں۔ دوسرے خرچے بھی بہت تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو ان کی مالی حالت کے ٹھیک نہ ہونے کا اندازہ ہوا۔

میاں عبدالمجید صاحب نے یورپ روانگی سے پہلے والد صاحب کو خط میں لکھا تھا کہ وہ گاڑی لے کر آ رہے ہیں اور ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ گاڑی کی ڈیوٹی ادا کر سکیں۔ تو والد صاحب نے کچھ پیسے بھجوائے تھے۔ وہ میاں عبدالرشید صاحب لے کر آئے تھے تا کہ گاڑی کی ڈیوٹی دی جا سکے۔ جب وہ ایکسائز کے دفتر گئے تو پتہ چلا کہ کس طرح پروسیجر ہے۔ اُنھوں نے فارم لیا اس کو فل کیا اور پھر اسے لے کر کنٹرولر امپورٹ کے دفتر میں گئے۔ اس نے فارم لیا اور اس کو دیکھ کر اس نے فائل نیچے بھیج دی۔ میاں عبدالمجید صاحب اور میاں عبدالرشید صاحب اس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

جب قاصد یہ کام کرا کے لایا اور رقم پر میاں عبدالمجید صاحب کی نظر پڑی تو وہ پریشان ہو گئے۔ اُنھوں نے میاں عبدالرشید صاحب سے کہا۔ ''یہ تو بہت زیادہ رقم بن گئی ہے ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

میاں عبدالرشید صاحب کی نظر پڑی تو وہ حساب واقعی بہت زیادہ تھا۔ اور وہ اتنے پیسے نہیں دے سکتے تھے۔ ''چپ رہو۔'' میاں عبدالرشید صاحب نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کا ہاتھ دبایا کہ پریشان نہ ہو۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے اُنھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میاں عبدالرشید صاحب ان کے خیال میں دعا مانگ رہے ہوں گے ان کو ایسا ہی اندازہ ہوا کہ جیسے وہ استغراق میں چلے گئے ہیں۔ یہ کیفیت مشکل سے دو، چار منٹ جاری رہی، اب فائل افسر کے سامنے پڑی ہے، اور میاں عبدالرشید صاحب دعا مانگ رہے ہیں، میاں عبدالمجید صاحب پریشان

تھے کہ اب کیا ہو گا وہ اتنی رقم کہاں سے ادا کریں گے؟ مگر میاں عبدالرشید صاحب بالکل بھی پریشان نہیں تھے۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کا ہاتھ دبایا ہوا ہے کہ نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

وہ افسر اپنے کام میں لگا تھا اس نے اچانک فائل کو اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔ وہ فائل پڑھتا رہا اور میاں عبدالرشید صاحب نے دعا جاری رکھی۔ تو افسر نے اپنے کلرک کو واپس بلایا ''نہیں اس میں آپ نے غلطی کی ہے، اس کی تصحیح کریں، یہ اتنی رقم نہیں بنتی، کم بنتی ہے''

''میں دیکھتا ہوں سر۔'' کلرک نے کہا اور فائل لے کر دیکھنے لگا اس کے بعد اس نے رقم ٹھیک کی۔اور فائل افسر کے پاس لے آیا۔''اب دیکھ لیں سر ٹھیک ہے؟'' افسر نے فائل دیکھی اور بولا۔''ہاں اب ٹھیک ہے۔''اور فائل ان کی طرف بڑھا دی۔''آپ اتنی پے منٹ کر دیں۔''

اب کے میاں عبدالمجید صاحب نے دیکھا تو اتنی ہی رقم بنی تھی کہ جتنے والد صاحب نے پیسے بھیجے تھے۔ ان کو صحیح سے یاد نہیں کہ کتنی رقم تھی۔مگر جتنی ان کے پاس تھی۔حساب کتاب اس کے اردگرد ہی بنتا تھا۔ اب میاں عبدالرشید صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جو میاں عبدالمجید صاحب کو اب تک یاد ہے۔ اس وقت ان کو احساس ہوا کہ میاں صاحب کی دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔اور روحانیت کی طرف ان کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ وہ نئی اُمنگوں کے ساتھ نئے کام کرنے آئے تھے اور میاں عبدالرشید صاحب کسی اور ہی طرف جا رہے تھے۔ اُنھوں نے ادائیگی کر دی اور ان کو گاڑی مل گئی۔ اس کو ریلیز کرایا تو سب لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ صبح صبح وہ کوئٹہ سے ملتان آئے اور

ملتان کے راستے لاہور پہنچے۔ لاہور میں میاں عبدالرشید صاحب نے اپنے گھر کے ساتھ والے گھر میں میاں عبدالمجید صاحب اور ان کی بیگم کے لیے انتظام کروایا ہوا تھا۔ ایک کمرہ اور اس کے ساتھ باتھ روم وغیرہ تھا۔ وہاں پر تمام سہولتیں تھیں، وہاں ان کا قیام کرایا۔

بعد میں جب وہ کراچی آئے تو اُن نوکنڈی والے صاحب کو فون کیا، وہ ان سے ملتے رہے، اب تو اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس سفر کے دوران انھیں بہت سارے لوگ ملے مگر جو پیار ان لوگوں میں نظر آیا وہ کہیں اور نہیں ملا۔ اکیلی گاڑی ہے، بس دو میاں بیوی ہیں پھر بھی کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ کہیں پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسی طرح یورپ کا سارا راستہ وہ اچھے علاقوں سے بھی گزرے، بُرے علاقوں سے بھی گزرے۔ لیکن کہیں ان کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حالاں کہ اس وقت سڑکیں بھی زیادہ اچھی نہیں تھیں۔ اب سفر کرنے کے ذرائع بہت ترقی کر گئے ہیں لیکن سفر کرنا بہت دشوار ہوگیا ہے۔ خاص طور سے پاکستانیوں کا ان ملکوں سے گزرنا ہی بہت مشکل ہے۔ ہر جگہ پر ویزا، ہر جگہ پر آپ کی رجسٹریشن ہے۔ تو یہ چیزیں تو بہت بعد میں آئیں۔ اس وقت سب بہت سادہ تھا۔ کوئی رکاوٹ یا مشکل نہیں تھی۔ یہ سفر بھی ان کے لیے یادگار رہا۔

لاہور میں جب لوگوں کو پتا چلا کہ میاں عبدالمجید صاحب شادی کر کے آئے ہیں تو دعوتیں شروع گئیں۔ ان کے والد صاحب کہنے لگے کہ بھئی ہم نے ولیمہ کرنا ہے، یہ ضروری ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو اندازہ تھا کہ مالی حالت والد صاحب کی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ چھوڑیں ولیمہ کیا کرنا ہے آپ تھوڑی مٹھائی منگوا کر سب کو تھوڑی تھوڑی تقسیم کر دیں خواہ مخواہ خرچے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے اور میاں عبدالرشید صاحب کے جو دوست تھے، اُنھوں نے اس نئے جوڑے

کو دعوتوں پر بلایا۔ان کے ساتھ جو دوست تھے، ان کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں تو ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب کی عمر 25، 26 سال کی ہو گی۔ وہ ستمبر میں لاہور پہنچ گئے تھے۔ دس بارہ دن وہاں پر گزارے اور وہاں جو دوست یار تھے ان سے ملے۔ ظفر اقبال جوان کے ساتھ مانچسٹر میں رہتا تھا، وہ آیا ہوا تھا اس نے اپنے گھر پر بلایا۔ کرشن نگر میں ان کو گھر الاٹ ہوا تھا، اس نے بھی دعوت کی۔ باقی ان کے پرانے دوست تھے، اسکول کے، کچھ کالج کے۔ ان سب سے ملاقات ہوئی۔

اس وقت وہ طے کر کے آئے تھے کہ ان کو کراچی جا کر کام کرنا ہے۔ جب اُنھوں نے کراچی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔تو میاں امام الدین صاحب اور میاں عبدالرشید صاحب اس سے بڑے ناخوش ہوئے کہ وہ کراچی کیوں جا رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میاں عبدالمجید صاحب کو لاہور میں رہنا چاہیے اور لاہور میں ہی کوئی نہ کوئی نوکری یا کام ڈھونڈنا ہے۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب سے دبی زبان میں کہا کہ جن لوگوں کے ساتھ تم کام کرنے جا رہے ہو کوئی اتنی بڑی کمپنی نہیں ہے اور ان کا کام بھی خاص نہیں چل رہا ہے۔ اس لیے وہاں جانا بے کار ہو گا تو اُنھوں نے کہا۔ بات یہ ہے کہ ایک کمٹمنٹ ہے جس کو پورا کرنا ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھیں جو اللہ کو منظور ہو گا۔ ایک بار ضرور جانا ہے۔ اُنھوں نے کراچی کے لیے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ گاڑی پر ہی کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ بذریعہ سڑک اُس زمانے میں بہت دشوار سفر تھا۔سڑکیں بہت خراب تھیں۔مگر امن و امان کی صورت حال بہت اچھی تھی۔ بہاول پور میں ان کے پرانے دوست امان اللہ موجود تھے، وہ آئل کمپنی برما شیل میں کام کرتے تھے۔ یہ ستمبر 1960ء کی بات ہے۔ وہ بہاول پور میں تعینات تھے،اور برما شیل کے لیے اس ایریے میں افسر تھے شیل کے اس علاقے میں جو بھی پیٹرول پمپ تھے وہ ان کی نگرانی میں تھے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے ان کو لاہور سے خط لکھا۔ اُنھوں نے اپنا ایڈریس دیا تھا۔ وہ صبح صبح چلے شام تک بہاول پور پہنچ گئے وہاں پر امان اللہ سے ملاقات ہوئی دونوں کی پرانی دوستی تھی، اسکول میں بھی وہ ساتھ تھے، کالج میں بھی ساتھ تھے۔وہ اور امان اللہ دونوں غریب گھرانوں کے تھے تو ایک طرح کی پتلونیں، ایک طرح کی قمیصیں پہنتے تھے۔ ان دونوں کے پاس ایک وقت میں ایک اچھی قمیص اور ایک اچھی پتلون ہوتی تھی۔ وہ روز واپس کالج سے آ کر اس کو دھلوا کے استری کرکے پھر دوسرے دن کے لیے تیار رکھتے تھے۔ امان اللہ کی بھی شادی ہوگئی تھی، بیوی بھی اس کے ساتھ تھی ۔اس کو بڑا مکان ملا ہوا تھا، بہاول پور میں، تین چار دن ٹھہرے رہے۔ بہاول پور شہر دیکھا۔اس وقت بہاول پور شہر چھوٹا سا تھا۔مگر وہاں کے نواب کا محل دیکھنے کے لائق تھا۔ وہاں تعلیمی سہولیات اچھی تھیں۔ جامعہ عباسیہ تھی جو بعد میں اسلامیہ یونیورسٹی بنی۔ اسکول اور کالجز بہت تھے وہاں کا ایک مشہور کالج جس کا نام ایس ای کالج ہے وہاں سے احمد ندیم قاسمی جیسے لوگ پڑھے تھے۔ ایک جگہ گئے تو راستے میں انھیں دریائے ستلج پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی میں ساتھ لے جانا پڑا۔ اب وہاں پل بن گیا ہے۔ بہاول پور سے اُنھوں نے کراچی کے لیے سفر شروع کیا۔

ان کی بیگم صاحبہ کے لیے یہ سب کچھ کسی ایڈونچر سے کم نہیں تھا۔ کیوں کہ انگلینڈ میں نہ تو صحرا ہوتے ہیں اور نہ ہی ایسے علاقے۔ آہستہ آہستہ انھیں اُردو سمجھ آنا شروع ہوگئی۔ مگر بولنے میں ابھی دشواری ہوتی تھی۔البتہ ان کو کسی سے بات کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیوں کہ میاں عبدالمجید صاحب کے سب ہی دوست اور احباب انگریزی جانتے تھے۔ انگریزی میں باتیں ہوتی تھیں۔آگے کراچی تک کے سفر میں ان کو ایک جگہ اور رکنا تھا۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ کہاں ٹھہریں۔یا تو ان کو حیدر آباد میں رکنا تھا یا پھر خیر پور میں ٹھہرتے۔ خیر پور میں ایک

ٹیکسٹائل مل تھی۔ ریاست خیر پور کی ایک کمپنی تھی اس کی مالک شاید رانی خیر پور تھیں۔ اُنھوں نے ٹیکسٹائل مل لگائی ہوئی تھی۔ اس مل میں ان کے کچھ دوست ملازمت کرتے تھے۔ یہ پرانے تھل ٹیکسٹائل کے دوست تھے ان میں سے بہت سارے اب جنرل منیجرز ہوگئے تھے۔ تقریباً سب ہی جنھوں نے اپرنٹس شپ کی تھی، جب انڈسٹری بڑھی تو ان سب کو جگہ ملتی گئی، موقع ملتا گیا، ترقی ہوئی۔ کچھ وہاں پر خیر پور کی مل میں تھے، مل کا اپنا بڑا شاندار گیسٹ ہاؤس تھا۔ وہ اس میں رکے۔

اس وقت ایک انگریز جنرل منیجر تھا، اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی اچھی طرح ملا، ان کی بیوی کے بارے میں جان کر وہ بہت خوش ہوا کہ وہ بھی انگریز ہیں۔ اس نے میاں عبدالمجید صاحب کی بیوی سے کہا کہ اسے کہیں یہاں پر آجائے ہماری مل میں۔ مگر میاں عبدالمجید صاحب نے کہا کہ بھئی بہت بہت شکریہ ہم نے کراچی جانا ہے۔ اس کے بعد وہاں سے کراچی کے لیے سفر شروع ہوا۔ دوپہر میں وہ حیدرآباد پہنچے تو کھانا کھایا۔ اس کے بعد نکلے تو لانڈھی کے پاس کراچی نظر آیا۔ لانڈھی کا پُل اس وقت نہیں بنا ہوا تھا۔ ملیر ندی سے گاڑیاں گزرتی تھیں۔ وہ ندی کے اس طرف سے اپنی گاڑی لے جارہے تھے تو اُدھر سے خالد حسین صاحب گاڑی لے کر آتے نظر آئے۔ وہ لانڈھی میں کسی مل کا وزٹ کرنے جارہے تھے۔ اُنھوں نے بھی میاں عبدالمجید صاحب کو پہچان لیا۔ اُنھوں نے گاڑی کھڑی کرلی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے بھی گاڑی روک لی۔ خالد صاحب نے ان سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں۔ خالد حسین صاحب کا اپنا گھر سندھی مسلم سوسائٹی میں تھا، انھیں وہاں لے آئے۔ وہ تھوڑا سا فریش ہوئے، چائے وائے پی۔ اس کے بعد اُنھوں نے ان کو نارتھ ویسٹرن ہوٹل میں ٹھہرایا یہ کینٹ اسٹیشن کے پاس اچھا ٹھیک ٹھاک ہوٹل تھا۔

ترقّی کا سفر

دوسرے دن میاں عبدالمجید صاحب نے بیوی سے کہا ''آپ ذرا آرام کریں میں دیکھتا ہوں کہ دفتر کہاں ہے۔''

خالد حسین صاحب کا دفتر محمدی ہاؤس کی چھٹی منزل پر تھا۔ کمپنی کا نام AHS&CO. تھا اور یہ میکلورڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) پر تھا۔ اس وقت یہ بڑی بلڈنگ تھی۔ مگر دفتر کے لیے چھوٹی سی ایک جگہ تھی، کمرا ایک ہی اور چھوٹا سا تھا۔ وہاں پر وقار حسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے کچھ دوست تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ وقار صاحب کرکٹ کھیلتے تھے اور خالد حسین کے ساتھ تھوڑا سا بزنس شروع کیا ہوا تھا۔ کچھ انشورنس کا کام بھی کرتے تھے۔ کسی کو بیمہ کرا دیا کسی کو پالیسی دے دی، اس پر ان کو کمیشن مل جاتا تھا۔ مگر اصل میں وقار حسن صاحب کرکٹر تھے، پاکستان کی پہلی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی۔ اس وقت تو ٹیسٹ کرکٹر ہیرو ہوتے تھے ان کو سب جانتے تھے۔ خالد صاحب نے ان کو یہی بتایا تھا کہ اُنھوں نے وقار صاحب کو اسی لیے شامل کیا ہے کہ مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اب جہاں بھی جانا ہو تو وقار صاحب کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ تو ان کو کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ یہ اچھی جوڑی تھی اس میں اب میاں عبدالمجید صاحب بھی شامل ہو گئے۔ چند دن وہ وہاں پر رہے۔ یعنی ہوٹل میں ٹھہرے۔ ان دنوں اخبار میں ایک اشتہار آیا کہ ٹیچرز کی ضرورت ہے۔ یہ

کے-ڈی-اے میں کنڈرگارڈن اسکول تھا، اس کے لیے لیڈی ٹیچر چاہیے تھی۔ ٹیلیفون نمبر دیا ہوا تھا تو میاں عبدالمجید صاحب نے اپنی بیگم سے کہا کہ ان کو فون کرو، ممکن ہے آپ کو یہ نوکری مل جائے۔ اُنھوں نے فون کیا تو پتا چلا کہ آسامیاں لیڈی ٹیچرز کے لیے ہیں اور اسکول کا نام تھا ''جیک اینڈ جل'' (Jack & Jill)۔ اسے ایک محترمہ چلا رہی تھیں۔ ان کا تعلق بھی مانچسٹر سے تھا۔ وہ برٹش نیشنل تھیں۔ کنڈرگارڈن کے نام سے ہی ظاہر تھا کہ چھوٹے بچوں کا اسکول ہے۔اسکول پرنسپل نے کہا کہ بھئی آپ دو چار دن کے بعد آجائیں۔،وہ پیسے تو زیادہ نہیں دے رہی تھیں،مگر اس ملازمت سے مسز عبدالمجید کو لوگوں سے ملاقات کا موقع مل رہا تھا۔ اسکول میں جانے سے ان کی،سوشل لائف شروع ہوگئی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے پہلے دن سے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ مگر رہائش کا مسئلہ ابھی حل طلب تھا۔

ہوٹل میں وہ کتنے دن ٹھہر سکتے تھے۔ خالد صاحب اور وقار صاحب کے کرکٹ کے ساتھی محمود حسین صاحب تھے، وہ بھی قومی سطح کے کرکٹر تھے۔ فاسٹ باؤلنگ کرتے تھے۔ پاکستان کی پہلی ٹیم میں خان محمد جو خود بھی بہت بڑے فاسٹ بولر تھے۔ ان کے ساتھ محمود حسین کی جوڑی تھی، محمود حسین کا پی- ای- سی- ایچ -ایس میں ایک گھر تھا، وہ خالی پڑا تھا۔ خالد صاحب نے وقار صاحب سے بات کی اور اُنھوں نے محمود حسین سے کہا۔ کہ بھئی یہ لاہور سے آیا ہے بیوی ساتھ ہے تو اس کو کچھ عرصے کے لیے گھر کرائے پر دے دیں۔ وہ مان گئے کمپنی نے ان کو تھوڑا بہت ایڈوانس دیا۔ وہ پی- ای- سی- ایچ-ایس میں شفٹ ہوگئے۔ اس گھر میں کچھ سامان، بیڈ اور دوسرا فرنیچر تھا۔ بستر تو ان کے پاس تھے۔اُنھوں نے لاہور سے کچھ سامان گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ ایک طرح معمول کی زندگی شروع ہوگئی۔ وہ صبح بیگم کو اسکول میں چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر چلے جاتے تھے پھر دفتر کے بعد کبھی واپس ان کو

لیتے آتے تھے۔اگر کبھی وہ دفتر میں تاخیر کا شکار ہو جاتے تو وہ بس سے آجاتی تھیں۔اس وقت بسیں بڑی محفوظ تھیں۔

میاں بیوی کی آمدنی شروع ہوئی تو تھوڑی سی آسودگی آنے لگی۔میاں عبدالمجید صاحب کا انڈسٹری میں تھوڑا سا تعارف شروع ہوا۔ ان کو بھی پتا چلا کہ کون کون سی ملیں ہیں۔ان کی اپنی کمپنی کا کاروبار کیا ہے، کتنا ان کا ٹرن اوور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کے پاس جو معلومات تھیں۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اگر ٹیکسٹائل کے لیے ان کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ بہت ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی کمپنی کو بھی اوپر لے جا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کا ملوں میں تعارف شروع ہو گیا۔ملیں اس وقت اتنی زیادہ نہیں تھیں۔ پراچہ ٹیکسٹائل مل، احمد عبدالغنی، دوست محمد، اسٹار، رشید، حبیب، زیب تن، باوانی، ولیکا معروف مِلیں تھیں۔ ان میں ولیکا ٹیکسٹائل سب سے بڑی تھی۔یعنی لے دے کے یہ چھ سات ملیں تھیں۔ اگرچہ لانڈھی کے صنعتی علاقے کا آغاز تھا مگر وہاں پر چند بڑی ملیں آدم جی، حسین اور گل احمد وغیرہ تھیں۔ اس وقت اس علاقے میں سڑکیں نایاب تھیں اور راستے طویل تھے۔ خاص طور سے سائٹ کے علاقے میں جانا آسان نہیں تھا۔سڑکیں اچھی حالت میں نہیں تھیں۔آج کل جو پل نظر آتے ہیں، اس وقت بالکل نہیں تھے۔ نالوں کے اندر سے گاڑی نکال کر جاتے تھے۔بس آہستہ آہستہ چلتی تھی اور بہت دیر بعد آتی تھی۔ چند دنوں بعد ان کا حبیب ٹیکسٹائل مل میں جانا ہوا تو وہاں ان کو میاں امجد مل گئے جنھوں نے مانچسٹر کالج سے ڈگری لی تھی اور میاں عبدالمجید صاحب سے ایک سال سینئر تھے۔ مانچسٹر میں ان سے دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہمارے بہت سے مانچسٹر کے دوست واپس آچکے ہیں اور کراچی کی مختلف ملوں میں کام کر رہے ہیں۔ امین راٹھور صاحب باوانی ملز میں

تھے۔ اعجاز الحق فردوس ٹیکسٹائل ملز لانڈھی میں تھے۔ ان سب دوستوں نے اپنا ایک حلقہ بنایا ہوا تھا۔ اس میں شمولیت دوستوں میں واپسی کے مترادف تھی۔ یہ سب حضرات چونکہ دو ایک سال سے کراچی میں مقیم تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے حلقہ میں مانچسٹر کے گردونواح میں ڈپلومہ لے کر آنے والوں کو بھی شامل کیا ہوا تھا۔

اسی عرصہ میں کچھ لوگ امریکہ سے بھی ٹیکسٹائل کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ جن میں ایک خلیل الرحمٰن صاحب تھے، جو باوانی ملز میں کام کر رہے تھے۔ چونکہ وہ سیٹھ امین باوانی کے دوست تھے اس لیے باوانی میں ان کے خیالات کی پذیرائی ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ پہلی مل تھی جس میں جدید لیبارٹری لگی، لائبریری بنی اور ریسرچ ڈیولپمنٹ کا کام شروع ہوا۔

میاں عبدالمجید صاحب اور خلیل الرحمٰن صاحب ہم خیال تھے اس لیے ان سے دوستی ہوگئی جو عمر بھر قائم رہی۔ خلیل الرحمٰن صاحب نے پاکستان ٹیکسٹائل انڈسٹری کو جدید بنانے میں بہت کام کیا۔ دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ جب میاں عبدالمجید صاحب کراچی آئے تو سوائے خالد حسین کے کسی اور کو نہیں جانتے تھے۔

چند مہینے میں ان کو اندازہ ہوا کہ یہاں کے کاروبار کا انداز جدا ہے، خاص طور سے یہاں کے کاروباری لوگ ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ اِن کے ساتھ جو کاروبار کر رہا ہے اس کا شجرۂ نسب کیا ہے، کون سے کاروباری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ روایت ہے کہ لوگ جان پہچان والے شخص کے ساتھ ہی کاروبار کرنا پسند کرتے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کو شروع میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ باتیں تو ان کی سن لیتے ہیں مگر کاروبار ان کے ساتھ ذرا کم کرتے ہیں۔ اس وقت ان کو بڑا غصہ آتا تھا لیکن بعد میں اُنھوں نے محسوس کیا کہ بھئی یہ تو ان کا حق ہے کہ وہ ان کے کہنے پر

اتنی بڑی سرمایہ کاری کرنے جا رہے ہیں تو ان کو اتنا تو حق حاصل ہے کہ ان کے بارے چھان بین کریں۔ پھر وہ نئے نئے تھے، کام شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے ہی یہاں پر دو، تین بڑی بڑی کمپنیاں تھیں جو پاکستان میں ٹیکسٹائل مشینری سپلائی کر رہی تھیں اور اُنھوں نے جاپانی، جرمن اور برٹش ٹیکنیشنز رکھے ہوئے تھے۔ جب وہ آئے تو ان کا خیال تھا کہ کام جیسا وہ سمجھتے ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا۔ اور اُنھوں نے بہت تیر مارے ہوئے ہیں اور وہ جا کر جس وقت بات کریں گے تو سب لوگ سننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر وہ بات نہیں تھی ان کو یہاں آ کے محسوس ہوا کہ یہاں پر ایک روایتی انداز ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے محسوس کیا کہ جب تک وہ کاروبار کے اس انداز کو نہیں سمجھیں گے اور اپنا طریقہ کار نہیں بدلیں گے آگے جانا مشکل ہو گا۔ خالد حسین اور وہ کئی دفعہ بہت پریشان ہو جاتے تھے کہ کیا کریں۔ کاروبار چل نہیں رہا تھا اور ان کو شروع میں جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ کوئی ان سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ مشینری کے سلسلے میں باہر سے گورے آتے تھے ان کو کھانا کھلانے کے لیے وقار صاحب لے کر جاتے کیوں کہ ان کے پاس پیسے ہوتے تھے۔ میاں صاحب کے پاس تو ان کو کھانا کھلانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ تنگ آ کر خالد حسین کہنے لگے ”دیکھو یہ اب آخری چار چھ مہینے ہیں اس میں آپ جتنا زور لگا سکتے ہیں لگا لیں۔ اگر کام نہیں ہوتا تو ہم واپس یورپ چلے جائیں گے۔“

مگر میاں عبدالمجید صاحب اتنی آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُنھوں نے کہا۔

”نہیں خالد صاحب ایسی کوئی بات نہیں جب جانا پڑے گا چلے جائیں گے، ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا“

میاں عبدالمجید صاحب نے دن رات محنت شروع کی۔ خالد صاحب، وقار صاحب نے اور ان کی بیوی نے بھی بڑا ساتھ دیا۔ صبح سے لے کر شام تک یہی کام تھا، بہت محنت تھی۔ صبح جاتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ شروع میں تو اتنا فرق محسوس نہیں ہوا۔ مگر پانچ چھ مہینے کے بعد کاروبار کسی قدر بہتر ہونا شروع ہوا تو ان کا تھوڑا سا حوصلہ بڑھا۔ لیکن ابھی اتنا بھی نہیں تھا، کہ وقار صاحب کی، خالد صاحب کی اور ان کی تنخواہ نکل سکتی۔ وقار صاحب کی آمدنی کا ذریعہ اور بھی تھا۔ اس لیے ان کا گزارا ہو رہا تھا ویسے بھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے خرچا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اب رہ گئے میاں عبدالمجید صاحب تو ان کا سارا انحصار ہی اس کام پر تھا، اس کے باوجود وہ مایوس نہیں تھے ان کو یقین تھا کہ ان کی محنت کا صلہ ملے گا۔ جب وہ کراچی آئے تو جو اُنھوں نے انگلینڈ میں سیکھا تھا، جو ان کی صلاحیت تھی۔ جو ان کے آئیڈیاز تھے کہ ٹیکسٹائل انڈسٹری کو اُنھوں نے اس نہج پر لے کر جانا ہے، ان کو یہ بتانا ہے، یہ کام کرنا ہے، وہاں پر لیبارٹری سیٹ ہونی ہے، وہاں پر کوالٹی کنٹرول کو سیٹ کرنا ہے تاکہ کوالٹی بہتر بنے۔ پروڈکشن بہتر بنے، نئی چیزیں پروڈیوس ہوں اور مشین کی مینٹی نینس کا شیڈول ہونا چاہیے۔ لیکن ان چیزوں کا کہیں پر استعمال نہیں تھا اس لیے کہ مِلیں تھوڑی تھیں، اور مانگ بہت زیادہ تھی۔ ملوں والے جو بنا رہے تھے، اس کے طلب گار بہت تھے۔ کراچی میں دھاگے اور کپڑے کی ملیں تھیں، مِل کے باہر لوگ پیسے لے کر لائن میں بیٹھے ہوتے تھے کہ ہمیں کچھ دھاگا مل جائے یا کپڑا مل جائے۔ جب میاں صاحب ان کو کہتے کہ آپ تھوڑا سا کوالٹی کنٹرول کو بہتر کریں تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کو یاد ہے مل مالکان ہنستے تھے۔ وہ کہتے کہ کیا بات کرتے ہو، یہ دیکھو یہ لوگ لائن لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں خریدنے کے لیے، ایڈوانس لے کر آئے ہوئے ہیں، پیسے دے رہے ہیں، ٹیکس بھی دے رہے ہیں تو کوالٹی ہے

تو لے رہے ہیں نا تو آپ کون سی کوالٹی کی بات کرتے ہیں، چھوڑیں ان باتوں کو، ہمیں نہیں چاہیے کوالٹی، یہ جو کام ٹھیک چل رہا ہے اسے آپ چلنے دیں۔

یہ طرزِ عمل تھا اس وقت کاروباری لوگوں کا، ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کا کچرا بھی بک جاتا ہے، اصل میں ملیں ملک کی مانگ ہی پوری نہیں کر پا رہی تھیں اور برآمدات نہ ہونے کے برابر تھیں، اس لیے ان کو معیار کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ ملیں جو بھی پیدا کرتی تھیں بک جاتا تھا۔ ان دنوں ولیکا میں ایک انگریز جنرل منیجر تھا۔ اُدھر آدم جی مل میں بھی ایسا ہی حساب کتاب تھا۔ اس کا بھی مل منیجر انگریز ہی تھا، آدمجی کی ایک بہت بڑی اسٹیٹ تھی، بہت بڑی جگہ تھی ان کا اپنا ایک بہت بڑا انتظامی ڈھانچہ تھا۔ یہ چند گنتی کے لوگ تھے جو بہت بڑے صنعت کار مانے جاتے تھے تو ان کا اپنا رہنے سہنے کا طریقہ تھا لہٰذا وہاں تک تو رسائی مشکل ہوتی تھی۔

چونکہ روئی زیادہ تر پنجاب میں پیدا ہوتی تھی اس لیے اُدھر بڑی بڑی ملیں شروع ہوئیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت صرف دو بڑی ٹیکسٹائل ملز تھیں، لائل پور کاٹن ملز اور اوکاڑہ ٹیکسٹائل ملز۔ یہ دونوں ہندوؤں کی تھیں۔ ایک برلا گروپ اور دوسری ٹاٹا گروپ کی۔ اس کے بعد ملتان میں کالونی ٹیکسٹائل، لائل پور میں کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز شروع ہوئیں۔ اس کے بعد کریسنٹ، نشاط اور بہت سی اور ملوں کا آغاز ہوا۔ اس طرح لائل پور ٹیکسٹائل انڈسٹری کا مرکز بنتا گیا۔ اسی لیے کولمبو پلان کے تحت وہاں ٹیکسٹائل کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ پنجاب میں لائل پور کاٹن اور ستلج کاٹن ملز کی وجہ سے کچھ عملہ دستیاب تھا لیکن پھر بھی جاپانی، جرمن اور انگریز بھی موجود تھے۔

جب میاں عبدالمجید صاحب ان میں سے کسی سے ملنے جاتے تھے۔ تو دو دو گھنٹے باہر بیٹھے رہتے تھے کہ سیٹھ صاحب مصروف ہوتے تھے۔ دو گھنٹے، ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تھا تب جا کر کہیں دس منٹ، پندرہ منٹ بات ہوتی تھی۔ مصروفیت کا کہہ کر

پھر آجانے کو کہہ دیتے تھے۔ ان کو میاں صاحب کی بات سننے کی فرصت نہیں تھی اور باہر سے آنے والے گورے ماہرین کی باتیں وہ گھنٹوں سنا کرتے، اس وقت انڈسٹری کی حالت یہ تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب باہر سے پڑھ کر آئے تھے تو وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ اُنھوں نے جا کر ٹیکسٹائل کی حالت سنبھالنی ہے،ان کے ذہن میں بہت سارے پروگرام تھے۔مگر جب آئے تو صورت حال مختلف نظر آئی۔ لوگ ان کی سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مگر میاں صاحب نے ہمت نہیں ہاری، ان کو یقین تھا کہ آج نہیں تو کل یہ میری بات ضرور سنیں گے۔ان کا یقین درست ثابت ہوا۔

کچھ وقت ضرور لگا اور کام میں مشکلات بھی آتی رہیں، انھیں تو بزنس سرکل میں کوئی جانتا نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ اللہ کا فضل ہوا حالات بہتر ہونے شروع ہوگئے۔اس کے کچھ عرصے بعد وہ پی-ای-سی-ایچ-ایس میں محمود صاحب کے مکان سے ایک دوسرے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ جس جگہ پر آج کل لال قلعہ ریستوران ہے۔ اس کے عقب میں محمد علی سوسائٹی ہے۔ وہاں ہادی حسین صاحب بڑی مشہور شخصیت تھے۔ اپنے گھر کے ساتھ اُنھوں نے ایکسٹینشن میں فلیٹ بنائے ہوئے تھے۔ ہادی حسین صاحب ، خالد حسین صاحب کے ماموں تھے تو ان کی وجہ سے فلیٹ آسانی سے مل گیا۔ اب ایک اچھی رہائش مل گئی تھی اور اس وقت اُنھوں نے اپنا پرانا وعدہ پورا کیا جو اپنی والدہ سے کیا ہوا تھا۔ اُنھوں نے آصف کو کراچی بلا لیا۔ وہ ان کے ساتھ رہنے لگا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اس کو پراچہ ٹیکسٹائل میں اپرنٹس شپ کروادی۔ وہ آہستہ آہستہ اسی شعبہ میں آگے بڑھتا رہا۔ اس نے مختلف ملز میں اپنا کام کرنا شروع کیا۔ وہ مختلف کمپنیوں کی ملز میں مشینری کی انسٹالیشن کرتا تھا۔اسی سلسلے میں وہ ایران گیا تو وہیں اس نے شادی کرلی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے پانچ یا چھ سال وہ میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ رہا۔ آج بھی

وہ میاں صاحب کے ساتھ رابطہ رکھتا ہے اور ایران میں مقیم ہے۔

شروع کے ایک سال میں میاں عبدالمجید صاحب نے تجزیہ کیا تھا کہ

1- یہاں پر ملز مالکان گورے کی بات زیادہ سنتے ہیں۔

2- اپنے فٹرز پر بھروسہ کم کرتے ہیں۔

3- اپنے ٹیکنیشنز کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو اُنھیں ملنی چاہیے۔

4- مشینری کی تنصیب کے لیے لوگ باہر سے آتے ہیں۔ ان کا معاوضہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور معاوضہ فارن کرنسی میں دینا پڑتا ہے۔

5- مختلف ملوں میں ٹیکنیکل اسٹاف کا آپس میں رابطہ بہت کم ہے ان کو نئی ٹیکنالوجی کے حصول میں دشواری پیش آتی ہے۔ اور نہ ہی ان تک اس شعبے کا لٹریچر پہنچ پاتا ہے۔

خالد حسین صاحب نے میاں عبدالمجید صاحب کے اس تجزیے سے اتفاق کیا اس لیے ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ شروع کی گئی۔ جس میں خالد صاحب اور وقار صاحب شامل تھے۔ بتدریج قابل پاکستانی فٹرز بھی شامل ہوتے گئے جن کو مشینری ساز اداروں میں تربیت دلائی گئی تاکہ جو مشینری .AHS & Co سپلائی کرے اس کو پاکستانی فٹرز ہی انسٹال کریں اور ان کی سروس بھی وہی کریں۔ ٹارگٹ یہ تھا کہ کمپنی کے توسط سے جو بھی مشینری سپلائی ہو وہ کسی حالت میں بھی بند نہیں ہونی چاہیے۔ یہ .AHS & Co کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کے ساتھ ہی سیمیناروں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ٹیکنالوجی پر لیکچر ہوتے۔ سب ملوں کے ٹیکنیکل اسٹاف کو شرکت کا موقع دیا جاتا اور نئی ٹیکنالوجی کے حوالے سے باہمی گفتگو ہوتی۔ یہ طریقۂ کار پاکستان میں بالکل نیا تھا۔ تیسرا کام AHS & Co کا نیوز لیٹر تھا جس میں ٹیکنالوجی پر مختلف بین الاقوامی رسالوں میں چھپنے والی معلومات اکٹھی کر کے چھاپی جاتی تھیں

اور اس کے ساتھ ساتھ AHS&CO کے اپنے سپلائرز کے متعلق بھی مفید معلومات ہوتی تھیں اس طرح دو سال کے اندر اندر AHS&Co کا نام ٹیکسٹائل صنعت میں مشہور ہو گیا۔ بیرونی دنیا کے مشینری ساز بھی اس کمپنی کو پذیرائی دینے لگے۔

آپ جب کسی کے پاس جاتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ مشینری ہے، آپ لے لیں۔ اس میں یہ خوبیاں ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے ۔ دوسرا طریقہ اُنھوں نے جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں میں سیکھا تھا وہ یہ تھا کہ آپ صرف مشینیں نہیں بیچتے، آپ ٹیکنالوجی بھی بیچتے ہیں اور ٹیکنالوجی کے ساتھ کنسلٹنسی کی جاتی ہے کہ بھئی یہ مشینری جو ہے اس ٹیکنالوجی کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آپ کی پیداوار اتنی بڑھے گی، اس سے آپ کا نفع اتنا بڑھے گا تو ایک کنسلٹنسی کا پہلو اس میں شامل ہو جاتا ہے جو پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوتا تھا تو اُنھوں نے یہ ایک چیز شروع کی۔ اس کے بعد ایک اور کام شروع کیا۔ اس کی بھی ٹریننگ اُنھوں نے باہر سے لی تھی۔ ملوں میں کام کرنے والے پاکستانی فٹرز کے لیے میاں عبدالمجید صاحب نے منصوبہ بنایا کہ وہ جو مشینری بیچیں گے،اس کو لگانے والے پاکستانی باہر سے تربیت حاصل کر کے آئیں گے۔ اور وہی آگے مشینری کی انسٹالیشن کریں گے۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ مشینری باہر سے آتی تھی اور اس کو انسٹال کرنے کے لیے گوروں کو باہر سے بلوایا جاتا تھا۔ جرمن آتا یا انگریز آتا مگر اس کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر یہ کہ جو مشینری آگئی ہے، باہر کے فٹرز کے انتظار میں پڑی رہتی تھی۔

کاروبار میں بہتری کے ساتھ ہی اُنھوں نے ایک دفتر فیصل آباد میں اور ایک دفتر ڈھاکے میں کھولا۔اب ان کے تین دفتر ہو گئے اور وہ سارے ملک میں کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ خاص طور سے فیصل آباد کا دفتر بہت اہم تھا۔ وہاں ایک

صاحب حفیظ الدین خان تھے۔ وہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اُنھوں نے یہ فیصل آباد والا دفتر اپنے گھر پر شروع کیا۔ ان کا بہت بڑا مکان تھا اس میں ایک چھوٹا کمرا لے کر اُنھوں نے خود ہی اپنا دفتر شروع کیا۔ کمپنی کے پاس نئے دفتر کے لیے رقم نہیں تھی۔ ٹائپ رائٹر بھی انھیں کا ذاتی تھا، انھیں ٹائپ کا کام آتا تھا۔ ان کے علاوہ صرف ایک چپراسی تھا جو ان کی مدد کرتا تھا۔ تو اس طرح دفتر فیصل آباد میں کھل گیا۔ بعدازاں ڈھاکے میں دفتر شروع کیا۔ وہاں کے لیے عزیز مدھانی صاحب کو چُنا گیا جو باہر سے ڈپلوما کر کے آئے تھے اور رشید ٹیکسٹائل میں کام کرتے تھے۔ ایک بنگالی لڑکا جو پاکستان نیوی سے ریٹائر ہوا تھا۔ اسے ٹائپنگ کا کام کرنے کے لیے رکھ لیا گیا۔

جب فیصل آباد کا دفتر کھولنے کا فیصلہ کیا گیا تو حفیظ الدین خان صاحب کو بھی کراچی بلایا گیا، اور ان کو کراچی میں ہی ٹریننگ دی گئی۔ اس قیام کے دوران انھیں ایک گاڑی دے دی۔ کیونکہ پنجاب میں ملز کے درمیان فاصلے بہت تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ خودمختار ہو جائیں۔ جہاں جانا ہو خود چلے جائیں۔ پنجاب اور سندھ کا دورہ کریں۔ جب ڈھاکے کا دفتر کھولنے کا فیصلہ ہوا تو میاں عبدالمجید صاحب، عزیز مدھانی اور رفیق ٹائپسٹ کو لے کر وہاں گئے۔ اس زمانے میں ڈھاکے میں رہنے کی کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ صرف ایک شاہ باغ ہوٹل تھا، یہی سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ ان کے لیے شاہ باغ ہوٹل میں کمرا بک کروایا مگر عزیز مدھانی صاحب کہیں اور رہتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اسی کمرے کو دفتر کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح وہاں اپنے آپ کو متعارف کرانے لگے۔ بزنس آفس کے طور پر شاہ باغ ہوٹل کا پتا دے دیا کرتے تھے۔ جب مل مالکان ان کو جاننے لگے اور اُنھوں نے ملوں میں جانا شروع کیا تو ان کو باقاعدہ دفتر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنھوں نے دفتر کے لیے جگہ ڈھونڈنی شروع کی، اس زمانے میں ڈھاکا شہر تو

بہت بڑا تھا مگر اس میں اتنی زیادہ تجارتی عمارتیں نہیں تھیں۔اور جو تھیں ان کا بھی ماحول کوئی اتنا اچھا نہیں تھا۔ اس وقت میاں صاحب کو خیال نہیں تھا کہ ڈھاکا کی صورتِ حال کیا چل رہی ہے۔ان دنوں وہاں حالات کشیدہ تھے۔ بنگالی بہاری کا چکر شروع ہو گیا تھا۔

میاں صاحب عبدالمجید نے ہر نئی اور پرانی مل میں جانا شروع کیا۔اس وقت مشرقی پاکستان میں کافی ٹیکسٹائل ملیں تھیں۔ جن کے زیادہ تر دفاتر ڈھاکا میں تھے۔ کبھی سائیکل رکشا اور کبھی آٹو رکشا پر جاتے تھے۔ ایک مونی ٹیکسٹائل مل تھی، یہ بڑی پرانی مل تھی جو اندرون بنگال میں تھی۔ وہ اس کے دفتر ڈھاکا گئے۔ ایک بڑا اونچا لمبا اور خوب صورت ہندو وہاں بیٹھا تھا۔ وہ ان سے خوش اخلاقی سے ملا، میاں عبدالمجید صاحب اس سے باتیں کرتے رہے۔ ایک وزٹ ہوا، اس کے بعد وہ دوسری بار گئے تو اس سے تھوڑے سے تعلقات بہتر ہونا شروع ہوئے۔ اس طرح اس سے شناسائی ہوئی کہ وہ اپنی بات کرلیا کرتا تھا۔ ایک دن بیٹھے وہ چائے پی رہے تھے۔

باتوں کے دوران اس نے کہا ”آپ کہاں کے رہنے والے ہو۔“

اُنھوں نے جواب دیا ”پنجاب کا رہنے والا ہوں۔“

اس نے دُکھی لہجے میں بتایا ”اس علاقے کی میرے خاندان نے، میں نے خدمت کی ہے۔ ہمیں تقریباً سو سال ہو گئے ہیں یہاں پر رہتے ہوئے، پھر بھی یہ لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ہمیں یہاں سے بھگانا چاہتے ہیں۔“

وہ وہاں کا پرانا رہائشی تھا۔ کہنے لگا۔ ”یہ تاریخ کا حصہ ہے، میں یہ پیشن گوئی کر رہا ہوں کہ آپ مہمان ہو، میری بات سن لیں۔ آٹھ، دس سال کے بعد یہ لوگ آپ کو بھی یہاں سے بھگائیں گے کیونکہ ان کے مسائل اتنے ہیں۔ کوئی بھی ان کو حل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ یہ خود اپنے مسائل حل نہیں کر پاتے اس لیے یہ دُوسروں کو

الزام دیتے ہیں۔ کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو۔اس وقت تو میاں عبدالمجید صاحب کو اس کی بات مہمل سی لگی تھی مگر واقعی دس سال بعد اس کا کہا درست ثابت ہوا۔ اندرون خانہ تعصب والی باتیں چل رہی تھیں اور پھر پنجابی کو وہاں پر پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ پنجابیوں کو اکثر لوگ برا کہتے تھے کہ یہ پنجابی ہم لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں اور یہ ہمارا حق کھا رہے ہیں۔میاں صاحب سنتے رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ اتنی کوئی سنجیدہ بات نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد موتی جھیل میں مکان کا ایک حصہ کرایے پر لیا گیا جہاں کمپنی کا باقاعدہ دفتر قائم ہوا۔ اس طرح میاں عبدالمجید صاحب کے ڈھاکا کے باقاعدہ دورے شروع ہو گئے۔

شاہ باغ ہوٹل میں میاں صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، تو ایک واقعہ پیش آیا۔اُنھوں نے کچھ امریکی مشینیں سپلائی کی تھیں اور ان مشینوں کو انسٹال کرنے کے لیے دو امریکی وہاں پر آئے ہوئے تھے ۔ میاں صاحب جانتے تھے کہ وہ ابھی انڈر ٹریننگ ہی ہیں، مگر وہ باہر سے آئے ہوئے تھے۔اس لیے ان کی قدر تھی۔ شام کے وقت دونوں امریکی آ کر وہاں لاؤنج میں بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی گورے ہوتے تھے اصل میں جتنے بھی گورے آتے تھے وہ اسی ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔اس وقت ڈھاکا کا انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل بنا نہیں تھا۔ اس کی کنسٹرکشن ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں فیلڈ مارشل ایوب خان صاحب مشرقی پاکستان کے دورے پر آئے۔ ان کے اعزاز میں شاہ باغ ہوٹل میں استقبالیہ دیا گیا۔ شام کے وقت میاں صاحب ہوٹل کے لاؤنج میں چائے پی رہے تھے۔ان کے ساتھ دونوں امریکن بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان امریکیوں کو بھی پتا تھا کہ صدرِ پاکستان آ رہے ہیں۔اُنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ شرط لگائی۔

ایک امریکن نے کہا۔ ”اگر میں پریذیڈنٹ سے ہاتھ ملا کر آؤں تو تم مجھے بیئر

کا ایک کریٹ دو گے اور اگر میں نہیں ملا پایا تو میں تمہیں بیئر کا ایک کریٹ دوں گا"

"مجھے منظور ہے۔" دوسرے نے شرط مان لی۔

میاں صاحب سمجھے مذاق ہو رہا ہے۔اس دوران صدر ایوب اندر داخل ہوئے۔ان کے ساتھ جتنے بھی پاکستانی تھے وہ ان کے دائیں بائیں مودب چل رہے تھے۔کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔تو شرط لگانے والا امریکن ایک دَم اپنی کرسی سے اُٹھا اور جا کر ایوب صاحب سے بولا" ہیلو مسٹر پریذیڈنٹ"اور ان کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

صدر ایوب نے بھی بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔"ہیلو تم یہاں کیا کر رہے ہو۔؟"

اس نے کہا۔" میں یہاں پر مشینری انسٹالیشن کے لیے آیا ہوا ہوں مسٹر پریذیڈنٹ۔"

صدر ایوب نے اس سے کہا۔" Good Luck "اور آگے چلے گئے۔

وہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔" دیکھو میری شرط پوری ہوگئی۔بھئی تم مجھے اب بیئر کا کریٹ خرید کر دو گے۔"

"او کے میں خرید کر دوں گا۔" دوسرے امریکی نے کہا۔

اس وقت پاکستان میں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔کلبوں، ہوٹلوں اور بارز میں شراب چلتی تھی۔ جب صدر ایوب چلے گئے۔اس کے بعد سی آئی ڈی والے آ گئے پہلے تو اُنھوں نے آتے ہی میاں عبدالمجید صاحب سے پوچھا۔" یہ کون ہے جس نے صدر سے ہاتھ ملایا تھا۔"

اُنھوں نے کہا" یہ میرے مہمان ہیں،امریکہ سے آئے ہوئے ہیں مشینیں انسٹال کر رہے ہیں"

سی آئی ڈی والے نے کہا۔" اس نے کس طرح صدر سے ہاتھ ملایا۔اس نے پروٹوکول کی خلاف ورزی کی ہے، آپ سب کو تھانے میں آنا پڑے گا۔"

یہ سن کر میاں صاحب پریشان ہو گئے۔ ان کو فکر لگ گئی کہ امریکیوں کو بھی تھانے میں نہ طلب کر لیا جائے۔ وہ بھی بولیں گے کہ پتا نہیں کس قسم کا ملک ہے، امریکا میں تو یہ حال ہے کہ عام آدمی امریکی صدر سے مل لیتا ہے، ان سے ہاتھ ملاتا ہے، وہاں کوئی اسے مسئلہ نہیں بناتا اور نہ یہ ایسی کوئی خاص بات ہوتی ہے۔ اُنھوں نے سی آئی ڈی والوں سے بات کی۔ ان کو سمجھایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں وہ تو صرف صدر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ جیسا کہ لوگ آٹوگراف لیتے ہیں،اس نے تو صرف ہاتھ ہی ملایا ہے۔ خیر بڑی مشکل سے اُنھوں نے سب کے نام، پتے نوٹ کر کے ان سب کی جان چھوڑی، ورنہ تو وہ کہہ رہے تھے کہ امریکیوں کو بھی بلاؤ ان سے بھی بات کریں گے، اُنھوں نے ایک غلط کام کیا ہے۔ سیکورٹی صدر کی اس وقت بھی ہوتی تھی، مگر آج کی طرح نہیں کہ جناب صدر جہاں ہوں وہاں سے دور دور تک کسی عام آدمی کا گزر ممکن نہیں ہوتا۔

میاں عبدالمجید صاحب کا مشرقی پاکستان میں آنا جانا شروع ہوگیا۔ اسی طرح سارا پاکستان ان کے کاروبار میں آ گیا۔

میاں صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ وہ پاکستان میں اس وقت آئے۔ جس وقت باہر ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بہت ریسرچ ہو رہی تھی، نئی نئی مشینیں آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے جتنی آنے والی مشینیں تھیں وہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے ڈیزائن کی تھیں۔ جوں جوں کام بڑھتا گیا میاں عبدالمجید صاحب کو مل کے اندر کے حالات کا اندازہ ہونا شروع ہوا۔ پاکستان ٹیکسٹائل انڈسٹری کی مشینری دوسری جنگ عظیم سے پہلے والی ٹیکنالوجی پر مبنی تھی۔ یہ مشینیں سیکنڈ ہینڈ تھیں جو یورپ اور جاپان سے کم

قیمت پر خریدی گئی تھیں۔ کیونکہ قیام پاکستان کے بعد زرمبادلہ کم تھا۔ مسلمانوں کے پاس سرمایے کی کمی تھی مگر اس کا فائدہ ضرور ہوا کہ انڈسٹری کی بنیاد پڑی۔ روزگار کی راہیں کھلیں، ملکی ضروریات پوری ہونا شروع ہوئیں، کاروبار نفع بخش تھا اس طرح سرمایہ بنا اب انھی مشینوں میں جدت لانے کا وقت تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے Smith and Nephew میں ملازمت اور مختلف ملکوں میں ٹریننگ کے دوران نئی ٹیکنالوجی کو پنپتے دیکھا تھا اس لیے ان کو یقین کامل تھا کہ جلد ہی ایک بڑا موقع آنے والا ہے جس سے ترقی کی نئی شاہراہیں نکلیں گی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے پاکستان کے دونوں حصوں فیصل آباد اور ڈھاکا میں دفاتر قائم ہو چکے تھے۔ ان کو یہ ادراک بھی تھا کہ اب پُرانی مشینری کے بجائے نئی مشینری آئے گی جس کے لیے ہمیں اپنے کام کو نئے سرے سے منظّم کرنا ہے۔

اس دوران کمپنی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ ان کا دو مشینری ساز کمپنیوں سے رابطہ ہوا، ایک کا نام سپنڈل فیبرک سوسن اور دوسری کا نام کراس رول وارگا تھا۔ پہلے والی کمپنی جرمن جبکہ دوسری برطانوی تھی۔

اب اس میں سے نئی نئی چیزیں آ رہی تھیں۔

کام کے سلسلے میں میاں عبدالمجید صاحب کو ایک ایک مل میں جانا ہوتا تھا۔ پاکستان کی کوئی ایسی مل نہیں تھی جس میں وہ نہیں گئے۔ وہ تجاویز لے کر جاتے تھے اور جا کر گفتگو کرتے تھے کہ آپ کی مشینری اس طرح جدید ہو سکتی ہے۔ اس سے مل میں یہ ترقی آئے گی، مشین کی رفتار بڑھ جائے گی، مل کی کوالٹی بہتر ہو جائے گی۔ ان دنوں میں مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ صبح سے لے کر شام تک میاں صاحب کام کرتے کیونکہ نیا نیا کاروبار سیٹ ہوا تھا اور ذرا سی بے پرواہی سے کام خراب ہو سکتا تھا۔ وہ رات گئے تک کام کرتے۔ اکثر دیر سے گھر آتے مگر اس سلسلے میں ان کی بیگم

نے ہمیشہ بھرپور تعاون کیا۔ اگر ان کی بیگم کا تعاون نہ ہوتا تو شاید میاں صاحب کاروبار کو اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے۔بیگم مجید نے گھر کو سنبھالا اور پھر 1962ء میں ان کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تو اس کی ساری دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھیں، بیٹے کا نام جاوید مجید رکھا گیا۔ وہ آج کل لندن یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ اُنھوں نے پی ایچ ڈی آکسفورڈ یونی ورسٹی سے کی ہے۔ کیمبرج میں بھی اُنھوں نے کچھ عرصہ پڑھایا۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز جو لندن یونیورسٹی کا حصہ ہے وہاں بھی جاوید مجید نے تعلیم دی۔ ان کی پیدائش کے وقت وہ اکیلے ہی تھے۔میاں صاحب کی طرف سے بھی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی ان کی بیوی کی والدہ وغیرہ تھیں۔ وہ اتنی دور سے مدد کے لیے آ بھی نہیں سکتی تھیں۔اس لیے ان دونوں کو سب کچھ خود ہی کرنا پڑا تھا۔ ان کی فیملی میں جاوید کا اضافہ ہوا، اور اس کے ساتھ ساتھ آصف بھی ساتھ ہی مقیم تھا تو گھر کے سارے کام، بچوں کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھیں۔

میاں عبدالمجید اکثر گھر پر نہیں ہوتے تھے، زیادہ تر ان کو طویل دوروں پر پنجاب اور سرحد جانا ہوتا تھا۔ وہ ایسا کرتے تھے کہ گاڑی میں کراچی سے شروع کرتے اور پشاور تک گاڑی میں سفر کرتے ہوئے راستے میں جتنی بھی ملیں آتی تھیں، ان کا دورہ کرتے جاتے تھے، پھر واپسی پر کسی اور راستے سے آتے تھے اور باقی رہ جانے والی ملوں کا دورہ کرتے ہوئے آتے۔ ان کو کئی ہفتے گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ ان دنوں محترم میاں یحییٰ صاحب جو محترم میاں منشا صاحب کے والد تھے اُنھوں نے بہت شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے اُنھوں نے اپنی لائل پور (فیصل آباد) مل میں حکم دے رکھا تھا کہ جب کبھی بھی .AHS&CO کے لوگ آئیں ان کو کم ازکم اتنا ضرور کام ملنا چاہیے جس سے ان کے دورے کے مصارف نکل سکیں۔ میاں عبدالمجید صاحب میاں یحییٰ صاحب کی باتوں اور محبتوں کا

تذکرہ ہمیشہ خوش گوار انداز میں کرتے ہیں۔ اسی طرح کراچی میں بھی حبیب ٹیکسٹائل ملز کے مالکان نے شروع کے زمانے میں .AHSC&Co کی بہت سرپرستی کی اور اس کے ساتھ سیف الدین ولیکا مرحوم بھی کمپنی کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

ایک اور سنگِ میل

یہ بات تو گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے کہ خالد حسین صاحب کی میاں عبدالمجید صاحب سے مانچسٹر میں ملاقات ہوئی تھی وہ 1959ء میں برسلز میں انٹرنیشنل ٹیکسٹائل مشینری کی نمائش کے بعد مانچسٹر آئے تھے۔ یہ زمانہ صنعتی زندگی میں اہم تبدیلیوں کا زمانہ ہے اسی زمانے سے انٹرنیشنل ٹیکسٹائل نمائشوں کا آغاز ہوا۔ ٹیکسٹائل مشینری بنانے والے اس امر سے اتفاق کر چکے تھے کہ ہر چار سال بعد اس طرح کی بین الاقوامی نمائش ہونی چاہیے جہاں پر سب مشینری بنانے والے اپنی نت نئی ایجادات کو صارفین کے سامنے متعارف کرا سکیں۔ ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کو روشناس کرانے میں ان نمائشوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سلسلے کی دوسری نمائش 1963ء میں جرمنی میں منعقد ہونے جا رہی تھی۔ AHS&Co. کے لیے یہ ایک نیا سنگِ میل تھا۔ اس کے لیے خالد حسین صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب نے پوری توانائی کے ساتھ تیاری شروع کر رکھی تھی۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ آئندہ کاروبار دو جہتوں پر مشتمل ہوگا یعنی نئی مشینری، نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ اور پرانی مشینری نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگ کی جائے گی۔ خالد حسین صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب کا نمائش میں شرکت کا پروگرام طے ہو گیا تھا دونوں نے مل کر اپنے اپنے اہداف مقرر کیے کہ کون سی ٹیکسٹائل مشینری بنانے والی

کمپنی سے ایجنسی کی بات کرنی ہے اور پاکستان سے آئے ہوئے مندوبین کی کس طرح دیکھ بھال کرنی ہے۔ اور اپنی کمپنی کی نئی ایجادات کو اپنے گاہکوں کے سامنے کس انداز میں پیش کرنا ہے۔ یہ دونوں حضرات اس امر سے اتفاق کر چکے تھے کہ اس نمایش میں کامیابی ہی آئندہ کاروبار میں ترقی کے راستے کھولے گی۔

زمانۂ طالب علمی کے بعد یورپ جانے کا پہلا اتفاق ہو رہا تھا اور اس وقت تک یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ کمپنی انھیں گاڑی خرید کر دے گی۔ پہلے ان کی اپنی گاڑی تھی۔ اس کا پیٹرول اور مینٹی نینس وغیرہ کمپنی دیتی تھی مگر گاڑی ان کی ذاتی تھی۔ یہ گاڑی ملنے کے بعد اُنھوں نے اپنی کار بیچ دی اور اس کے بعد اُنھوں نے اپنی بیوی اور بیٹے کو انگلینڈ بیگم کے والدین کے پاس لے جانے کا سوچا۔ یہ 1963ء کی بات ہے۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار گئے تھے۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کی بیگم بہت عرصے سے اپنے خاندان سے نہیں ملی ہیں۔

جب وہ وہاں سے شادی کر کے آ رہے تھے تو ان کے سسرال والوں کا خیال تھا کہ ان کے پاس ذرائع ہوں گے یا نہیں۔ اور پتا نہیں کبھی ہماری بیٹی واپس آئے گی بھی یا نہیں آئے گی، کبھی اس سے ملاقات ہوگی بھی یا نہیں ہوگی؟۔ میاں صاحب نے ان سے کہا تھا کہ انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، وہ آتے جاتے رہیں گے۔ مگر وہ تین سال تک بیوی بچوں کو نہیں بھیج سکے تھے۔ بہرحال یہ سلسلہ ایک بار چل نکلا اور اس کے بعد وہ مستقل برطانیہ آتے جاتے رہے۔ اُنھوں نے بیوی بچے کو پہلے بھیج دیا تھا اور خود وہ ایگزی بیشن کے لیے ستمبر میں گئے تھے۔ ایک طرح سے یورپ کے ساتھ ان کا پھر سے رابطہ تھا۔

وہاں پر دس دن کی نمایش تھی۔ صبح سے شام تک وہ کسٹمرز کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو بھی دکھاتے کہ یہ کون سی مشینری ہے اور کچھ یہ بھی کوشش کرتے تھے کہ نئی

مشینری جو بھی آرہی ہے اس کی ایجنسی بھی حاصل کرلیں۔ یہ ایک خاصا دلچسپ اور معلوماتی کام تھا۔ اس نمائش میں نتائج کم و بیش اندازے کے مطابق تھے۔ AHS&Co. کو دونوں اطراف سے یعنی مشینری بنانے والوں اور پاکستانی صارفین سے خاصی پذیرائی ملی۔ اور پھر اس کے بعد جب نمائش ختم ہوئی تو وہ مانچسٹر واپس گئے، فیملی وہاں تھی۔ وہ وہاں جتنے دن رہے تو پرانے دوستوں سے ملتے رہے۔ کالج میں گئے۔ اپنے پروفیسرز سے بھی ملے اور وہاں پر جو نئی ریسرچ ہورہی تھی، اساتذہ سے اس کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ جب بھی وہ مانچسٹر جاتے تو وہاں پر اپنے کالج یونی ورسٹی میں ضرور جاتے تھے۔ اپنے پروفیسرز سے ملتے۔ وہاں پر جو ریسرچ ہورہی ہوتی تھی اس سے واقفیت حاصل کرتے۔ ان کے پروفیسرز بھی بڑے خوش ہوتے تھے کہ پرانا طالب علم ان کے پاس آتا ہے، ان سے آ کے ابھی بھی پوچھتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، کس طرح کام چل رہا ہے۔ یہ رابطہ ابھی تک قائم ہے۔ اب وہ جب بھی جاتے ہیں تو مانچسٹر یونی ورسٹی ضرور جاتے ہیں۔ اگرچہ اب وہ ڈپارٹمنٹ خاصا چھوٹا ہوگیا ہے اور وہاں پر اتنے زیادہ طلبہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ جب بھی جاتے ہیں تو وہاں پر ایک دفعہ رابطہ ضرور کرتے ہیں۔ وہاں کام اب بھی ہو رہا ہے اور پاکستان میں ریسرچ کرنے والی تمام یونی ورسٹیوں سے زیادہ ہو رہا ہے۔

مانچسٹر میں ہی ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ کا دفتر ہے یہ واحد انسٹیٹیوٹ ہے جس کو Royal Charter کے تحت قائم کیا گیا۔ اس وقت اور ابھی تک اس ادارے کو دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مانچسٹر کالج کی ڈگری کے ساتھ ہی میاں عبدالمجید کو ATI یعنی ایسوسی ایٹ ممبر آف ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ کا اعزاز حاصل تھا۔ اس وقت اس ادارے کا پاکستان میں وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ میاں عبدالمجید

صاحب نے خاص طور پر اس ادارے سے دوبارہ رابطہ کیا تا کہ اس پلیٹ فارم سے پاکستانی ٹیکنیشنز کو اپنے علم و ہنر کو بڑھانے میں مدد ملے۔ یہ کیسے ممکن ہوا اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

میاں عبدالمجید صاحب کا والد صاحب اور بھائی سے مستقل رابطہ تھا جب بھی پنجاب کی طرف جانا ہوتا تھا ان سے ضرور ملتے تھے۔جب بھی وہ لاہور جاتے تھے تو والد صاحب ہمیشہ ان سے کہتے تھے کہ ایک یا دو دن نکال کر آؤ گاؤں چلیں گے۔وہ ان کو گاڑی میں اپنے گاؤں لے کر جاتے تھے۔ وہاں اپنا پرانا مکان تھا۔میاں صاحب اس کو کھولتے، اس کی صفائی وغیرہ کرواتے۔اس وقت گاؤں سے اتنا رابطہ نہیں رہا تھا پھر بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ایک دن والد صاحب نے ان سے کہا کہ بھئی تمہارے پاس اب تھوڑی سی آمدنی آنا شروع ہوگئی ہے تو اپنے خاندان کے مستحق لوگوں کی جو مدد ہوسکتی ہے، وہ کرو۔ ان کی ایک مامی تھیں،اصل میں وہ ان کی والدہ کی ممانی تھیں، ان کی آنکھیں خراب ہوچکی تھیں، والد صاحب نے کہاتم ایسا کرو ان کو ہر مہینے کچھ نہ کچھ پیسے بھیجا کرو۔میاں عبدالمجید صاحب نے اس حکم کی تعمیل شروع کر دی۔ان کی طرف سے بھیجا جانے والا وظیفہ ساری عمر اُن کو ملتا رہا۔ ان کے بعد مامی کے بچے تھے، ان کو اب بھی وظیفہ ملتا ہے۔ اس میں کچھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔اسی طرح ان کے عزیز جو گاؤں ہی میں رہتے تھے، میاں عبدالمجید صاحب نے ان سے کہا کہ بھئی یہاں پر اگر کوئی ایسے لوگ ہیں جن کو مدد کی ضرورت ہو تو وہ ان کو لسٹ دے دیا کریں تو جو ضرورت مند ہیں ان کی تھوڑی بہت مدد ہوتی رہے گی۔اس طرح بہت سارے لوگوں کو وظیفہ جاری ہوا اور وہ ابھی تک جاری ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو یاد ہے کہ ان کے گاؤں میں ہندو بہت تھے اور وہ جو بھی کماتے تھے، اس میں سے پندرہ آنے ایک طرف رکھ لیتے تھے، ایک آنہ وہ مدد کے لیے رکھتے تھے۔

اس رقم سے وہ فلاحی کام کرتے تھے ۔میاں صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔آج تک کرتے ہیں ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہمیشہ الگ ہوتا ہے ،یہ امداد کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

والد صاحب اور میاں عبدالرشید صاحب کے ساتھ ان کا رابطہ مستقل رہتا تھا۔ جب وہ برطانیہ سے واپس آئے تو میاں عبدالرشید صاحب کا میگزین بند ہوگیا تھا اور ان کا کاروبار بھی نہیں چلا تھا تو اُنھوں نے پھر سے پنجاب اسمبلی میں رپورٹر کی ملازمت کرلی۔ ان کی وہاں پر ساکھ بہت اچھی تھی۔اس وجہ سے ان کو دوبارہ ملازم رکھ لیا گیا۔میاں عبدالمجید صاحب کے خیال میں یہ وہی زمانہ ہے جب اُنھوں نے باقاعدگی سے نوربصیرت کے نام سے روزنامہ نوائے وقت میں کالم لکھنا شروع کیا۔

اکیلے ہی سفر پر جاتے۔ تو جب بھی لاہور جاتے والد صاحب اور بھائی سے ضرور ملتے۔ شروع میں چونکہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی باہر کا آدمی ہوتا تھا اور اس کی وجہ سے ان کو بھی کسی نہ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا ہوتا تھا۔ والد صاحب اور بھائی جان نے بارہا کہا۔ ''یار یہ کیا بات ہے، تم گھر پر کیوں نہیں ٹھہرتے ہو''۔ خاص طور سے والد صاحب بہت ناراض ہو جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ میاں عبدالمجید صاحب نے انھیں سمجھایا کہ یہ لوگ کاروبار کے لیے آئے ہیں اور ان کے ساتھ پروگرام ہوتا ہے، ان کے ساتھ شام کو بھی میٹنگ ہوتی ہے۔ ان کو بھی ساتھ لے کر جانا پڑتا ہے تو ذرا وقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مگر ایک وعدہ ضرور کرتے تھے کہ جب بھی وہ یہاں آئیں گے، ایک یا دو یا تین دن جب بھی ٹائم ملے گا، گھر پر آئیں گے، بیٹھیں گے، کھانا کھائیں گے، آرام سے گپ ماریں گے اور پھر باقی رہا سونے کا مسئلہ تو یہاں بھی سونا ہے، وہاں بھی سونا ہے۔ جب تک ان کے والد صاحب زندہ رہے تو یہ سلسلہ چلتا رہا اس کے بعد میاں عبدالرشید صاحب بھی جب زندہ تھے تو یہ سلسلہ آخر وقت تک چلتا رہا۔ ان کے ساتھ جا کر بیٹھنا، نئی پرانی باتیں کرنا، ملک کی باتیں، حالات حاضرہ پر تبصرے۔ یہ ساری چیزیں چلتی رہتی تھیں۔ خاندان سے ان کا تعلق کبھی کمزور نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔

جیسے جیسے ملک کے کاروباری حالات بہتر ہو رہے تھے۔ اُن کا کاروبار بھی بہتر ہو رہا تھا، نئی نئی انڈسٹریز لگ رہی تھیں، پاکستان کی اقتصادیات بہتر ہو رہی تھی۔ اب تک تو ان کا بزنس یورپ سے تھا۔ پہلی بار امریکہ سے رابطہ ہوا۔ کچھ مشینری مینوفیکچرز کے ساتھ معاہدہ کیا۔ یہ امریکن مشینری سپلائیر تھے۔ ایوب خان کے زمانے میں امریکی عمل دخل شروع ہوا۔ ان کے سپلائرز پاکستان کی مارکیٹ کو اہمیت دے رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی کمپنی کو بھی آنے کی دعوت ملی۔ کہ آپ

وہاں پر آئیں، ہم آپ کو پلانٹ دکھانا چاہتے ہیں جہاں پر ہماری مشینیں بنتی ہیں۔

وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اُنھوں نے جانے سے پہلے لاہور فون کیا۔ اس وقت گھر پر تو ٹیلیفون نہیں ہوتا تھا لیکن وہ پہلے ایک ہمسائے کو کہہ دیتے تھے کہ میں اتنے بجے فون کروں گا آپ والد صاحب یا بھائی جان میں سے کسی کو بلا دیجیے گا۔ اس زمانے میں لوگ زیادہ تر خط و کتابت سے رابطے کا کام لیتے تھے۔ وہ بھی خط لکھا کرتے تھے۔ والد صاحب کا خط آتا تھا، میاں عبدالرشید صاحب کے خط بھی آتے رہتے تھے۔ اور پھر وہ اتنی باقاعدگی سے لاہور کے وزٹ کرتے تھے کہ ہر مہینے ہی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اگر صرف فیصل آباد ہی جانا ہوتا تھا۔ تب بھی وہاں سے لاہور کا فاصلہ دو تین گھنٹے کا تھا وہ آجاتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہر ہفتے لاہور فون بھی کرتے تھے۔ اب وہ امریکہ کا ٹکٹ اور ہوٹل میں بکنگ کروا کے والد صاحب اور میاں عبدالرشید صاحب کو بتانے جا رہے تھے۔

''بھائی جان میں امریکہ جا رہا ہوں۔''

وہ کہنے لگے۔ ''یہ تم امریکہ جانے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ تو ابھی تھوڑا سا سوچ لو کیونکہ حالات کچھ خراب ہو رہے ہیں اور ہو سکتا ہے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہو جائے۔''

''مگر بھائی جان میں نے تو جانے کی ساری تیاری کر لی ہے۔ امریکہ میں ہوٹلوں تک کی بکنگ ہو چکی ہے۔'' میاں صاحب پریشان ہو گئے تھے۔ ''میری تو بہت ساری ملاقاتیں طے ہیں۔''

''میرا تو مشورہ ہے تم فی الحال جانے کا ارادہ بدل دو اگر جنگ ہو گئی تو تم پھنس جاؤ گے۔ اور پھر پریشان ہوتے پھرو گے۔''

''جیسا آپ کہیں بھائی جان۔'' وہ مان گئے تھے۔ مگر ان کو یقین نہیں تھا کہ جنگ

ہو گی۔ اس وقت کشمیر میں صورت حال خراب ہو رہی تھی اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ انڈین آرمی بین الاقوامی سرحد کو عبور نہیں کرے گی۔ لیکن جیسے میاں عبدالرشید صاحب نے یہ بات کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ بالائی حلقوں میں یہ باتیں چل رہی تھیں اور لوگ کہہ رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کا امکان بہت زیادہ تھا۔اور یہی ہوا ہمارے حکمرانوں کی خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ اور بھارت نے بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حملہ کر دیا۔ اب ان کا خاندان تو سارا لاہور میں تھا اور وہ کراچی میں تھے۔ ان کو بھائی، والد اور دوسرے لوگوں کی فکر تھی۔ لڑائی کا سارا زور بھی اُس طرف ہی تھا۔ کراچی میں تو صرف ایک دن فضائی حملہ ہوا۔ اور اس کے بعد کوئی ہوائی حملہ نہیں ہوا۔ وہ سو رہے تھے۔ ان کی بیوی نے اٹھایا کہ حملہ ہو گیا ہے۔اُنھوں نے کہا۔ ”نہیں نہیں، اتنی دور کہاں آئیں گے“ وہ کہہ کر پھر سو گئے۔لیکن صبح جب اٹھے تو ساری صورت حال واضح ہوگئی۔ وہ دن بڑے کٹھن تھے، فکرمند تھے سب لوگ کہہ رہے تھے کہ لاہور کا کیا ہوگا اور یہ خبریں آ رہی تھیں کہ ہندوستان کی فوج لاہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ اور بیگم سارا دن ساری رات دیر دیر تک دنیا کے جتنے ریڈیو اسٹیشن تھے، وہ سنتے تھے کہ کون سی خبر آ رہی ہے۔ کہیں سے کوئی خبر پاکستان کی ہو۔ ریڈیو پاکستان تھا، بی بی سی تھا خاص طور پر کیا خبریں آ رہی ہیں۔ جب بی بی سی نے لاہور پر بھارتی فوج کے قبضے کی خبر نشر کی تو سب کا برا حال ہو گیا تھا مگر شکر ہے کہ یہ خبر غلط نکلی۔ اس دوران ایک بھارتی جرنیل نے بڑ ماری کہ وہ جلد لاہور پر قابض ہو کر جیم خانے میں شراب سے لطف اندوز ہوں گے۔ لیکن پاکستانی شاہینوں اور بہادر افواج نے یہ دعویٰ ریت پر لکھی تحریر ثابت کر دیا۔ پوری قوم یک جان تھی، ایک جوش، جذبہ اور ولولہ تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی غیبی قوت نے پاکستانی قوم کو ایک

لڑی میں پرو دیا ہے۔ صدر جنرل محمد ایوب خان نے اس موقع پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس تقریر نے عوامی جذبات کو جلا بخشی۔ سارا ملک بھارتی جارحیت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گیا۔ شاعر، ادیب، دانش ور، طلبہ، نوجوان، کاروباری حضرات غرض زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ بھارتی عزائم کے سامنے ہمالیہ بن کے کھڑے ہو گئے۔ 1965ء کی جنگ کے دوران ملک میں نہ صرف امن و امان تھا بلکہ نظم و ضبط بھی قابل دید تھا۔ کسی بھی شخص کو چوری ڈاکے کا خطرہ نہیں تھا۔ وائے افسوس یہ جذبہ ہم اپنی قوم میں نہ قائم رکھ سکے نہ اُسی انداز میں دوبارہ پیدا کر سکے۔ قوموں کی تاریخ میں ایسے جذبات ساز لمحات کبھی کبھی آتے ہیں۔ 1965ء کی جنگ میں لاہور کے قریب ترین صرف فیصل آباد کا ایئرپورٹ تھا بدقسمتی سے اس کا رن وے چھوٹا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اس کی فوری توسیع کا فیصلہ کیا گیا۔ رن وے کی توسیع میں فیصل آباد کے شہریوں کے ساتھ وہاں کے صنعت کاروں بالخصوص ٹیکسٹائل صنعت سے وابستہ لوگوں نے بھی مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ایک منظر تھا محمود و ایاز کا فرق مٹ چکا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان پوری رفتار سے ترقی کی شاہراہ پر چل نکلا تھا۔ اس میں 1965ء کی جنگ سے جو نقصان ہوا، وہ ٹھیک ٹھاک تھا کیونکہ جس طریقے سے انڈسٹری بڑھ رہی تھی، اگر 1965ء کی جنگ نہ ہوتی تو میاں عبدالمجید صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان نے جتنی ترقی کی ہے اس سے کہیں زیادہ ترقی ہوتی۔ سرمایہ کاری کے حساب سے اس وقت پاکستان ساؤتھ ایشیا میں ایک ماڈل کنٹری بنا ہوا تھا۔ امداد آ رہی تھی، اور ہر طرف انڈسٹری، انڈسٹری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی اور مغربی پاکستان میں بھی بے حساب صنعتیں لگ رہی تھیں۔ اب 1965ء کی جنگ سے ایک تو انڈسٹری رک گئی اور مشرقی پاکستان میں یہ احساس

شروع ہوا کہ اگر انڈیا کسی وقت حملہ کرتا ہے تو ہم اکیلے ہیں، ہمیں مغربی پاکستان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ آپ کو شاید یاد ہوگا اس وقت کے اخبارات نکال کر دیکھیں کہ ایک بہت محدود فوج مشرقی پاکستان میں تھی اور ہمیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس وقت بھی مشرقی پاکستان کو الگ کر سکتے تھے۔ مگر اس وقت ان کو کشمیر کی پڑی تھی۔ اس وقت کشمیر میں بغاوت ہو رہی تھی تو اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اور اپنی عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے اُنھوں نے مغربی پاکستان پر حملہ کیا تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب کا خیال تھا کہ بھارتی اصل میں پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ کشمیر کی تحریک کو دبایا جا سکے۔ ورنہ وہ مشرقی پاکستان پر ضرور حملہ کرتے۔ مغربی پاکستان میں بھی ہماری فوج نے ان کو زیادہ اندر آنے نہیں دیا تھا اور وہ تھوڑا بہت بارڈر کراس کر سکے تھے۔ وہ اتنا زیادہ علاقہ نہیں تھا جو اُنھوں نے لیا لیکن کشمیر میں جو بغاوت جاری تھی، وہ کچھ عرصے کے لیے دب گئی۔ ملک میں میگا پروجیکٹ بن رہے تھے، وہ سب رک گئے۔

اب انڈسٹری کی بات ہے تو انڈسٹری پر تھوڑا سا زور کم ہو گیا تھا اس کے باوجود بھی سرمایہ کاری کم نہیں ہوئی، کسی نہ کسی طریقے سے کاروبار چل رہا تھا، نئی نئی مشینیں آ رہی تھیں، ان کا کاروبار بھی اسی طرح چلتا رہا۔ ایک کام اور میاں عبدالمجید صاحب نے شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے کسی کو خیال نہیں آیا کہ اتنی بڑی انڈسٹری ہے اور اس پر سیمینار ہونے چاہئیں۔ اُنھوں نے سیمینار کروانے شروع کیے۔ وہ اس طرح سے کہ جو بھی باہر سے آدمی آتا تھا مشینری مینوفیکچر یا انسٹالیشن کرنے تو وہ اس کے لیے اس شعبے کے کراچی، فیصل آباد اور ڈھاکے میں جتنے بھی ٹیکنیکل لوگ ہوتے تھے، ان کو بلاتے تھے ایک جگہ پر لیکچر ہوتا۔ اس کے دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ جو ٹیکنیشنز

تھے ان کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا، آپس میں گفتگو ہوتی تھی، نئی ٹیکنالوجی کی مقامی ٹیکنیشین کو سمجھ آجاتی تھی۔ ان کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ان کی پبلسٹی زیادہ ہوجاتی تھی بلکہ یہ تھا کہ .AHS&Co اور ATC کمپنیاں دونوں بہت مشہور ہوگئی تھیں کہ یہی لوگ ہیں جو سارے ٹیکنیشنز کو ایک جگہ پر اکٹھا کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں اس کا تصور بہت پہلے سے تھا۔ جس طرح ورلڈ ٹیکسٹائل کانفرنس ہوتی تھی۔ اسی دوران ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ مانچسٹر کا پاکستان چیپٹر قائم ہوا۔ پاکستان میں ٹیکسٹائل کی تربیت کے ادارے نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ کا کردار بہت اہمیت کا حامل تھا۔ ادارہ تین درجوں کی تعلیم و تربیت اور اعزازی اسناد دیتا تھا۔ جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ایک سند LTI جو ڈپلوما کے برابر سمجھی جاتی تھی دوسری سند ATI یعنی ایسوسی ایٹ آف ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ جس کا درجہ ڈگری کے برابر تھا اور تیسری سند FTI یعنی فیلو آف ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ جس کا درجہ پوسٹ گریجویشن کے برابر تھا۔ یہ ساری اسناد کالجوں میں باقاعدہ پڑھنے کے بعد ملتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ٹیکسٹائل صنعت میں کام کرنے والوں کو یہ موقع بھی فراہم کرتی تھیں کہ اگر اُنھوں نے کوئی غیر معمولی کام کیا ہے وہ اسے جانچ پرکھ کر سند عطا کریں گی۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس ادارے کی سرپرستی میاں عبدالمجید صاحب نے کی اور ملک میں بڑی بڑی عالمی نوعیت کی کانفرنسیز اسی پلیٹ فارم سے ہوئیں جن میں وزرا سے وزیراعظم تک شریک ہوئے۔ ان کانفرنسوں کی سرپرستی پاکستانی ٹیکسٹائل ملز کے مالکان کشادہ دلی سے کرتے ہیں۔

ایک اہم بات جس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ جب میاں عبدالمجید صاحب تعلیم کے لیے برطانیہ گئے تو ان کا کنٹریکٹ تھا کہ اُنھوں نے واپس آکر پاکستان میں ٹیکسٹائل کالج میں پڑھانا ہے۔ مگر جب وہ واپس آئے تو ٹیکسٹائل کالج کا نام ونشان

بھی نہیں تھا۔اس لیے اُنھوں نے نوکری کرلی۔ مگر یہ کنٹریکٹ کی خلاف ورزی ہوتی۔ اُنھوں نے منسٹری آف انڈسٹری لاہور سے رجوع کیا۔ان کی طرف سے جواب آیا کہ بھئی آپ ایک خط لکھ کر ہمیں بھجوادو کہ میں واپس آ گیا ہوں اب یہاں پر تو کوئی کالج نہیں ہے، ابھی تک تو نہ بلڈنگ بنی ہے نہ ابھی تک کوئی کورسز شروع ہوئے ہیں، یہاں پر منسٹری کو ایک تاریخ دے دو کہ ایک مہینے کے اندر اندر مجھے نوکری دی جائے یا میرا جو کنٹریکٹ ہے اسے منسوخ سمجھا جائے۔ اُنھوں نے خط لکھ کر بھیج دیا۔منسٹری کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور یہ معاملہ اس طرح ختم ہوگیا۔ مگر جب بعد میں کالج شروع ہوا تو اس وقت کے پرنسپل صاحب نے پھر میاں عبدالمجید صاحب سے رابطہ قائم کیا۔

"بھئی آپ کا کیا خیال ہے۔"

اُنھوں نے کہا۔"آپ کو خود میرا خیال نہیں ہے۔"

پرنسپل ان کا دوست تھا۔ وہ بھی ان کی طرح مانچسٹر یونیورسٹی سے پڑھ کر آیا تھا۔اس نے پی ایچ ڈی کی تھی۔ اگرچہ اس طرح معاملہ ختم ہوگیا۔ لیکن اس کا احساس ان کو ہمیشہ رہا کہ اُنھوں نے سرکار کے خرچ پر تعلیم حاصل کی ہے۔اور ان کا فرض ہے کہ ٹیکسٹائل تعلیم کو بڑھانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے بعد وہ یہ کرنے لگے کہ جو ذہین طلبہ ٹیکسٹائل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مالی طور پر کمزور تھے ان کی کمپنی اس کو اسکالرشپ دیتی تھی۔ جب فیصل آباد میں ٹیکسٹائل کالج شروع ہوا تو وہاں سے جتنے بھی لڑکے پڑھ کر نکلتے تھے، وہ ان میں سے بعض کو اپنے پاس بلا لیا کرتے تھے، ان کو ٹریننگ بھی دیتے تھے۔ فیصل آباد ٹیکسٹائل کالج سے میاں عبدالمجید صاحب کو ہمیشہ ایک جذباتی وابستگی رہی۔ وہ اس کے لیے عطیات دیتے رہے۔ اب یہ ٹیکسٹائل یونی ورسٹی بن چکی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر ہیں۔ پاکستان کی انڈسٹری ترقی بھی کر رہی تھی، پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی برآمدات بھی بڑھ رہی تھیں۔ لیکن جتنی بڑھنی چاہیے تھی 1965ء کے بعد وہ نہیں بڑھی۔ اس کے بعد ان کی کمپنی کی سرگرمیاں مشرقی پاکستان میں بھی بہت بڑھ گئی تھیں۔ ایوب خان نے، اپنے اقتدار کے آخری سال میں وہاں پر دس بڑی ٹیکسٹائل ملوں کی منظوری دی تھی۔ اس وقت ٹیکسٹائل ملوں کو گورنمنٹ منظور کرتی تھی، کسی آدمی کو پرمٹ دیتی تھی ٹیکسٹائل مل لگانے کا۔ بعد میں بھی بہت عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر آدمی ٹیکسٹائل مل نہیں لگا سکتا تھا گورنمنٹ پرمٹ دیتی تھی۔ زیادہ تر منظورِ نظر لوگ ہوتے تھے ان کو پرمٹ ملتا تھا۔ جو صحیح ہوں ان کو ڈپارٹمنٹ کے ذریعے جانا پڑتا تھا۔ حکومت پاکستان نے ایوب خان کے آخری سالوں میں دس نئی ملوں کو پرمٹ دیا تھا۔ اس زمانے میں بڑی مصروفیت تھی، اس میں میاں عبدالمجید صاحب نے بھی بڑا کام کیا جو دس نئی ملیں لگنی تھیں ان کا پلان ورک کیا۔ اور جب یہ ملیں چالو ہو رہی تھیں، اس وقت ڈھاکا فال ہوگیا۔ اس وقت تک کوئی شخص جس کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ وہاں کے لوگ تھے جنھوں نے ملیں لگائی تھیں۔ ان لوگوں کو قرضے دلوائے گئے تھے۔ قرضوں کا طریقہ کار دو بینکوں کے ذمے تھا جس میں PICIC (پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن) اور دوسرا IDBP (انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک آف پاکستان) تھا۔ ان دونوں بینکوں میں ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک کے حصہ جات تھے۔ تمام بیرونی قرضے انھی بینکوں میں آتے تھے اور قرضوں کے حصول کے لیے صنعت کار انھی دو بینکوں سے رجوع کرتے تھے۔

مگر اس کام میں خاصی تاخیر کر دی گئی تھی یہ حقیقت ہے کہ جتنی ملیں مغربی

پاکستان میں لگیں اس کا آدھا بھی مشرقی پاکستان میں نہیں لگیں تھیں۔ میاں صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ طریقہ تھوڑا پہلے شروع کر دیا جاتا، اور وہاں پر تھوڑی سی اور انڈسٹریلائزیشن ہونی شروع ہوجاتی تو شاید احساس محرومی نہ ہوتا اور یوں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کم از کم موٴخر تو ضرور ہوسکتی تھی۔ شروع شروع میں جن لوگوں کو اس شرط پر پرمٹ دیے گئے کہ وہ ایک مل مشرقی پاکستان میں بھی لگائیں گے تو اُنھوں نے صرف مغربی پاکستان میں مل لگائی۔ اس طرح ادھر بہت سرمایہ کاری ہوگئی تھی، جب کہ اُدھر سرمایہ کاری کم ہورہی تھی۔ جس وقت مشرقی پاکستان سے لوگ بھاگ رہے تھے، تب بھی میاں عبدالمجید صاحب ہمت سے وہاں کام کررہے تھے۔

جاوید مجید کی پیدائش کے تین سال بعد ان کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔اس کا نام زاہد مجید رکھا گیا۔ وہ آج کل ان کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی آکسفورڈ سے گریجویشن کیا ہوا ہے۔ زاہد کی پیدائش سے پہلے ہی ان کی بیگم نے ملازمت کرنا چھوڑ دی تھی۔اب چھوٹے بچے تھے، بچوں کی دیکھ بھال میں خاصا وقت لگ جاتا تھا ملازمت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بچوں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔بیگم صاحبہ ہی ان کو اسکول لاتی لے جاتی تھیں۔ اس وقت وہ نوکر افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔مگر بعد میں جب خدا نے دولت دی تب بھی اُنھوں نے ایک دو ملازم ہی رکھے۔ آج تک کھانا گھر پر ان کی بیگم بناتی ہیں۔نوکر کبھی کھانا نہیں بناتا۔البتہ ان کی مدد ضرور کرتا ہے۔ جب ذرا پیسہ آیا تو جیسے ایک عام آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنا گھر ہو، تھوڑی سی آسودگی ہو۔ اسی دوران ایک پلاٹ لیا جس میں وہ اس وقت بھی رہ رہے ہیں، یہ ڈیفنس فیز ٹو کراچی میں ہے۔ اس مکان میں وہ 1966ء میں شفٹ ہوئے۔ یہ اسی وقت کا بنا ہے۔پلاٹ تو کوئی 1200 گز پر ہے۔ مگر تین بیڈ رومز کا مکان ہے۔ ان کی ضرورت کے لحاظ سے کافی ہے۔ مانچسٹر یونی ورسٹی میں

ان کا ایک پاکستانی آرکیٹیکٹ دوست ہوتا تھا۔ اس نے وہاں سے پڑھا تھا، وہیں سے ڈگری لی تھی۔ اس نے یہاں آ کر آرکیٹکٹ کا کام شروع کیا تھا۔ مکان کی اسی نے منصوبہ بندی کی۔ آج کل تو وہ امریکا میں ہے۔ اس نے بڑی مدد کی۔ زندگی میں راستے اسی طرح نکلتے ہیں کہ آدمی کو کوئی دوسرا آدمی ملتا ہے، وہاں دوستی ہو جاتی ہے اور دوست کہاں پر آ کر اس کی مدد کرتا ہے۔

بدلتے حالات

1970ء تک کاروبار میں ترقی ہو رہی تھی۔ ITMA نمائش پھر 1971ء میں ہونے والی تھی۔ اب دونوں اطراف یعنی جدت طرازی اور نئی مشینری کی درآمد کے سلسلے میں میاں عبدالمجید صاحب اور رفقاء نے فیصلہ کیا کہ ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ کو پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کر دیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ جدت طرازی پر توجہ دے سکیں۔ 1967ء میں کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ ہو گئی اور آہستہ آہستہ کچھ ایجنسیاں بھی ان کے نام منتقل ہو گئیں۔

ایوب خان کا زوال تو 1965ء کی جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند کی وجہ سے شروع ہوا اور پھر محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں ان کی ساکھ اور خراب ہو گئی۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان میں ان کو خاصا دھچکا لگا۔ 1965ء کی جنگ میں عام و خاص سب نے قربانیاں دیں مگر اس کا نتیجہ ثمر آور نہیں نکلا۔ اسی عرصہ میں عشرہ ترقی منایا گیا۔ جس کے دوران ڈاکٹر محبوب الحق نے ایک تہلکہ خیز مضمون اخبارات میں لکھا۔ اس مضمون سے لوگوں کو پہلی بار پتا چلا کہ ملک میں بائیس خاندان چھائے ہوئے ہیں اور ملکی صنعت پر ان کا قبضہ ہے۔ اس مضمون نے معاشرے میں کافی ہلچل مچائی۔ اسی دوران ایوب خان کے خلاف بحالی جمہوریت کی تحریک شروع ہو گئی جس میں ایئر مارشل اصغر خان پیش پیش تھے اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب بھی اس احتجاج میں

شامل تھے۔ آئے روز کی ہڑتالوں اور جلوسوں کی وجہ سے کاروبارِ زندگی ٹھپ ہو گیا تھا۔

ایوب خان کے جانے کے بعد یحییٰ خان آئے ایک اور مارشل لاء اور پھر الیکشن۔ ون یونٹ بحال کر دیا گیا۔ سیاسی بے چینی اپنی جگہ تھی اور ساتھ ہی بیروکریسی میں بھی اُکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی۔ بھلا ان حالات میں پالیسیاں کیا بنتیں۔ یحییٰ خان نے انتخابات کرائے مگر ان غیر جانبدار انتخابات کا نتیجہ ملک کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن صاحب کی پارٹیاں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ یہ دونوں سیاست دان ایک دوسرے سے متضاد خیالات کے حامل تھے۔ قومی وحدت بکھرنا شروع ہوئی، فوجی اور سول مقتدرہ نے انتخابی نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہ بحران ایک سال تک چلتا رہا۔ اہل فکر و دانش نے چپ سادھ لی۔ مغربی پاکستان کے پریس کا پروپیگنڈا ایک طرفہ رہا اور عوام کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ اور پریس یہی کہتا رہا کہ مشرقی پاکستان میں معمولی نوعیت کی شورش ہے جو جلد ہی ختم کر دی جائے گی۔

اسی دوران 1971ء کی ITMA نمائش منعقد ہوئی۔ میاں عبدالمجید صاحب کا کہنا ہے جب وہ یورپ گئے تو اُنھوں نے وہاں پاکستانیوں کے خلاف اتنی نفرت دیکھی جو ناقابل بیان ہے۔ مکتی باہنی کے حق میں مضامین اور کالم لکھے جا رہے تھے ان کے لیے چندہ جمع ہو رہا تھا، گلوکار ان کے لیے گانے گا رہے تھے، کاروباری حضرات اس صورت حال کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ حکومت نے کرنسی کی اسقاطِ زر (Demonisation) کی اور افواہیں گرم تھیں کہ بینک کے لاکرز حکومت قبضے میں لینے والی ہے۔ سب لوگ باہر سے فون کرنے لگے اس طرح یہ نمائش رائیگاں ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں پاکستانیوں کو یورپی عوام نے نفرت کے طور پر (پاکی) کہنا شروع کیا۔

یہاں سے حالات ابتر ہونا شروع ہو گئے اور فوجی آپریشن ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور یوں پاکستان دولخت ہو گیا۔

میاں عبدالمجید صاحب اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ اسلامی تاریخ کی بدترین شکست تھی۔ بالآخر فوجی حکمرانوں نے عوام کی نفرت اور اپنی ساکھ ختم ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً ایک ٹوٹی پھوٹی ریاست بھٹو صاحب کے حوالے کی۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے پاکستانیوں کا مورال بلند کیا۔ افواج پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا۔ نوے ہزار قیدیوں کو وہ واپس لائے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی سیاست میں ایک خاندانی وراثت کی بنیاد پڑی۔ جس میں ملک کی کم و بیش سب ہی جماعتیں شامل ہیں۔ وراثت کا یہ نظام بادشاہت کا ہی ایک رخ ہے۔ اکیسویں صدی میں سیاسی وراثت کے طریقۂ کار نے پاکستان اور پاکستانی معاشرے کو پیچھے دھکیل دیا ہے اور یہی امر جمہوریت کے راستے میں رُکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اب وراثت وصیتوں کے ذریعے منتقل ہو رہی ہے جس کا نتیجہ آئندہ نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں جب بھی کوئی سیاسی تبدیلی آتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ پالیسیاں اتنی واضح طور پر تبدیل ہوجاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم نئے سرے سے اپنا کام شروع کررہے ہیں۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس طرح تقسیم کے بعد ہوا تھا۔ بہت سے لوگ تباہ ہوگئے، بہت سے نئے چہرے سامنے آگئے۔ اسی طرح ڈھاکا میں بھی ہوا۔ نئے نئے لوگ دولت مند بن گئے اور جو پرانے تھے، جنھوں نے سالہا سال محنت کی وہ ختم ہوگئے۔ کوئی موجودہ پاکستان میں واپس آیا تو اس کے پاس ایک وقت کھانے کے پیسے نہیں تھے۔ جب کہ وہاں پر وہ کروڑ پتی تھا۔ تو یہ ایک المیہ ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کا خیال ہے کہ اس المیے

سے پاکستان ابھی تک نکل نہیں سکا۔ اس وقت اس کا ہمیں زیادہ احساس نہیں تھا کہ یہ کتنا بڑا المیہ ہے لیکن اب جوں جوں ہم آگے چلتے جاتے ہیں ہمیں یہ احساس شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ 71ء کے بعد نئے سرے سے، نئے پاکستان کی بنیاد ڈالی جارہی تھی۔

اس وقت بھٹو صاحب ایک طرف تو عوام کو ہمت دلا رہے تھے، دوسری طرف ان کی پالیسیوں سے جو Effect آیا اس سے ملک بہت سے بحرانوں سے دوچار ہو گیا۔ ان میں خاص طور سے نیشنلائزیشن کی پالیسیاں تھیں۔ تعلیم، صنعت اور کچھ بینکوں کو نیشنلائز کردیا گیا۔ اس پالیسی کی وجہ سے کاروباری طبقے کو بہت نقصان ہوا۔ ان میں وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو اس ملک میں صنعت اور کاروبار کے معمار تھے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے اپنی ساری زندگیاں کھپا دی تھیں۔ ساری عمر ایک کام کرتے ہیں مثلاً حبیب بہت بڑی فیملی تھی، اُنھوں نے بینک اسٹارٹ کیا، ملک کی معیشت کو سہارا دیا۔ اچانک ہی سارے بینک نیشنلائز ہوگئے۔ دوسرے دن وہ سڑک پر تھے۔ تو اس طرح اور بہت سی چیزیں تھیں، کیمیکل انڈسٹری والے تھے، جنھوں نے کام شروع کیے تھے وہ بیٹھ گئے۔ بہت سے لوگ تھے جن کی اپنی جائیدادیں تھیں، یا اُنھوں نے اپنی ساری عمر میں جو کام کیے ہوئے تھے وہ ختم ہوگئے اور ان کو نئے سرے سے اپنے آپ کو بنانا پڑا اور بہت سے نئے چہرے سامنے آئے۔ یہ نئے پاکستان کی تعمیر ہو رہی تھی۔ تو اس میں ہمیں داد دینی چاہیے، جنھوں نے اس وقت ہمت پکڑی کہ نہیں ہم نے ہار نہیں ماننی، ہمارے پاس جو بھی باقی پاکستان رہ گیا ہے، اس کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے، تو اسی جذبے کے ساتھ لوگوں نے کام کرنا شروع کردیا اور میاں عبدالمجید اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنا کام جاری رکھا اور حالات سے دل برداشتہ ہو کر ہمت نہیں ہاری۔ پاکستان کی ترقی کے لیے اب ان کو کیا کردار ادا کرنا

ہے۔ پاکستان کے معاشرے میں کیا مثبت تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے اسی حساب سے خود کو ترتیب دینا شروع کیا۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اب نئے کاروبار شروع کیے جائیں۔ جن کی ملک میں ضرورت ہے۔ معاشرہ بدل رہا تھا نئی چیزیں اور نئی صنعتیں سامنے آ رہی تھیں۔ ایک اور کمپنی گارمنٹس بنانے کی روڈلف ڈان ہل Rudulf Donhill کے نام سے شروع کی گئی۔ یہ اُس زمانے کی جدید کمپنی تصور کی جاتی تھی۔ تیسری کمپنی جو بعد میں فیصل آباد میں شروع ہوئی اس کا نام ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل انجینئرنگ تھا۔ اس کمپنی میں ٹیکسٹائل کے پرزہ جات بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے وطنِ عزیز کی سیاسی، سماجی، انتظامی اور اقتصادی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ساری دنیا میں پاکستان کے خلاف الزامات کا ایک نہ تھمنے والا طوفان تھا۔ ہماری تجارت اور برآمدات پر پابندیاں لگانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس قومی بحران سے گزرنے کے بعد پاکستان کے عوام گوناں گوں مسائل کا شکار تھے۔ خاص طور پر کاروباری طبقہ بہت متاثر ہوا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ایک نئے پاکستان کی تشکیل ہوئی۔ اس دوران حکومتی سطح پر ٹیکسٹائل سے وابستہ لوگوں کی سوچ و فکر کیا تھی اس کا اجمالی جائزہ یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی یہ تصور اُبھرنے لگا تھا کہ پاکستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے لہٰذا یہاں ایسی صنعت کا فروغ ضروری ہے جس کی بنیاد زراعت پر ہو۔ مغربی پاکستان میں کاٹن پیدا ہوتی تھی۔ کپڑا پہننے کے حوالے سے مشرقی اور مغربی پاکستان کا مزاج مختلف تھا۔ مشرقی پاکستان میں ساڑھی جیسے لباس کا رواج تھا جبکہ مغربی پاکستان میں شلوار قمیض مقبول تھی۔ ساڑھی وغیرہ ذرا عمدہ کپڑے سے تیار ہوتی تھی اور شلوار قمیض میں عام کپڑا بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ایک خلا پیدا ہوگیا۔ مشرقی

پاکستان کی مارکیٹ ہمارے ہاتھوں سے چلی گئی۔ اب یہ وہی زمانہ ہے جب نئے پاکستان کی تعمیر و ترقی کی جانب سوچا جا رہا تھا۔ پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے اقدامات ہو رہے ہیں۔ 1971ء کی بین الاقوامی نمائش کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اس نمایش میں چیکوسلویکیہ نے ایک مشین متعارف کرائی جبکہ ایٹما (ITMA) یورپ کی مشینری سے منسلک تھی اس لیے ابتدائی سالوں میں چیکوسلویکیہ کو وہ مقام نہ مل سکا جس کی توقع تھی اس کے بعد انھوں نے نئی ٹیکنالوجی سے بنی نئی قسم کی مشین مارکیٹ میں پیش کی۔ اس ٹیکنالوجی کا نام ROTOR SPINING تھا۔ 1972ء میں میاں عبدالمجید صاحب چیکوسلویکیہ گئے اور اس نئی ٹیکنالوجی کو انھوں نے ناقدانہ انداز میں پرکھا اور اسی دوران مرحوم خلیل الرحمٰن صاحب بھی اس ٹیکنالوجی کو اچھی طرح جانچ چکے تھے۔ خلیل الرحمٰن صاحب نے ایک ساتھی مرحوم رزاق وڈالا والا سے مل کر ایک نئی کنسلٹنگ کمپنی بنائی جو آج بھی قائم ہے۔ ہم یہاں میاں عبدالمجید صاحب کے مانچسٹر کے زمانہ طالب علمی کو ذہن میں رکھیں اور سقوط ڈھاکا کے بعد پاکستان کی جو صورتحال ہوئی اس کا جائزہ لیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ وہی خیالات اور سوچ ہے جو اکثر ان کا موضوع بحث رہی۔ نئے پاکستان کو تعمیر کرنے میں میاں عبدالمجید صاحب میں ایک لگن اور تڑپ تھی۔ وہ حالات اور عالمی مارکیٹ بالخصوص سقوط ڈھاکا کے اثرات کا گہرائی سے جائزہ لے رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کی مارکیٹ چھن جانے کی وجہ سے متبادل مارکیٹوں کی تلاش شروع ہوئی۔ یوں ہمیں ہانگ کانگ اور جاپان کی نئی کوالٹی مارکیٹیں ملیں۔ جاپان کی مارکیٹ کا مزاج یہ تھا کہ وہ اچھی کوالٹی مانگتے تھے۔ اس کوالٹی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئی ٹیکنالوجی کی ضرورت تھی۔ ہمارے ہاں زرمبادلہ کی سخت قلت تھی۔ ایل سی نہیں کھل سکتی تھی۔ بینک گارنٹی نہیں دیتے تھے جو

دیتے تھے ان کی گارنٹی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ مرکزی بینک کی بھی کم و بیش یہی صورتِ حال تھی۔ ان حالات میں لانگ ٹرم بنیادوں پر جاپان بھی مشینری دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس زمانے میں پاکستان نے بارٹر کے تحت روس سے مشینری درآمد کی۔ بدقسمتی سے وہ ٹیکنالوجی کوئی عمدہ قسم کی نہیں تھی اور یہاں معاملہ یہ تھا کہ ٹیکسٹائل انڈسٹری متزلزل تھی۔ قومیانے کی پالیسی نے کاروباری طبقے کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔ اب وہ کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے تھے۔ تاہم میاں عبدالمجید صاحب جیسے محبّ وطن لوگ پاکستان کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ حالات سے یہ لوگ متاثر ضرور ہوئے تھے لیکن مایوس بالکل بھی نہیں تھے۔ اس زمانے میں ایک اسکیم منظر عام پر آئی جس کا نام PAY AS YOU EARN ''کماؤ اور واپس کرو'' تھا۔ اس اسکیم کو ایک درمیانے درجے کے افسر شاہی کے اہل کار نے ترتیب دیا تھا لیکن یہ اسکیم صرف فائلوں کی حد تک تھی اسے کوئی زیادہ پذیرائی نہ مل سکی تھی۔ بعد میں یہی اسکیم پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ اب دس فیصد ڈاؤن پے منٹ پر ایل سی کھل جاتی اور مشینری پاکستان آجاتی تھی۔ سپلائی کے ایک سال بعد دس قسطوں میں رقم ادا کرنا ہوتی تھی۔ آپ نے جتنا ادا کرنا ہے اس سے ڈبل ایکسپورٹ کرنا ہے۔ اس بنیاد پر ایکسپورٹ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس ضمن میں جاپانی ٹریڈنگ ہاؤس نے ہماری خاصی مدد کی۔ جاپان نے ٹیکنیکل اور مارکیٹنگ کے شعبوں میں ہماری تربیت کی۔ جاپان کی مشینری بعض حوالوں سے یورپ سے اچھی تھی۔ اُسی زمانے میں چیکوسلوکیہ کی ایک کمپنی نے عارف صاحب کو پاکستان میں اپنی مشینوں کی ایک ایجنسی دی۔ عارف صاحب برما سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ خلیل الرحمٰن صاحب کی APC، عارف صاحب کی INVEST CO. اور میاں عبدالمجید صاحب کی کمپنی ATC نے اسی PAY AS YOU EARN

اسکیم کے ذریعے یا اس کے سہارے پاکستان میں نئی ٹیکنالوجی لانے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ مشینری کے لیے چیکوسلوکیہ، یورپ اور جاپان کی کمپنیوں کو شامل کیا گیا جن کی زیادہ تر مشینوں کو میاں عبدالمجید صاحب اور عارف صاحب نے پاکستان میں سپلائی کرنا تھا۔

میاں عبدالمجید صاحب ، ماہرین اقتصادیات اور ٹیکسٹائل امور کے ماہرین کے خوب بحث و مباحثے کے بعد اسی اسکیم کے تحت پاکستان میں روٹر اسپنگ آنا شروع ہوئے۔ اس کی فزیبلٹی APC کے ذمہ تھی۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اسکیم کاغذوں پر بہت اچھی تھی اور نئی روٹر ملز قابل عمل بھی تھیں لیکن مسئلہ گارنٹی کا تھا۔ پاکستان کے اسٹیٹ بینک کی گارنٹی مشینری فروخت کرنے والے ملک نہیں مانتے تھے۔ وہ باہر کے بنکوں کی گارنٹی لیتے تھے۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی لیکن میاں عبدالمجید صاحب اور ان کی طرح کام کرنے والے پُرامید تھے۔ وہ ان سنگ ریزوں میں سے بھی راستے تلاش کر رہے تھے۔ آخر کار کافی تگ و دو کے بعد امریکہ کے کیمیکل بینک نے معمولی رقم کے عوض گارنٹی دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اس امر سے ہماری پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ زرمبادلہ کے ذخائر مزید مستحکم ہوئے۔ عالمی سطح پر پاکستان کی ریٹنگ میں بہتری آئی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ورلڈ بینک قرضے دینے پر تیار ہوا۔ جو اس سے پہلے اس نے بند کر دیے تھے۔ لیکن اس موقع پر میں آپ کو دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ آپ سوچیں کہ ہمارے لوگوں نے کس طرح دن رات محنت کر کے پاکستان کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ یہ لوگ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ بعد میں ایشین ڈیویلپمنٹ بینک بھی پاکستان کو قرضے دینے پر آمادہ ہوا۔ جاپان سے کریڈٹ ملنے لگا۔ 1974ء تک ٹوٹل کیش لائسنس پے منٹ کی حد پانچ لاکھ تھی۔ شروع میں اس کے اندر 15 لاکھ

تک پھر 25 لاکھ اور اس کے بعد ایک کروڑ روپے تک اضافہ ہوا جو ایک وقت میں 12 کروڑ سے بھی تجاوز کر گیا۔

ایک طرف عالمی سطح پر حالات و واقعات بالخصوص اقتصادی معاملات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور دوسری طرف پاکستان کے صنعت کاروں کی تربیت اور آگہی کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ملک کے طول و عرض میں سیمینار منعقد کرائے اور ٹیکسٹائل انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کو بتایا کہ نئی مشینری لگانے سے ان کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور اس کی سروس بھی مقامی سطح پر ممکن ہو سکے گی۔ میاں عبدالمجید صاحب صنعت کاروں کی ذہنی صلاحیت اور رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ روٹر ملز کو محدود کیا گیا تاکہ وہ درمیانے درجے کے صنعت کار کے وسائل کے درمیان رہے۔ بہرحال روٹر کی پیداوار سپنڈل سے چار گنا بڑھ کر تھی۔ یہ نئی صنعت کا آغاز تھا۔ یہاں پہلی مشینری نے 75-1974ء میں کام شروع کیا۔ 81-1980ء تک روٹرز کی تعداد 1200 سے بڑھ کر 18600 تک ہوگئی یعنی 16 نئی ملز لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اسکیم کے تحت SPINDLE ٹیکنالوجی پر مبنی ملز بھی لگنا شروع ہو گئیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ 73-1972ء میں کم و بیش 2 ملین سپنڈل تھے جو بڑھ کر 1980ء تک چار ملین تک پہنچ گئے۔ بھٹو حکومت نے چار چار اور آٹھ کھڈیوں کی صنعت پر ٹیکس معاف کر دیا جس کی وجہ سے کھڈیوں کی صنعت نے بہت ترقی کی۔ یوں فیصل آباد، گوجرانوالہ، ملتان اور سکھر کپڑے کے نئے مراکز بنے۔ ظاہر ہے ان کے لیے دھاگے کی ضرورت تھی اس لیے روٹرز اور سپنڈل کی ملوں نے تیزی سے ترقی کی۔

بیرون ملک بالخصوص یورپ میں پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد رہائش پذیر تھی۔ یورپ والوں نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ ایک مخصوص حد سے زیادہ رقم اپنے

ملک ارسال نہیں کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں تارکین وطن کو بتایا گیا کہ NRIC کے تحت وہ باہر سے مشینری خرید کر پاکستان میں لگا سکتے ہیں۔ یہ ایک اچھی اسکیم تھی اس کے بعد بہت سے نئے لوگوں نے وہاں سے مشینری خرید کر پاکستان میں یا تو فروخت کی یا پھر خود لگائی۔ اس طریقے سے نئے صنعتی پاکستان کی تعمیر کا آغاز ہوا۔

نیشنل فوڈز اس وقت ایک گیراج سے شروع ہوئی تھی۔ آغاز میں اس کی سیل دس بیس ہزار روپے مہینے کی تھی۔ تو ان کو بند مسالوں کا خیال آیا۔ ابتدا میں تو اُنھوں نے یہ کام کراچی کی سطح سے شروع کیا اور آغاز میں اس میں بہت دشواری پیش آئی۔ کیونکہ اس زمانے میں لوگوں کا پیکٹ مسالہ کا ذہن نہیں تھا۔ اس منصوبے کا خیال ان کے ذہن میں نیا نہیں تھا بلکہ وہ جس وقت مانچسٹر یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے تو ایک موقع پر اس پر بات ہو رہی تھی کہ پاکستان، ہندوستان میں جتنی بھی کھانے کی چیزیں بنتی ہیں اس میں ایک کامن فیکٹر مسالے ہوتے ہیں۔ جب وہ مانچسٹر یونی ورسٹی میں طلبہ سے باتیں کرتے تھے تو بعض طلبہ نے تجویز دی تھی کہ مسالے سے آپ کام شروع کریں گے تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ یہ چیز ایسی ہے جس کی ہر وقت ضرورت پڑتی رہے گی۔

جب میاں عبدالمجید صاحب نے یہ کام کیا تو ان کے ذہن میں یہی بات تھی کہ بند مسالوں کی ضرورت ہر وقت ہوتی ہے۔ شروع میں تو اُنھوں نے صرف تین ہی آئٹم رکھے تھے، ہلدی، دھنیا، مرچیں۔ پھر اس کے بعد بہت سے آئٹم آہستہ آہستہ شامل کرتے گئے۔ آغاز میں ان کے رفقاء یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اچھی لائن نہیں ہے، اور اس کا زیادہ بہتر مستقبل نہیں ہے۔ مگر ان کی گزارش پر اُنھوں نے عمل کیا اور جب اس کام میں فائدہ دکھائی دیا تو اُنھوں نے اس کی تائید کی اور وقار حسن صاحب کو اس کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس وقت ان کے ایک اور دوست خاور

بٹ صاحب تھے۔ خاور بٹ صاحب اس وقت انگلش بسکٹ میں مینجنگ ڈائریکٹر ہیں، اُنھوں نے اس میں بڑی مدد کی بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جتنی کاوش ان کی یا وقار صاحب کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی شروع میں ان کی کاوش بھی ہے۔ اُنھوں نے مارکیٹنگ شروع کی۔ سارا پلان بنایا کہ اس کی پیکنگ کس طریقے سے کرنی ہے، کون سی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے جس کے ساتھ کام کرنا ہے، سلوگن کیا ہونا چاہیے، یہ ساری چیزیں اُنھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے کیں، بہت اچھی طرح سے اس کام کو اُنھوں نے شروع کیا۔ ہر انڈسٹری کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے، اور میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے رفقا اس سے ناواقف تھے۔ پیکنگ مسالہ ایک الگ چیز ہے۔ وہ ایک نئی شروعات کر رہے تھے۔ جس کا اس زمانے میں ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔

اس کام میں مقابلہ بہت تھا۔ ایک خاتون خانہ ہے وہ بھی آپ کا مقابلہ کرتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے گھر میں جو کچھ پکاتی ہے، جو اپنا مسالہ خود بناتی ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ کمپنی بنا رہی ہے وہ اس سے زیادہ بہتر بنا رہی ہے تو جس کو آپ ٹارگٹ کر رہے ہیں وہی آپ کا مقابل بھی ہے۔ دوسرا آپ کا مقابل وہ ہے جس کے ذریعے آپ چیزیں بیچ رہے ہیں، یعنی دُکان دار، تو دُکان دار بھی اپنے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بناتے ہیں۔ ایسا عام طور پر ہوتا تھا کہ چیزوں کے پیکٹ بنوا کر اُنھوں نے رکھے ہوئے ہیں، اور وہ اس میں اچھا خاصا نفع بھی کما رہے ہیں تو بھلا وہ آپ کا پیکٹ مسالہ کیوں بیچنے لگے۔ اب اُنھیں اس طرح سے راضی کرنا تھا کہ اُن کے کام کے ساتھ ساتھ پیکٹ مسالے کا بھی کام چلے۔ اور یہ اتنا آسان کام نہیں تھا، جب اُنھوں نے شروع کیا تھا تو اس وقت انھیں اتنا احساس نہیں تھا لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے پتا چلا یہ خاصا مشکل کام ہے۔

اس موقع پر خاور صاحب کام آئے۔ خاور بٹ صاحب نے جس طرح انھیں

گائیڈ کیا۔ خاص طور سے مارکیٹنگ میں اور جس طرح اُنھوں نے پلان کیا۔ پھر وقار صاحب نے جس طریقے سے اس کو چلایا، اس کی وجہ سے یہ کام آگے چلنا شروع ہوا۔ اس وقت میاں عبدالمجید صاحب کا کام یہ تھا کہ جتنے بھی لوگ یہ نیا کام کر رہے تھے ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تا کہ وہ پُرعزم رہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مشکلات میں آدمی تھک جاتا ہے، اس کی توجہ کام سے ہٹ کر اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے لہٰذا ان کو حوصلہ مند رکھنا ضروری ہے۔ وقار صاحب کو پُرجوش رکھنا بہت اہم کام تھا۔ وقار صاحب نیک آدمی ہیں، خاصے مذہبی ہیں۔ ان کے ایک روحانی رہنما تھے جن سے وہ اکثر اوقات استفادہ کرتے تھے جب ان کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ حضرت صاحب کے پاس جاتے۔ ایک دفعہ میاں عبدالمجید صاحب بھی ان کے پاس گئے اور ان سے عرض کی:

"میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

اُنھوں نے فرمایا:

"کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے عرض کی "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت ہم نے جس نئی صنعت کی بنیاد رکھی ہے وہ ماشاءاللہ پھل پھول رہی ہے۔ جو تجارت بھی ہے اور عبادت بھی۔"

حضرت صاحب نے فرمایا: "وہ کیسے؟"

میاں عبدالمجید صاحب نے عرض کیا:

"یہ جو ہم نے نیشنل فوڈز شروع کی ہے وہ ایک تجارت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ ہم اپنے صارفین کو خالص چیزیں دیں گے، معیار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے اور اس میں ہمیں کامیابی ملی ہے۔ میں سمجھتا

ہوں یہ آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

حضرت صاحب نے بعد میں وقار صاحب سے کہا:

"میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں آپ نے کام شروع کیا ہے۔"

تو وقار صاحب ان کو وہاں لے کر گئے اور اُنھوں نے وہاں پر جا کر دعا پڑھی۔ اور اس کے بعد وقار صاحب کو مشورہ دیا "یہ بہت اچھا کام ہے، آپ محنت کریں اللہ پاک آپ کو ترقی دے گا"

اس دعا سے وقار صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ بھی ایک طرح کی حوصلہ افزائی تھی۔ حضرت صاحب کو لوگ ماسٹر صاحب کہتے تھے وہ کراچی ہی میں رہتے تھے۔ انتہائی نیک آدمی تھے۔

جب ڈسٹری بیوشن کا مسئلہ ہوا تو ابراہیم قاسم صاحب کو ڈسٹری بیوشن کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ نیشنل فوڈ کے مسالے دکانوں پر رکھواتے تھے۔ وہ آج بھی کمپنی کے ساتھ ہی ہیں، نہ صرف ان کے ڈسٹری بیوٹر ہیں بلکہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی شامل ہیں۔ ابراہیم قاسم صاحب بھی نئے نئے مشرقی پاکستان سے واپس آئے تھے، وہ تعلیمی اعتبار سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں لیکن بہت روشن خیال۔ اُنھوں نے ڈسٹری بیوشن کا کام سائنسی انداز میں منظّم کیا۔ قدرت کا ایک نظام ہے کہ اگر آپ کی نیت صاف ہو تو آپ کو ساتھی اچھے مل جاتے ہیں۔ اس طرح سے نیشنل فوڈ کی شروعات ہوئی، اس کے بعد یہ انڈسٹری کہاں تک پہنچی۔ یہ سب کو معلوم ہی ہے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اس کو پبلک لمیٹڈ کمپنی بنا لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں بھی اس کا ایک مقام ہے اور وقار صاحب کے صاحبزادے ابرار حسن باہر سے پڑھ کر آئے تھے۔ اب وہ اس کے ہیڈ ہیں اور میاں عبدالمجید صاحب کے فرزند زاہد مجید اس کی مارکیٹنگ اور ڈیولپمنٹ کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور زاہد

مجید ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ کے مینجنگ ڈائریکٹر بھی ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کی اصل لائن ٹیکسٹائل ہے اور وہ اب بھی اس کی بہتری کے لیے سرگرم ہیں۔ ان کی کمپنی دنیا بھر سے ٹیکسٹائل کی مشینری منگواتی ہے اور اس کو یہاں پر انسٹال کرواتی ہے۔اس کے ساتھ ہی انڈسٹری کی ماڈرانائزیشن کے لیے بھی کوشاں ہے۔ موجودہ دور میں کپاس کی پیداوار کم ہوئی ہے اور بجلی کی عدم فراہمی بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بھارت اور چین ٹیکسٹائل برآمدات میں بہت تیزی سے آگے جا رہے ہیں۔ابھی بھی وقت ہے اگر اس شعبے پر توجہ دی جائے تو پاکستان نہ صرف ٹیکسٹائل میں اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے بلکہ ہم اپنی برآمدات کم سے کم دوگنی کر سکتے ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کی کمپنی کا دفتر پہلے تو محمدی ہاؤس میں تھا، بعد میں سارے دفاتر فورم میں منتقل کر دیے گئے۔ فورم آفس اے ٹی سی کا ہی ایک حصہ ہے، اسے اے ٹی سی نے خریدا تھا۔ اسی طرح لاہور میں بھی اے ٹی سی کی اپنی بلڈنگ ہے۔ جس کو گروپ کی دیگر کمپنیاں بھی استعمال کرتی ہیں۔ فیصل آباد کے دفتر کو بعد میں لاہور شفٹ کر دیا گیا۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھیوں میں سے مرحوم حفیظ الدین خان صاحب جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اُنھوں نے کاروبار کو ترقی دینے میں میاں عبدالمجید صاحب کی بہت مدد کی۔ آج کی ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ کمپنی ان کی انتھک کوششوں کی وجہ سے موجودہ مقام پر پہنچی ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب، خان صاحب مرحوم کے ساتھ اپنے گذرے ہوئے اوقات کو اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔ دونوں دوستوں کی رفاقت آج بھی ٹیکسٹائل انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کی یادوں کا حصہ ہے۔ یہ دونوں فوکس ویگن پر فیصل آباد سے بنوں تک کا سفر اکثر کیا کرتے تھے۔ جس کے دوران زیادہ سے زیادہ ٹیکسٹائل ملز کا دورہ ہوتا تھا۔ پنجاب اور سرحد کے موسم میں کافی فرق ہے

شروع میں گاڑی بغیر ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ میلوں کا سفر کر کے کسی ایک آدھ مل میں جانا ہوتا کبھی ملاقات سود مند ہوتی اور کبھی یہ لوگ بے نیل و مرام لوٹ آتے۔ ظاہر ہے ان حالات میں فرسٹریشن کا ہونا فطری امر تھا اور اسے کم کرنے کے لیے یہ اکثر لطائف اور ہنسی مذاق کا سہارا لیتے۔ بعض اوقات لوگوں پر پھبتی کستے۔

ایک دفعہ میاں عبدالمجید صاحب راولپنڈی سے لاہور واپس آرہے تھے گجرات کے قریب ریلوے پھاٹک بند تھا۔ میاں صاحب وہاں رک گئے۔ بسیں کھڑی ہوئی تھیں یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان صاحب کے خلاف بڑی تحریک چل رہی تھی۔ لوگ گاڑیوں سے اتر کر نیچے بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے اور کچھ حقّے سے شغل کر رہے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب بھی ان کے پاس بیٹھ گئے تو حفیظ الدین خان صاحب کو دل لگی سوجھی۔ دیہاتیوں سے بولے "بھئی چوہدری صاحب فصل کیسی ہو رہی ہے؟"

"او جی فصل اچھی نہیں ہے۔" اس نے رونا شروع کر دیا۔ جیسے زمیندار روتا رہتا ہے۔

حفیظ الدین خان صاحب نے ان سے کہا" دیکھو چوہدری بات کو سمجھ لو تم۔ یہ جو منگلا ڈیم بن گیا ہے۔ اس سے بجلی بنتی ہے، اب پانی میں سے ہم بجلی نکالیں تو پانی پھوکا ہو جاتا ہے۔ اب پھوکھا پانی آپ فصل کو دو گے تو فصل تو اسی طرح کی ہوگی۔"

وہ پریشان ہو گیا" اچھا خان صاحب یہ تو ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔ واہ جی واہ یہ آپ نے ہمیں نئی بات بتا دی ہے"۔

اب وہ تو وہاں سے خاموشی سے دوسری طرف ہو گئے۔ وہ سارے لوگ پھر آپس میں کہنے لگے کہ یار یہ باؤ جو بات کر رہا تھا بات تو صحیح کر رہا تھا یار اسی لیے یہ

فصلیں ہماری ٹھیک نہیں ہوتیں۔ حالاں کہ ان میں خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی تھے۔مگر وہ جاہلوں جیسی باتیں کر رہے تھے سب ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ یہ جہالت کا انداز تھا۔ جب تک ہمارے ہاں سے جہالت ختم نہیں ہوگی تب تک ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے تہیہ کیا تھا کہ ہم عام آدمی کو تعلیم دیں گے، مگر تعلیم کا یہ مقصد آج تک پورا نہیں ہوسکا اور یہ جو بھی ہماری مشکلات ہیں اس میں سب سے بڑی مشکل تعلیم کا فقدان ہی ہے۔ میاں صاحب اپنے رفقا کے ساتھ مل کر فیصل آباد میں ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ اس کے لیے آدھا ایکڑ زمین ایک جگہ لی تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب اور خان صاحب اس کی رجسٹری کروانے کے لیے فیصل آباد کے کورٹ گئے۔ گرمی بہت تھی، سب کا برا حال تھا۔ یہ وہاں پر کھڑے تھے۔ اور بھی لوگ تھے جو بے چارے زمینوں کا انتقال کروانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ سب بھی گرمی کی شکایت کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے میاں عبدالمجید صاحب سے کہا۔

"بابو جی گرمی بہت ہے اور کوئی انتظام نہیں ہے یہاں پر پنکھا نہیں ہے، نہ پینے کا پانی۔"

حفیظ الدین خان صاحب کو شرارت سوجھی بولے۔" یار بات یہ ہے کہ جو پیسے والے لوگ ہیں ان کے پاس اتنے پیسے ہیں، کہ وہ مرنے کے بعد بھی مزے میں ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، آپ جاکر دیکھو لو کہ وہ فلاں صاحب جو فوت ہوگئے ہیں ان کی اولاد نے ان کی قبر کے اندر ایئر کنڈیشنڈ لگایا ہوا ہے اور بہت مزے میں ہیں۔"

وہ بے چارے کہنے لگے" اچھا جی یہ تو ہمیں پتہ نہیں تھا۔"

اس طرح کا ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔ وہ کہیں بھی گئے شروع ہو گئے۔ اِدھر

اُدھر کی باتوں میں سے بات نکال لی۔ ایسوسی ایٹڈ انجینئرنگ کا معاملہ تھا تو اس کا بیک گراؤنڈ یہ تھا کہ حفیظ خان صاحب کہتے تھے کہ پیسے کے حساب سے ہر آدمی انڈسٹری شروع کرتا ہے اور بغیر پیسے کے کوئی کام شروع نہیں ہوسکتا؟ سوال یہ تھا کہ کیوں نہیں ہوسکتا؟۔اب اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ میاں صاحب کہنے لگے۔'' خان صاحب بات یہ ہے کہ جو چیزیں ہم بیچتے ہیں۔اگر ہم اُنھیں ملک میں بنانا شروع کردیں تو اس سے ملک کا پیسہ ملک میں رہے گا۔''

حفیظ الدین خان صاحب نے کہا'' ہاں بات تو صحیح ہے مگر اس کے لیے ورکشاپ بنانی ہوگی۔''

یہ بہت بڑا کام تھا کیوں کہ اس سے پہلے کسی نے اس انداز میں پاکستان میں ٹیکسٹائل مشینری بنانے کا نہیں سوچا تھا۔ فیصل آباد کوہ نور ٹیکسٹائل مل میں ایک فورمین ہوتا تھا چودھری نذیر۔ اس نے ایک چھوٹی سی ورکشاپ بنائی ہوئی تھی جس میں وہ بعض پرزے بناتا اور مشینوں کی مرمت کرتا تھا۔ اس چھوٹی سی ورکشاپ کو بنانے کا مشورہ اسے خان صاحب نے دیا تھا۔ اُنھوں نے چودھری نذیر سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔

''یہ جو آپ کی ورکشاپ ہے اسی سے انڈسٹری شروع کرتے ہیں۔''

اب ان کی ورکشاپ کا یہ حال تھا کہ وہاں پر کرسی وغیرہ بھی نہیں ہوتی تھی، اگر کوئی جاتا تو بنچ پر بیٹھتا تھا۔ اس نے کہا'' اچھا جی ضرور شروع کرتے ہیں''۔

کیوں کہ آغاز سادہ سی چیز سے کرنا تھا اس لیے اب سوچنا شروع کیا کہ بھئی پہلی چیز کون سی بنائی جائے۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں ایک مشین ہوتی ہے جس کا نام کارڈنگ مشین ہے، اس کا ایک کوائکر ہوتا ہے۔ پاکستان میں ان کوائکروں کی تبدیلی موڈرنائزیشن کا ایک حصہ تھا۔ نئی طرز کا یہ کوائکر چند یورپی کمپنیاں بناتی تھیں۔ بعض

اوقات ان کی سپلائی تاخیر کا شکار ہوجاتی۔ جس کی وجہ سے پوری مشین کی ماڈرنائزیشن کا عمل رک جاتا۔ طے ہوا کہ اسے بنانا ہے۔ اب ان کے پاس نہ تو اس کی ڈرائنگ تھی اور نہ اس کی تھیوری تھی۔ حالانکہ وہ مشینیں سپلائی کرتے تھے۔

چودھری نذیر صاحب نے کہا کہ مجھے ایک نمونہ دے دیں میں ہو بہو نقل کر کے کو انکر تیار کرلوں گا۔ اس طریقۂ کار کو انجینئر نگ کی زبان میں ریورس انجینئر نگ کہا جاتا ہے۔

اب ادھار کس سے مانگیں کیوں کہ ساری مشینیں پروڈکشن میں ہوتی ہیں۔ مِل پروڈکشن بند کر کے تو اپنی مشین نہیں دے سکتا، اس اہم موقع پر میاں عزیز احمد شیخ کام آئے۔ وہ کالونی ٹیکسٹائل مل کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ میاں عبدالمجید صاحب کی بے تکلفی تھی۔ وہ صاحب بہت خوش ذوق آدمی تھے، ان کو موسیقی اور مشاعروں کا شوق تھا۔ ادبی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب ان کے پاس گئے۔ ان کو ملک کی ترقی سے بہت دل چسپی تھی اور وہ ہر ایسے معاملے میں ضرور دل چسپی لیا کرتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ان کی اس دل چسپی کے لحاظ سے بات کی اور ان سے کہا۔

"میاں جی پاکستان کیسے ترقی کرے گا؟"

میاں عزیز احمد چونکے "بھئی کیوں نہیں کرے گا، ضرور کرے گا"۔

اُنھوں نے کہا" اچھا بھئی، کس طرح؟ مشینری تو آپ بناتے نہیں تو ترقی کیسے کرے گا؟"

کہنے لگے" کمال ہے یار، دیکھو ہم نے جنگ فیکٹری اپنی بنائی ہوئی لگائی ہے۔ یہ پوری جنگ مشینری ہم نے یہیں سے بنوائی ہے۔ ان کو اپنے پاکستانی ہنرمندوں پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ہنرمند بڑے کام کے لوگ ہیں۔ ان کو

صحیح سمت نہیں ملی۔ میاں عبدالمجید صاحب نے کہا۔ ''میاں جی ہم ایک مشین بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ مشین کچھ دن کے لیے اُدھار دے دیں، ہم اس کی نقل کرتے ہیں، ممکن ہے ہم اس کو یہاں بنانے میں کامیاب ہو جائیں''۔

وہ خوش ہو گئے۔ کہنے لگے'' ہاں جی اس میں کیا بات ہے، اوئے منڈیو ادھر آؤ یار ان کو بولو ایک مشین بند کر دے اور کواکر اتار کے ان کو دے دے''۔ یہ میاں عزیز صاحب کی حب الوطنی کا ایک انداز تھا۔

وہ کواکر وہاں پر لے آئے۔ اس کو اُنھوں نے کھول کھال کر اس کے پرزے آہستہ آہستہ بنانے شروع کر دیے۔ وہاں سے ایک چھوٹی سی صنعت شروع ہوئی۔ اس کے بعد تھوڑے سے پیسے آئے تو وہ اس ورکشاپ کو فیصل آباد سے تھوڑا سا باہر لے گئے۔ وہاں پر ایک عمارت بن گئی۔ اس میں پھر تھوڑی سی اور مشینیں شامل ہوگئیں۔ آخر میں جب اس کارخانے کو بند کیا تو اس سے پہلے تو وہاں پر بہت سی چیزیں بننا شروع ہوگئی تھیں اور سالانہ دو، تین کروڑ روپے کا ٹرن اوور ہوتا تھا۔ اس کا آغاز 1972ء میں کیا تھا۔ اب سے کوئی چند سال پہلے اس کو بند کر دیا گیا۔ یہ ملک کا اہم کارخانہ تھا اور اس کو بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب ان میں سے کوئی وہاں نہیں جاسکتا تھا۔ حفیظ الدین خان صاحب ریٹائر ہوگئے تھے۔ چودھری نذیر صاحب فوت ہوچکے تھے اور اس کے بعد وہاں پر کوئی جانے اور بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ گورنمنٹ آف پاکستان نے انجینئرنگ انڈسٹری کو کبھی بھی سپورٹ نہیں کیا۔ یہ صنعت شروع سے لاوارث رہی ہے۔ کئی حکومتیں آئیں، کئی حکومتیں گئیں۔ ان کا ہمیشہ رویہ یہ رہا ہے کہ چیزیں باہر سے آنی چاہئیں، کیوں کہ اس طرح ان کو کمیشن ملتا ہے، اس میں اور بھی بہت سارے معاملات آجاتے ہیں۔ قرض ملنا آسان ہوجاتا ہے۔ باہر سے جو چیز جس ملک سے آتی تھی تو اس ملک سے قرضے

ملتے تھے۔ قرضہ دینے والے ہمیشہ اپنی ہی مصنوعات کو فروغ دیتے ہیں۔

ٹیکسٹائل انجینئرنگ کے لیے کبھی مناسب پالیسی بنی ہی نہیں۔ جب کہ یہ ملک کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ انجینئرنگ انڈسٹری کے لیے جس خام مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ پاکستان ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ خام مال کی باہر سے امپورٹ کی وجہ سے مقامی مشینوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ مشینیں باہر کی مشینوں کا قیمت میں مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ایسوسی ایٹڈ انجینئرز کو بند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

اگر انجینئرنگ انڈسٹری کو آگے بڑھاتے رہتے تو ہمارے پاس باصلاحیت لوگ ہوتے، ٹھیک ہے پڑھے لکھے انجینئر نہیں تھے لیکن جو فورمین ٹائپ ہاتھ سے کام کرنے والے تھے وہ بھی کسی انجینئر سے کم نہیں تھے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ملک میں بہت ساری مشینیں بنانے کے کارخانے کام کرنے لگے تھے۔ اس سے صنعتوں کو بہت مدد ملی مگر بعد میں غلط پالیسیوں کی وجہ سے یہ سب بند ہوگئے اور ہماری صنعتیں باہر والوں کی محتاج ہوگئیں۔ ہم اپنی مشینیں باہر سے منگواتے ہیں اس لیے اسپیئر پارٹس بھی باہر سے آتے ہیں، اس کی Accessories بھی باہر سے آتی ہیں تو جن ملکوں کے ساتھ ہمارا واسطہ ہے، جن کے ساتھ ہم مقابلہ کر رہے ہیں۔ چینی اپنی چیزیں سب خود بناتے ہیں اس لیے ان کی پیداواری لاگت ہم سے کم ہے۔ یہ ٹیکسٹائل انڈسٹری کا المیہ ہے اور یہ ابھی بھی اسی طرح چل رہا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ٹیکسٹائل انڈسٹری مقابلہ نہیں کرسکتی تو اس میں یہ بھی ایک فیکٹر ہے۔ ہمیں مشکل آرہی ہے اور یہ آتی رہے گی یہ مشکل ختم نہیں ہوگی۔ ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل انجینئرز کے علاوہ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک ربر کی فیکٹری جس کا نام پریسین ربر پروڈکٹس (Precision Rubber Products)

خریدی اور اس کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ یہ کمپنی ٹیکسٹائل کے لیے ربر کے پرزہ جات بناتی ہے۔ آج کل اس میں دوسری صنعتوں کے لیے بھی سامان تیار ہوتا ہے یہ کمپنی کراچی کورنگی کے صنعتی علاقے میں ہے۔ ایک اور کمپنی جو گروپ میں شامل کی گئی تھی اس کا نام پاکستان کارڈ کلودنگ کمپنی تھا۔ خریداری کے وقت اس کی حالت کافی خراب تھی۔ اس کو جدید انداز میں سیٹ کیا گیا ہے۔ کچھ سال پہلے کمپنی کے حصے فروخت کر دیے گئے ہیں یہ کمپنی لاہور کے قریب مرید کے میں واقع ہے۔

نیشنل فوڈز اس مقام پر کھڑی ہے کہ وہ ایک ٹیک آف اسٹیج ہے۔ اب ایک ملٹی کیٹگری کمپنی ہے۔ اس میں صرف مسالے نہیں بنتے ہیں جس سے میاں صاحب نے کام شروع کیا تھا، اب اس میں اور بہت سی چیزیں آ گئی ہیں۔ اس میں نمک کا ایک شعبہ ہوتا ہے، اچار کا الگ شعبہ ہے، اس میں مکس مسالے ہیں، وہ ایک الگ شعبہ ہے، اس میں ٹماٹو کیچپ شامل ہے، اس میں جیم جیلیز شامل ہیں، کھیر بھی شامل ہے، کسٹرڈ بھی شامل ہے۔ ریڈی ٹو ایٹ کھانے بھی متعارف کرائے ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کا خیال ہے کہ ماشاء اللہ بچے جس طرح کام کررہے ہیں اسی طرح کام کرتے رہیں تو نیشنل فوڈز ملٹی نیشنل انڈسٹری کے طور پر ابھرے گی کیونکہ ان کا امیج ٹھیک ہے، ان کا ''لوگو'' سب کا جانا پہچانا ہے۔ پاکستان میں اور باہر بھی سب نیشنل فوڈ سے واقف ہیں۔لوگوں کو پتا ہے معیاری مصنوعات بنتی ہیں۔ اُنھوں نے معیار پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ بہتر سے بہتر مسالے استعمال کریں۔ نیشنل فوڈ کی ترقی کا راز ہی یہ ہے۔

ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ چونکہ ٹیکسٹائل انڈسٹری آف پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے اس لیے اس کے کاروبار میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔اکہتر کے بعد دوسرے کاموں کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں ایک چیز کے اوپر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ

نیشنل فوڈ کے توسط سے بڑی حد تک پورا ہوگیا تھا۔ جب ایسوسی لیٹڈ کا بزنس پورا نہیں ہوتا تو نیشنل فوڈز کا بزنس چلتا رہتا ہے اور ان کا کام بھی۔ اسی طرح جب سرمایہ کاری آتی ہے، ماڈرنائزیشن ہوتی ہے، نئی مشینیں لگتی ہیں تو اس سے کام میں بھی تیزی آتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بھی اچھا ہی چل رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اب اس میں بھی زاہد صاحب نئی چیزیں لے کر آرہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹیکسٹائل کی حالت اچھی نہیں ہے مگر ایسوسی ایٹڈ ٹیکسٹائل کنسلٹنٹ کا کام صحیح ہی ہے۔ اس کی ایک ساکھ ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے Havard یونی ورسٹی میں Management کورسز کیے۔ اس دوران دنیا بھر سے آئے ہوئے درمیانے درجے کی صنعتوں کے مالکان اور Professionals سے ملاقات اور ساتھ ہر سال 3/4 ہفتے گزارنا ایک ایسا تجربہ تھا جس کی وجہ سے میاں عبدالمجید صاحب کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ یہ علم انھوں نے اپنی کمپنیوں کی بہتری کے لیے استعمال کیا اور اُن کو تبدیلی کی راہ پر گامزن کیا۔ ایک مرتبہ میاں عبدالمجید صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کوئی ایک نکتہ بیان کر سکتے ہیں جس سے آپ کے کاروبار کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا ہو۔ تو اُن کا کہنا تھا کہ Succession Plan (منصوبہ منتقلی) یعنی نئی نسل کو منصوبہ بندی اور کامیابی سے کاروبار میں شامل کرنا اور کاروبار اُن کے حوالے کرنا۔ اُن کے خیال میں پاکستانی کاروبار اور صنعتوں میں Succession Plan (منصوبہ منتقلی) نہ ہونے کی وجہ سے بہت نقصان ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ غور طلب ہے اور اس پر تحقیق ہونی چاہیے۔ پاکستان نے شروع کے سالوں میں نئے نئے کاروبار اور صنعت کار پیدا کیے جن کو حکومتی اداروں کی سرپرستی ملی اور ملکی سرمایہ اُن کو مہیا کیا گیا۔ آج اُن میں سے بہت سے ادارے اور کاروباری حضرات تاریخ کے صفحات میں باقی ہیں۔ دُنیا کے

ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک میں کاروبار کی بنیاد ایک نسل رکھتی ہے اور اگلی نسلیں اُس کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔

جب میاں عبدالمجید صاحب اور وقار صاحب نے نیشنل فوڈز شروع کی تو خاور بٹ صاحب اس وقت انگلش بسکٹ میں کام کرتے تھے وہ وہاں پر منیجر تھے۔ بعد میں وہ نیشنل فوڈز کے شیئر ہولڈر اور مارکیٹنگ ڈائریکٹر بنے۔ بہت سال تک مارکیٹنگ ڈائریکٹر رہے۔ وقار صاحب نے اَراق (ARAQ) فیملی سے اُن کی نیشنل فوڈز کے ساتھ کام کرنے کی اجازت لی تھی۔

ان دنوں میاں عبدالمجید صاحب کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں اس لیے لاہور جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ والد صاحب اب یہ کرتے تھے کہ چھوٹی عید پر ہر سال کراچی آجاتے تھے۔ آخری روزے ان کے ساتھ رکھتے تھے، عید ساتھ گزارتے تھے اور اس کے بعد وہ لاہور واپس چلے جاتے۔ شروع میں تو وہ ٹرین کے ذریعے آتے جاتے تھے پھر جب میاں صاحب کے حالات اچھے ہو گئے تو وہ ان کو ایئر ٹکٹ بھیج دیا کرتے تھے۔ اس طرح بڑی عید کے بعد یا اس دوران میں میاں عبدالرشید صاحب آتے تھے۔ اور میاں صاحب کے ساتھ کچھ دن گزارتے تھے۔ 29 جولائی 1972ء میں جب والد صاحب کی وفات ہوئی تو میاں عبدالرشید صاحب سال میں دو بار آنے لگے۔ یعنی والد صاحب والی جگہ بھی اُنھوں نے سنبھال لی تھی۔ ان کی یہ شفقت آخر تک جاری رہی تھی۔

1973ء میں خالد حسین صاحب نے علیحدگی کی بات کی اور اپنے فیصلہ کو حتمی قرار دیا۔ اتنے پرانے تعلقات بہ یک جنبش قلم ختم تو نہیں ہو سکتے تھے بہر حال میاں عبدالمجید صاحب اور وقار حسن صاحب نے باہمی رضامندی کے ساتھ فیصلہ کیا کہ ہم علیحدہ ہو جاتے ہیں لیکن باہر کے کسی آدمی کو ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں

کرنے دیں گے۔ خالد حسین صاحب نے .AHS & Co اور RUDOLF DONHILL کو اپنے لیے مانگا۔ جب کہ میاں عبدالمجید صاحب اور وقار حسن صاحب کے پاس ATC، نیشنل فوڈز اور فیصل آباد کی انجینئرنگ کمپنی آئی۔ تاہم خالد صاحب کے ساتھ تعلقات ان کی وفات تک ہمیشہ اچھے اور خوش گوار رہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں کہ خالد صاحب ان کی پاکستان واپسی اور ترقی کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ہیں۔ حق ان کی مغفرت کرے۔

سوچتا ہوں میں

میاں صاحب کیوں کہ ٹیکسٹائل کے آدمی ہیں۔ اس لیے ان کے پسندیدہ رنگ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ٹیکسٹائل تو نام ہی رنگوں کا ہے۔اور فیشن میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔جب ٹیکسٹائل ذرا کم ہوئی تو اُنھوں نے رفقا کے ساتھ ریڈی میڈ گارمنٹس انڈسٹری شروع کرنے کا سوچا۔میاں عبدالمجید صاحب اس کی تحقیقات میں پڑ گئے۔کہ اس کا رنگ ڈھنگ کیا ہے۔ان کو یہ معلوم ہوا کہ دیکھو دنیا میں رنگ ہی سب کچھ ہے۔فرض کریں آج ہم بیٹھے ہیں 2008ء میں۔تو 2008ء میں رنگ Decide ہوجائے گا کہ 2010ء کا جو فیشن ہے، اُس کا رنگ کون سا ہونا ہے اور پھر اس کا امتزاج کیا ہونا ہے اور پھر کیمیکل انڈسٹری اسی رنگ کے ساتھ میچ کرتی رہتی ہے۔ سارا کام ایک حساب کتاب سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے حساب سے فیشن ہاؤسز چلتے رہتے ہیں۔دنیا میں ہر طرح کا رنگ ہے مگر میاں صاحب کو ذاتی طور پر براؤن زیادہ پسند ہے۔وہ لباس بھی اسی رنگ میں پسند کرتے ہیں۔کام کے دوران وہ پینٹ شرٹ اور گھر میں شلوار قمیص پسند کرتے ہیں۔ شلوار قمیص آرام دہ لباس ہے۔ شام کو خاص طور پر گھر پر چھٹی والے دن شلوار قمیص ہی پہنتے ہیں اور رمضان کے دنوں میں تو شلوار قمیص کا استعمال زیادہ ہوتا ہے لیکن ورکنگ ڈریس پتلون کوٹ وغیرہ ہی پہنتے ہیں اور بزنس ڈریس بھی یہی ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کی ایک بہت بڑی خواہش ملک میں معیار تعلیم کو بہتر بنانا ہے۔اس کے لیے وہ دل میں بھی بہت ساری خواہشات رکھتے ہیں اور عملی طور پر بھی اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

وہ سب سے زیادہ کس کو یاد کرتے ہیں؟۔ان کا کہنا ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف لوگ یاد آتے ہیں۔ خیر والدین تو ہمیشہ ہی یاد آتے ہیں۔کوئی دن ان کی یاد سے خالی نہیں جاتا۔ میاں عبدالرشید صاحب کی یاد بھی آتی رہتی ہے۔کہتے ہیں کہ انسان زندگی میں کسی مقام پر پہنچ جائے، کتنا ہی بڑا ہوجائے، عمر کے کسی حصے میں چلا جائے، جب اپنی ماں کو یاد کرتا ہے تو اندر سے آہ نکلتی ہے۔ ان کو آج تک افسوس ہے کہ ان کو اپنی ماں جی کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں ملا وہ ابھی سترہ سال کے۔ اسٹوڈنٹ تھے جب وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔افسوس کافی ہے۔ ہم جس عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں، آنا جانا تو سب نے ہی ہے، وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ ہر وقت ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے۔ بس یہ کہ تھوڑی سی خاص حسرت ناتمام ہے۔ماں باپ کی اور خدمت کر لیتے تو اچھا تھا۔

شادی ایک بندھن کا نام ہے اور اگر اس رشتے میں خلوص نہ ہوتو یہ بے معنی ہو جاتا ہے۔میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ اگر چالیس پچاس سال گزار لیں تو ان میں من و تُو کا فرق ہی مٹ جاتا ہے۔ اتنا عرصہ گزارتے ہی وہ لوگ ہیں جن کے درمیان محبت اور خلوص کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ گزرے سالوں میں ان کو محسوس کرنے کا موقع کم ملا تھا۔کہ زندگی کیسی خوب صورت ہوتی ہے۔آج وہ اس کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے یہ اس کا انعام ہے۔ انسان کام کرتا ہے،شادی کرتا ہے،بیوی بچے ہوتے ہیں۔ زندگی میں کئی موڑ آتے ہیں اس میں آپ کو ترقی کے مواقع ملتے ہیں۔ کچھ لوگ ان سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں، کچھ نہیں

اُٹھا پاتے۔ تو جو لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں۔

جب وہ اپنی ہونے والی بیوی سے ملے ان کے مزاج کو سمجھا تو اُنھوں نے سمجھا کہ اس خاتون کے ساتھ میری زندگی اچھی بسر ہوسکتی ہے۔ اُنھوں نے فیصلہ لیا اور اس فیصلے پر ان کو آج تک ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ اور 2010ء میں ان کی شادی کو 50 سال ہوجائیں گے۔ ان کو لگتا ہے یہ 50 سال کی زندگی جیسے پلک جھپکتے گزر گئی ہو۔ وہ تو اپنے ملک میں آگئے تھے۔ ان کے سارے بہن بھائی، جتنے رشتے دار تھے، سب ان کے پاس تھے۔ ان کا اپنا کلچر تھا۔ مگر بیوی تو برطانیہ کی تھیں۔ نہ زبان اپنی نہ رواج اپنا نہ رشتے دار اپنے اور نہ ماحول اپنا۔ اس پر بھی اس نیک بی بی نے خود کو جس طرح ایڈجسٹ کیا۔ اپنے آپ کو اس کلچر میں اور ان کے خاندان میں سمو دیا۔ ان کی مدد کرنے میں یا دوسرے غریب لوگوں کے بھی کام کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب اور سب کے دل میں اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔ یہ ان کی ذاتی خوبی تھی ورنہ ایسا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ آپ اپنا مقام اپنے ملک میں ہی حاصل کرسکتے ہیں، دوسرے ملک میں بھی آپ یہ کام کرسکتے ہیں۔ اب ان کی اتنی ہی عزت ہے، جتنی کہ میاں صاحب کی۔ ان کو بھی لوگ پہچانتے ہیں، کیوں کہ وہ ایک فلاحی ادارے میں کام کررہی ہیں۔ معاشرے میں ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے خلوص اور محنت کا صلہ ہے۔ جہاں تک میاں عبدالمجید صاحب کی ذاتی زندگی کا سوال ہے۔ تو ان کا کہنا ہے: ”اگر میری اہلیہ نہ ہوتیں تو میں نے اس وقت جو مقام حاصل کیا ہے یا میں جس مقام پر پہنچا ہوں وہاں شاید نہ پہنچ پاتا۔ میری کامیابی میں جتنا اہم میرا کردار ہے اتنا ہی بلکہ شاید اس سے زیادہ ان کا کردار ہے۔“

بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معیار ان کے والد صاحب نے بنا دیا تھا اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب سے وعدہ لیا تھا۔ کہ جتنی اُنھوں نے تعلیم اپنے مشکل حالات میں میاں عبدالرشید صاحب کو اور میاں عبدالمجید صاحب کو دلوائی تھی اس سے زیادہ تعلیم وہ اپنے بچوں کو دِلوائیں گے ۔ یہ اُنھوں نے ان سے عہد کیا ہوا تھا اور یہ عہد ہمیشہ ان کے ذہن میں رہا تھا۔ کہ والد صاحب سے اُنھوں نے ایک عہد کیا ہے اور میاں صاحب کو اس عہد کو پورا کرنا ہے۔ اب اس عہد کو پورا کرنے کے لیے بہت سی دشواریاں آئیں۔ جاوید مجید جو اُن کا بڑا بیٹا ہے وہ یہاں کراچی گرامر اسکول میں پڑھ رہا تھا وہ شروع میں اچھی پوزیشن لیتا رہا۔ اسکول کا معیار گرنا شروع ہوا اس وجہ سے وہ پریشان ہو گئے کہ کہیں بچے کی ذہانت زنگ آلود نہ ہو جائے۔ ان دنوں میاں عبدالمجید صاحب کے کچھ دوست برطانیہ میں تھے ان سے مشورہ کیا گیا کیونکہ کہ مشینری کے سلسلے میں وہ وہاں جاتے رہتے تھے، ان کے جاننے والوں میں مینوفیکچرر، یونیورسٹی کے اساتذہ اور کچھ ذاتی دوست بھی تھے ۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ ایسا کریں جاوید مجید کو تعلیم کے لیے برطانیہ بھجوا دیں۔ وہ یہاں پر اچھی تعلیم حاصل کرئے گا۔ اس کے بعد میاں عبدالمجید صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ جاوید کو تعلیم کے لیے برطانیہ ہی بھجوائیں گے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے جس اسکول کا انتخاب کیا وہ لندن سے باہر تھا اور پبلک اسکول تھا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے اس فیصلے کی تائید حفیظ خان صاحب نے بھی کی جو اس وقت ان کے ساتھ برطانیہ کے دورے پر تھے۔

پھر میاں عبدالمجید صاحب نے اپنے سسرال والوں سے بات کی۔ اُنھوں نے بھی تائید کی۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جاوید کو کس اسکول میں داخل کرایا جائے۔ اس کے لیے وہ اور حفیظ الدین صاحب مختلف پبلک اسکولوں کا وزٹ کرتے رہے۔ ایک

اسکول میں وہ گئے تو وہ ان کو بہت اچھا لگا۔ جاوید اس وقت بارہ تیرہ سال کے تھے۔ اسکول کا نام ریپٹن (Repton) تھا۔ حفیظ الدین خان صاحب کہنے لگے" میاں صاحب اسے یہاں داخل کر دیں۔ اسکول کی عمارت خوب صورت اور سارا ماحول اچھا ہے۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا" فیصلہ ہوگیا، ٹھیک ہے میں واپس جا کر جاوید کو برطانیہ بھیجتا ہوں۔ اُنھوں نے واپس آ کر اپنی بیوی سے بات کی" میں سوچ رہا ہوں کہ جاوید کو انگلینڈ بھیج دوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ کوئی ماں اپنے بچے کو اپنی نظر سے دور نہیں دیکھ سکتی، "نہیں اسے یہیں پڑھنے دیں۔"

"اس میں ہرج کیا ہے؟" وہ بولے۔

"میں بچے کو اپنی نظر سے دور نہیں کر سکتی۔"

میاں عبدالمجید صاحب کو یاد آیا جب وہ اسکول کی تعلیم کے لیے لاہور جا رہے تھے تو ان کی والدہ صاحبہ نے بھی اسی طرح کیا تھا اور ان کے والد نے کہا تھا۔" اس کو اگر اپنے زانوں کے ساتھ ہی لگا کر بیٹھی رہو گی تو یہ کیسے ترقی کرے گا"

یہ بات اُنھوں نے اپنی بیوی کو بتائی اور بولے۔" ذرا سوچو اگر میرے والد میری والدہ کی بات مان جاتے تو آج میں اسی گاؤں میں ہوتا ممکن ہے کہیں استاد بن جاتا۔ اگر ہم اپنے بچے کو خود سے دور نہیں کریں گے تو یہ کیسے ترقی کرے گا"۔

اس طرح سے وہ مان گئیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے جاوید کو برطانیہ بھجوا دیا۔ اُنھوں نے وہاں خاصا استفادہ حاصل کیا۔ او لیول اور اے لیول اچھے نمبروں میں پاس کیا۔ اس کے بعد آکسفورڈ میں ان کو داخلہ مل گیا۔ اُنھوں نے بہت اچھی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد زاہد کا وقت آیا۔ اُنھوں نے بھی باہر پڑھنے کی ضد کی تو

میاں عبدالمجید صاحب انھیں نہیں روک سکتے تھے۔ دو سال کے بعد وہ بھی اسی اسکول چلے گئے۔ اب یہ دونوں میاں بیوی یہاں پاکستان میں تھے اور دونوں بچے برطانیہ میں۔ خیر وہ بھی ایک اچھا تجربہ تھا کہ آدمی کو آخر میں اکیلے ہی رہنا ہوتا ہے، بچے آپ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے۔ البتہ بچوں کی یاد بہت آتی تھی۔ زاہد بھی وہاں چلے گئے۔ جاوید کے مقابلے میں انھیں تعلیم میں کوئی پریشانی نہیں تھی وہ یہاں بھی بہت اچھے طالب علم تھے۔ اس اسکول میں بھی اُنھوں نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ وہ پہلے غیر یورپین لڑکے تھے جو ہیڈ آف دی اسکول منتخب ہوئے۔ پھر انھیں بھی آکسفورڈ میں داخلہ مل گیا۔ یوں دونوں بھائی آکسفورڈ میں زیر تعلیم رہے۔ زاہد نے میاں صاحب سے کہا۔ ''گریجویشن کرنے کے بعد میں واپس آجاؤں گا۔''

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا'' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، اپنا کیریئر چُننا تمہارا اپنا کام ہے۔''

یوں زاہد واپس آگئے اور میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے۔ جاوید انگلش لٹریچر میں پی ایچ ڈی اور درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ جاوید آج کل برطانیہ ہی میں آباد ہیں۔ اُنھوں نے وہیں شادی کی اور ان کے دو بیٹے ہیں۔ ایک آٹھ سال کا، دوسرا دس سال کا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ جاوید مجید اسکول کی چھٹیوں میں کراچی ہی میں تھے اور میاں عبدالرشید صاحب بھی لاہور سے کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میاں عبدالرشید صاحب نے اس وقت جاوید مجید کو شاعر مشرق علامہ اقبال کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد کے بارے میں تفصیلی طور پر بتایا اور خطبات کا ایک نسخہ بھی جاوید کو تحفے میں دیا۔ میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں کاش آج میرے بڑے بھائی عبدالرشید صاحب زندہ ہوتے تو دیکھتے جس بھتیجے کو اُنھوں نے اقبالیات کا راستہ دکھایا واقعی وہ آج

عالمی سطح پر اقبالیات کا اسکالر ہے۔زاہد کا ایک ہی بیٹا ہے، وہ بارہ سال کا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کا خیال ہے کہ ان پر ایک فرض تھا وہ ادا ہوگیا۔

اگلی اور پچھلی نسل کا درمیانی آدمی سب سے اہم اور مشکل پوزیشن میں ہوتا ہے۔وہ خود اپنے والدین سے الگ ہوئے تھے ان سے دور ہو گئے تھے۔پھر ان کی اولاد ان سے جدا ہوئی اور ان سے دور آباد ہوئی تو ان کے خیال میں یہ معاشرے کا ایک چکر ہے جو سدا سے چلتا آیا ہے اور ہمیشہ چلتا ہی رہے گا۔ کچھ عرصے بعد وہ آخری نسل ہو جائیں گے اور ان کے بچے ان کی جگہ سنبھال لیں گے۔ انسان کی زندگی میں کچھ چیزیں آتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب آپ اپنی زندگی کو بنانے میں مصروف ہوجاتے ہیں تو والدین کے ساتھ اتنا رابطہ نہیں رہتا۔لیکن جس وقت آپ اپنی زندگی میں ایک مقام تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر یہ رابطہ بحال ہو جاتا ہے۔اُنھوں نے زندگی میں یہی دیکھا۔وہ خود اتنے مصروف رہے کہ ماں باپ سے زیادہ رابطہ نہیں رکھ سکے مگر جب وہ سیٹ ہو گئے تو ملنا جلنا پھر سے ہوگیا تھا۔اب ان کے بچے ان کے خاصے قریب ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی نہیں چاہا کہ ان کے بچے بھی وہی کریں جو وہ کرتے رہے تھے، اس کے بجائے اُنھوں ان کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا۔ جاوید مجید نے تدریس کا پیشہ چُنا تو وہ خوش تھے ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کی ہے اور یہ تو ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ جاوید مجید ریسرچ کا کام بہت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ”نہرو، گاندھی اور ڈاکٹر اقبال“ پر ہے۔ اقبال ہی پر حال ہی میں نئی دہلی کے ایک بڑے پبلشر نے ان کی کتاب چھاپی ہے۔ وہ مختلف بین الاقوامی مجلّوں میں تحقیقی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ زاہد مجید کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔نئی نئی چیزوں کے جاننے کے متعلق ان کا ذہن

بہت زرخیز ہے۔ بنیادی طور پر وہ کاروباری ذہن رکھتے ہیں اور کاروبار کو جدید سائنسی خطوط پر استوار کر رہے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کا کافی وژن (Vision) ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کے خیال میں خواب انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر وہ خواب نہیں جو انسان سوتے میں دیکھتا ہے بلکہ وہ خواب جو انسان جاگتے میں دیکھتا ہے جن کو عرف عام میں آئیڈیالوجی بھی کہتے ہیں۔ ہر انسان ایسے خواب دیکھتا ہے مگر کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جن کے خواب پورے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی دی ہوئی توفیق ہوتی ہے کہ وہ جسے چاہے اپنے کام کے لیے استعمال کر لے۔ اور اللہ کی توفیق کے لیے ضروری ہے کہ اس سے دعائیں مانگتے رہیے۔ میاں صاحب بھی اس کے قائل ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعائیں مانگتے ہیں۔ اپنے لیے بھی اور باقی سب لوگوں کے لیے بھی۔

میاں عبدالمجید صاحب کے نزدیک یہ بھی اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ وہ انسان کو فرصت کے لمحات دیتا ہے۔ ایک وقت کسی انسان کی زندگی میں ایسا بھی آتا ہے جب اُسے کمانے کے لیے تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ کاروبار یا کام ایک خاص سطح پر آجاتا ہے۔ معاشرے میں بچّے اپنا مقام حاصل کر لیتے ہیں تو وہ سب اپنی جگہ پر مصروف ہو جاتے ہیں۔ فرصت کے ان لمحات میں انسان نے جو کام نہیں کیے ہوتے وہ اپنی زندگی کے اس حصے میں انھیں ترجیحی بنیادوں پر کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان پر توجہ بھی دے سکتا ہے، اپنا سرمایہ بھی خرچ کر سکتا ہے اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار بھی لا سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک دین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک جگہ پر پہنچا دیا جہاں پر کاروبار میں آپ کی ذاتی طور پر اتنی ضرورت نہیں ہے۔ کمانے کے لیے تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔

میاں عبدالمجید صاحب اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کی طرف

زیادہ توجہ دے رہے ہیں جن کا ان کو شوق ہے۔ دولت اللہ تعالیٰ نے دی ہوئی ہے اور موقع بھی دیا ہوا ہے اور یہ موقع ہر انسان کو نہیں ملتا تو اس لیے اس موقع سے جہاں تک ہوسکتا ہے وہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دو چیزیں جو شروع سے ان کے پیش نظر تھیں مگر حالات کی وجہ سے پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ان میں ایک تعلیم عام کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ رہا کیونکہ انسان تعلیم کے بغیر نامکمل ہے۔ اور ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے جس وقت فرشتوں سے فرمایا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ تو آدم علیہ السلام کو جو فضیلت ملی وہ علم ہی کی وجہ سے ملی۔اس کے بعد جتنے نبی آئے یا جو رسول آئے ان سب کی فضیلت علم کی وجہ سے تھی جو اُن کو اللہ نے عطا فرمایا۔ علم حاصل کرنا میاں عبدالمجید صاحب کے نزدیک لامحدود ہے یعنی اس کا کوئی آخر نہیں ہوتا۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی ہوں، جہاں بھی جائیں۔ کہیں سے بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل ہو رہا ہو تو اس کو حاصل کرنا چاہیے۔وہ اپنے بزنس کے دور میں دو، تین سال ہاورڈ یونی ورسٹی جاتے رہے تھے ۔اور میاں عبدالمجید نے تمام مصروفیات کے باوجود کاروبار کے کورس کیے تھے۔ مینجمنٹ اور مارکیٹنگ کے شارٹ کورسز شامل ہیں۔ جب بھی موقع ملا، کسی لیکچر کا اہتمام کر لیا، سب لوگ ان سے یہ کہتے ہیں کہ آپ کا تو شوق ہے سیمینار کروانا، ہر وقت سیمینار کرواتے رہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپ کا کام ہے کانفرنسز میں شریک ہونا، ٹیکسٹائل انڈسٹری کی جتنی بھی کانفرنسیں ہوتی تھیں ۔ انٹرنیشنل کانفرنسوں میں میاں عبدالمجید صاحب تحقیقی مقالات پڑھتے تھے جو زیادہ تر ٹیکسٹائل صنعت ہی کے متعلق ہوتے تھے۔ ان کانفرنسوں کے ٹیکسٹائل صنعت پر دور رس اثرات مرتب ہوتے تھے۔

جس معاشرہ کے پاس علم ہوتا ہے وہی ترقی کرسکتا ہے ورنہ معاشرہ پیچھے رہ

جاتا ہے۔ اس کی مثال ہم خود ہیں، ہمارا اپنا معاشرہ ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کی تعلیم آج بھی جاری ہے۔ اب بھی جہاں کہیں موقع ملتا ہے، علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے جہاں بھی موقع ملتا ہے اس کو بڑھاتے ہیں۔ یہ اب زندگی کا ایک مقصد بن گیا ہے۔ اس میں ٹیکسٹائل، اسکولوں اور تعلیم بالغاں کی تعلیم بھی شامل ہے۔

1960ء میں جب وہ نئے نئے آئے تھے۔اور کمپنی جوائن کی تھی تو اس کے فوراً بعد اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان کی کمپنی میں جو بھی آدمی کام کرے گا، خواہ وہ چپراسی ہو، اپنی تعلیم کے لیے کوشاں ہے تو اس کو کتابیں اور اس کی فیس کے پیسے کمپنی دے گی۔ آج بھی یہ اصول برقرار ہے۔جو ملازم پڑھنا چاہتا ہے اس کی فیس اور کورس کمپنی کے ذمے ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان کی جو بھی کمپنی ہو اس کو ایک انسٹیٹیوشن کے طور پر آگے لے جایا جائے۔ انسٹیٹیوشن کا مطلب ایک دریا ہے اس میں لوگ آتے ہیں، سیراب ہوتے رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں دریا چلتا رہتا ہے۔ نت نئے لوگ آکر اس سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ مغرب میں اکثر کمپنیاں اس روش کو اپناتی ہیں مگر ہمارے ہاں شاذ ہی ایسا ہوتا ہے۔ہماری کمپنیوں کا مقصد شارٹ ٹرم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کمپنی تھوڑی دیر کے بعد ختم ہوجاتی ہیں۔ کمپنیاں جو اگر انسٹیٹیوشن کے طریقے سے چلائی جائیں تو کمپنیاں بھی چلتی رہتی ہیں، اس کا نام بھی چلتا رہتا ہے، انسٹیٹیوشن بھی چلتا رہتا ہے۔ آج بھی میاں عبدالمجید صاحب کی کمپنیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ان کے جتنے بھی ملازمین ہیں ان کو وہ موقع دیتے ہیں کہ آپ اپنی نالج بڑھانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔ ان کی فیسیں اور ان کے اخراجات بھی ادا کرتے ہیں۔ ان کو چھٹیاں بھی دیتے ہیں اور پوری تنخواہ بھی۔ان کے پاس

کئی اکاؤنٹینٹ ہیں، وہ آئی سی ایم اے کر رہے تھے۔ اُنھوں نے امتحان یہاں کام کرتے ہوئے دیے۔ میاں صاحب ان کی بھاری فیسیں دیتے رہے اور جب ان کو ڈگری مل گئی تو وہ اچھی جگہ چلے گئے۔ میاں صاحب اس سے بالکل بھی ناخوش نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے اگر آپ نے کسی کی زندگی بہتر کردی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کا غلام ہوگیا ہے۔اس وجہ سے وہ اپنے ملازمین کو ہمیشہ کہتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی اچھا موقع مل رہا ہے تو وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں اور ان کو بتا کر جائیں ان کو کبھی میاں صاحب کی طرف سے منع نہیں ہوگا۔

وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی خاندانی روایات کا اثر ہے کیوں کہ تعلیم ان کا خاندانی پیشہ رہا ہے۔ یہ اثر ابھی تک چل رہا ہے اور ان کے بچوں میں بھی یہی خاندانی اثر ہے۔ حلال طریقے سے روزی کمانا سب کا حق ہے۔ اگر آپ اچھے طریقے سے جو بھی کام کر رہے ہیں، اسے آپ یہ سمجھیں کہ ایک ادارہ بنانا ہے، انسٹیٹیوشن بنانا ہے، اس میں جو ساتھی آئیں گے وہ بھی آپ کو یاد رکھیں گے، جو وہاں سے گزریں گے وہ بھی آپ کو یاد رکھیں گے۔ اس طریقے سے روزی کمانا صدقہ جاریہ بن جاتا ہے کیوں کہ معاشرہ اس سے مستفید ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں ایک مسئلہ اور بھی ہے ۔وہ یہ کہ اگر آپ کوئی فلاحی کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں پہلے وسائل جمع کروں گا یعنی چندہ کر کے پیسہ جمع کروں گا اور پھر کام کروں گا۔ این جی اوز والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ اکثر کی ساکھ اچھی نہیں ہے۔ اپنے بل بُوتے پر کام کرنے والے کم ہیں ۔لوگ ایسے کاموں کے لیے اپنا پیسہ بہت کم خرچ کرتے ہیں۔ مگر میاں صاحب کا مقصد شروع سے یہ رہا ہے کہ وہ اپنے بل بُوتے پر اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے اس ملک اور معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ جہاں کوئی اچھا کام ہو رہا ہے اس کی مدد کریں۔ اس کے

لیے تعلیم کی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی اکثر مدد تعلیمی اداروں کو جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گروپ کسی اچھے مقصد کو لے کر آگے چل رہا ہے۔ تو وہ اس کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ کسی بھی آدمی کی اس سے اچھی مدد کوئی ہو نہیں سکتی ہے کہ آپ اس کو تعلیم دیں اس کی معلومات میں اضافہ کریں۔ پھر اس کے جو بھی مسائل ہیں وہ ان کو خود حل کر لے گا۔ اُنھوں نے یہی جذبہ اپنے بیٹوں میں منتقل کیا ہے اب یہ ان پر ہے کہ وہ اس کو کتنا استعمال کرتے ہیں۔

جب میاں عبدالمجید صاحب کی زیادہ توجہ فلاحی کاموں کی طرف گئی تو اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس اسکول میں ان کے والد صاحب نے پڑھایا، جس میں اُنھوں نے پرائمری پڑھی، جس میں، میاں عبدالرشید صاحب پڑھے، اس اسکول کی مدد کریں، اس کو بہتر سے بہتر بنائیں حالانکہ وہ گورنمنٹ اسکول تھا اب بھی ہے۔ اسی طرح وہاں بچیوں کا اسکول بھی ہے اس میں جتنی بھی مدد کر سکتے ہیں وہ کریں، وہاں میاں عبدالمجید صاحب ہر سال جاتے ہیں ان اسکولوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اسکول کے سالانہ فنکشن میں جاتے ہیں۔ اسکول کے جو بچے مختلف کلاسز میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرتے ہیں، ان کو انعام دیتے ہیں۔ ٹیچرز کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اسکول کے فرنیچر کے علاوہ اور جو دوسرے مسائل ہیں ان کو حل کرتے ہیں۔ حال ہی میں اُنھوں نے اسکول کا ایک پورا بلاک بنوایا ہے۔ اس میں لیب اور کلاسز شامل ہیں۔ وہ ہر سال اہل خانہ کے ہمراہ وہاں جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں ان کے بھتیجوں کرنل محمد محسن اور میاں حبیب احمد نے ہمیشہ ان کی معاونت کی ہے۔ اسی طرح ان کے چچازاد بھائی میاں بشیر صاحب جو تدریس ہی سے وابستہ ہیں ان سے بھی مشاورت رہتی ہے کہ گاؤں کے اسکول کو کس طرح بہتر سے بہتر بنانا ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب کو رونا نہیں آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری خاصیت ہے کہ میں روتا نہیں ہوں۔ انھوں نے اپنے والد صاحب کو بھی کبھی روتے نہیں دیکھا۔ بس ایک دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے جب وہ تھل ٹیکسٹائل مل کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب کو الوداع کہا تب ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غالباً اس وقت ان کو احساس ہو گیا تھا کہ اب میاں عبدالمجید صاحب واپس اس ماحول میں یا اس خاندان میں، اپنی فیملی میں اس طریقے سے واپس نہیں آئیں گے۔ جیسے پہلے رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی بھی ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔

ان کی زندگی کے لیے ایک سب سے بڑا سانحہ ماں باپ کی وفات کے بعد میاں عبدالرشید صاحب کی شہادت تھی۔ میاں عبدالمجید صاحب کے تو حواس ہی گم ہو گئے تھے۔ ان کے سر پر ایک بھائی جان تھے کسی ظالم نے ان سے وہ بھی چھین لیے۔ جس دن ان کی شہادت ہوئی ہے اس سے دو تین دن پہلے میاں عبدالمجید صاحب لاہور گئے تھے۔ ان کا وہی طریقہ تھا اکٹھے بیٹھتے، کھانا کھاتے، گپ شپ کرتے، میاں عبدالرشید صاحب، میاں عبدالمجید صاحب کو چھوڑنے باہر آئے۔ میاں صاحب گاڑی میں سوار ہو رہے تھے کہ اُنھوں نے میاں عبدالرشید صاحب سے کہا کہ آپ کو جلد خوشخبری ملنے والی ہے کچھ دیر پہلے، ان کا بیٹا کرنل محسن جو اس وقت پنڈی میں تھا، اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے میاں عبدالرشد صاحب کو تبادلے کے متعلق نہیں بتایا تھا تو اُنھوں نے چلتے چلتے میاں عبدالرشید صاحب سے کہہ دیا کہ آپ کو اچھی خوش خبری ملنے والی ہے وہ مسکرائے۔

”بھئی کیا بات ہے، کیا تم اپنے بیٹوں کی شادیوں کی بات کر رہے ہو؟“

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا ”نہیں جی بس خوش خبری ملنے والی ہے“

میاں عبدالرشید صاحب بھائی کو گاڑی میں بٹھا کر چلے گئے۔ قارئین گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ ہر چار سال بعد انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کی نمائش ہوتی ہے یہ نمائش 1991ء میں منعقد ہو رہی تھی اس میں پہلی دفعہ میاں عبدالمجید صاحب کی ایک کمپنی PRP پریسین ربر کمپنی اپنی مصنوعات نمائش میں پیش کر رہی تھی جن ممالک کی کمپنیاں نمائش میں حصہ لیتی ہیں وہاں پر ان کے قومی پرچم بھی لہرائے جاتے ہیں۔ وہاں پاکستان کا پرچم لہرایا جانا تھا یہ میاں عبدالمجید صاحب کے لیے بڑے فخر اور اعزاز کی بات تھی۔ اس کے علاوہ نمائش سے پہلے مختلف کمپنیوں میں نئی نئی ایجادات کے بارے میں سیمینارز ہوتے تھے ایسا ہی ایک سیمینار سوسن کمپنی میں ہو رہا تھا۔ جب میاں عبدالمجید صاحب اس جرمن کمپنی میں پہنچے وہاں کے ایک مینیجر جو اکثر پاکستان آتے جاتے رہتے تھے وہ میاں صاحب کو ایک طرف لے گئے اور یہ دردناک خبر سنائی کہ کسی نے میاں عبدالرشید صاحب کو گولی مار کر شہید کر دیا ہے۔ یہ سانحہ 16 ستمبر 1991ء میں پیش آیا۔ وہ سکتے میں آ گئے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کو بس یہی خیال تھا کہ یہ خبر جھوٹ ہے۔ وہاں سے اُنھوں نے فون کرنے شروع کیے۔ اُنھوں نے وقار صاحب کو فون کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ ہاں یہ ہوا ہے۔ میاں صاحب نے فوری واپسی کی کوشش شروع کر دی۔ ان کو آنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی کیوں کہ جب وہ واپس آئے تو میاں عبدالرشید صاحب کی تدفین ہو چکی تھی۔ وہ سوئم سے پہلے آئے تھے۔ سوئم میں شرکت کر کے وہ واپس ایگزی بیشن میں چلے گئے کیونکہ کمٹ منٹ پوری کرنی تھی۔ اُنھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

بس اس کا ایک ہی سبب سمجھ میں آتا تھا کہ اُنھوں نے اپنی شہادت سے پہلے ایک پمفلٹ لکھا تھا اس کا عنوان تھا ''دہشت گردی روکنے کے لیے ہماری مدد کیجیے''

وہ پمفلٹ ابھی بھی ہے۔ اس وقت وہ پمفلٹ تقسیم ہو رہا تھا۔ میاں عبدالرشید صاحب کو اس وقت احساس تھا کہ دہشت گردی ایک ایسی لعنت ہے جس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا ہے لیکن میاں عبدالمجید صاحب سمجھتے تھے کہ اس میں کچھ خفیہ ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کو الزام نہیں دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ہوا کہ پولیس والوں نے ایک بندے کو پکڑ لیا۔ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی صاحب کی ہدایات کے مطابق ایک خاکہ تیار کیا گیا اور اس پر ایک کثیر رقم انعام کے طور پر رکھی گئی یہ خاکہ کئی روز تک نوائے وقت میں چھپتا رہا۔ پولیس نے ایک بندہ پکڑا تھا۔ جب میاں عبدالرشید صاحب پر حملہ ہوا تو اُنھوں نے حملہ آور سے مقابلہ کیا اور مقابلے کے دوران اُس شخص کا کچھ خون وہاں زمین پر گر گیا تھا۔ اس پر میاں عبدالمجید صاحب کے بھتیجے بڑے خوش تھے کہ قاتل پکڑا گیا ہے۔ مگر میاں عبدالمجید صاحب نے کہا کہ ان پولیس والوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کسی کو ناحق پکڑ کر اقرارِ جرم کرا لیں اور اس کا خون ناحق ہماری گردن پر آ جائے گا۔ اُنھوں نے پولیس سے مطالبہ کیا کہ وہ قاتل کا ڈی این اے ٹیسٹ کروالیں اس سے یقینی طور پر پتا چل جائے گا کہ جائے واردات پر پایا جانے والا خون قاتل کا ہے یا نہیں۔ اس کا خون ٹیسٹ کے لیے اسلام آباد بھیجا گیا، اور ڈی این اے ٹیسٹ میچ نہیں ہوا تو اُنھوں نے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا، کہ ہم اپنے ایک بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ایک دوسرے آدمی کو ناحق مار دیں''۔

یہ نواز شریف کا پہلا دورِ حکومت تھا۔ غلام حیدر وائیں صاحب اس وقت پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اُس زمانے میں 5، 6 دسمبر 1991ء میں لاہور میں ٹیکسٹائل کی انٹرنیشنل کانفرنس کروائی۔ اس میں وزیرِ اعظم نواز شریف صاحب بہ طور مہمان خصوصی تشریف لائے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کے

نواز شریف صاحب کے ساتھ ذاتی مراسم بھی تھے۔ نواز شریف صاحب جب نئے نئے گریجویٹ ہوئے تھے تو ان کے والد میاں شریف صاحب نے ان سے کہا کہ تم بھی کوئی نیا کام کرو تو اُنھوں نے ٹیکسٹائل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اور اسی سلسلے میں وہ میاں عبدالمجید صاحب کے دفتر میں تشریف لائے تھے۔ نواز شریف صاحب کی جو پہلی مل اتفاق ٹیکسٹائل لگی تھی اُس میں میاں عبدالمجید صاحب کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ تھا۔ نواز شریف صاحب ان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ بلکہ ان کے والد میاں شریف صاحب کے پاس بھی جانا رہتا تھا۔ اس کے بعد ان کی اور بھی ٹیکسٹائل ملیں لگیں۔ جب نواز شریف کانفرنس میں آئے۔ میاں صاحب نے ایک چٹ پر ان کو لکھ کر بھیجا کہ کچھ عرصہ پہلے میرے بڑے بھائی میاں عبدالرشید صاحب کی شہادت ہوئی ہے اور ابھی تک ان کے قاتلوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تو آپ قاتل ڈھونڈنے میں ہماری مدد کریں۔ نواز شریف صاحب نے وہ پڑھا اور ڈائس پر آنے سے پہلے وہ میاں عبدالمجید صاحب کے پاس آئے۔

”مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میاں عبدالرشید صاحب آپ کے بھائی ہیں۔“

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا۔” میاں صاحب آپ کے ساتھ ہم جب بھی بات کرتے ہیں تو کاروبار کے متعلق کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ آپ کا خاندان کون سا ہے، کہاں سے تعلق ہے، کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ہمارا خاندانی پس منظر کیا ہے۔“

اس کے بعد نواز شریف صاحب نے وائیں صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

”وائیں صاحب میاں عبدالرشید صاحب کی شہادت کے متعلق کابینہ میں گفتگو ہوئی تھی، آپ اس سلسلے میں اس کیس کو منطقی انجام تک پہنچانے میں میاں عبدالمجید صاحب کی

مدد کریں۔"

وائیں صاحب بولے "ٹھیک ہے، آپ فون کر کے میرے پاس تشریف لائیے گا۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے کہا۔ "جی میں ضرور آؤں گا۔"

میاں عبدالمجید صاحب نے ان کو کئی بار فون کیا اور جب ان کی طرف سے کوئی ردعمل ہی نہ آیا اور نہ کسی نے فون اُٹھایا تو میاں عبدالمجید صاحب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ میاں عبدالرشید صاحب کا صحافیوں میں بڑا نام تھا اور وہ سارے ملک میں جانے جاتے تھے۔ اس وقت نوائے وقت ملک کا دوسرا بڑا اخبار تھا اور خاص طور سے دائیں بازو کا مقبول ترین اخبار۔ اس میں کالم لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود بہت سوں کو نہیں پتا تھا کہ میاں عبدالمجید صاحب ان کے بھائی ہیں۔ یہ تو ان کے انتقال کے بعد لوگ آنا شروع ہوئے تو ان کو پتہ چلا۔ کراچی میں ان کے ایک بڑے عزیز دوست حمید پراچہ صاحب تھے، وہ وزارتِ خارجہ میں رہ چکے تھے۔ وہ میاں عبدالمجید صاحب کی بھابھی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی ان سے ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ جس وقت میاں عبدالرشید صاحب کی شہادت ہوئی اور پراچہ صاحب ان کے سوئم پر آئے تو میاں صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔"

"میاں عبدالرشید صاحب آپ کے بھائی ہیں۔ آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں، آپ تو ہمارے قریبی رشتہ دار ہیں"۔

اسی طرح ایم سی بی بینک کے مالک میاں منشا صاحب بھی ان کے پاس آئے اور افسوس کیا کہنے لگے۔ "میاں صاحب آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ میاں عبدالرشید صاحب آپ کے بڑے بھائی ہیں۔"

اس طرح بہت سے لوگوں کو نہیں پتا تھا۔ ان کی تربیت اس طرح کی نہیں ہے کہ وہ کہتے رہیں کہ ہم یہ ہیں وہ ہیں۔ کاروبار اپنی جگہ، رشتہ داریاں اپنی جگہ، تعلقات اپنی جگہ پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میاں صاحب سے کہیں کم کام کرنے والے محض پبلسٹی کے زور پر جانے مانے نام ہیں۔ اور میاں صاحب کا حلقہ واقفیت اتنا وسیع نہیں ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب متنوّع مزاج کے حامل ہیں۔ خوشی اور غمی میں اعتدال رکھتے ہیں۔ غم اپنی جگہ لیکن اسے جان کا روگ نہیں بناتے۔

تفریح کے بارے میں میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں کہ وہ سنجیدہ تفریح پسند کرتے ہیں۔ وہ فلم تو نہیں دیکھتے البتہ دستاویزی فلم کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بھارتی فلمیں تو بالکل ہی نہیں دیکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو ملک آپ کا دشمن ہو اس کی کوئی فلم دیکھنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ جب وہ برطانیہ میں زیر تعلیم تھے اُس وقت بھی بھارتی فلمیں ناپسند کرتے تھے۔ جب کہ ان کے اکثر دوست اتوار کی صبح کو سینما جاتے تھے۔ موسیقی میں غزلیں پسند کرتے ہیں۔ عارفانہ کلام انھیں اچھا لگتا ہے مگر ایک حد تک کیوں کہ اسے سمجھنا پڑتا ہے۔ بلھے شاہ کا کلام بڑے ذوق سے سنتے ہیں۔

کتابیں وہ زیادہ تر سائنٹیفک اور تاریخی پڑھتے ہیں۔ ان کو اردو پڑھنا پسند ہے۔ مگر اردو کی کئی ایسی کتابیں جو تکنیکی نوعیت کی ہوتی ہیں وہ نہیں ملتیں تو انگریزی کتب دیکھنی پڑتی ہیں لیکن مزا تو اُردو کی کتاب پڑھنے میں آتا ہے۔ اس میں ذرا سا تسلسل تیز رہتا ہے۔ مگر انھیں پڑھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا ہے۔ کاروبار اور اس سے متعلق کتابیں پڑھنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ ایک معمول جو میاں عبدالمجید صاحب نے کبھی ترک نہیں کیا وہ ان کا صبح سویرے اٹھنا ہے۔ یہ پرانا خاندانی اثر ہے کہ رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی اٹھنا ہے۔ مگر یہ معمول میاں عبدالمجید صاحب

تک محدود ہے ان کے بیٹوں کا اپنا معمول ہے وہ اس کے مطابق اٹھتے سوتے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کو ان کے والد نے بچپن سے یہ سکھایا تھا کہ اگر زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو نیند پوری کیا کرو۔ ورنہ دوسرا دن اچھا نہیں گزرے گا۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ انھیں سونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بستر پر گئے اور سو گئے۔

سمندر میاں عبدالمجید صاحب کی من پسند جگہ ہے جب وہ کراچی آئے تو یہاں تفریح کی کوئی جگہ نہیں تھی لے دے کے ایک سمندر تھا۔ ہر اتوار کو ساری فیملی سمندر پر جاتی تھی اور وہ سارا دن سمندر کے کنارے گزارتے تھے۔ کھیلوں میں کبڈی کھیلتے تھے، ملتان آخری جگہ تھی جہاں پر آخری کبڈی کا میچ ہوا تھا۔ اس کے بعد بیڈمنٹن بھی کھیلی مگر وہ بھی چھوڑ دی۔ جب وہ مانچسٹر گئے تو وہاں ہوا اتنی تیز چلتی تھی باہر کھیلنے کا سوال ہی نہیں تھا، اس کے بعد ورزش کا شوق ہوا۔ جاگنگ اور جمنازیم میں ورزش کرتے تھے۔ آج بھی جاگنگ کرتے ہیں مگر کم کم۔

سفر جاری ہے

انسانی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ انسان زندگی کے ایک خاص موڑ پر اُن اُمور کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کی طرف اس کا رجحان اور میلان تو تھا لیکن حالات و وقت اور کاروباری مصروفیات اس کے آڑے آتی رہیں۔ اس طرح کا کچھ معاملہ میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ بھی رہا۔ میاں عبدالمجید صاحب نے ایک بھرپور اور توانا زندگی گزاری۔ مشکل حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ تھکاوٹ یا غفلت کبھی بھی ان کے اعصاب پر مسلط نہ ہوسکی۔ تعلیم و تدریس میاں عبدالمجید صاحب کے خاندان کا پیشہ ہی نہیں بلکہ ان کا مشن اور طرۂ امتیاز بھی رہا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کے والد کیونکہ ساری زندگی تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے اس لیے انھوں نے اپنے بچوں کے شعور میں یہ بات بٹھا دی کہ تعلیم کے بغیر زندگی کی رونق ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ تعلیم ہی وہ کلید ہے جس سے ترقی کا ہر تالا کھل سکتا ہے۔ ذہن میں میاں امام الدین صاحب نے یہ بات کچھ اس انداز سے اولاد کے اندر بٹھائی کہ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے بڑے بھائی مرحوم میاں عبدالرشید صاحب کبھی بھی علم کی اہمیت اور افادیت سے غافل نہیں ہوئے۔ میاں عبدالرشید صاحب تو ساری زندگی ابلاغ عامہ کے ذریعے علم و حکمت کی خیرات بانٹتے رہے لیکن اس کے برعکس میاں عبدالمجید صاحب کی کاروباری مصروفیات تعلیم کے لیے عملی جدوجہد میں شانہ

بشانہ نہ چل سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میاں عبدالمجید صاحب فروغِ علم کے مشن سے غافل تھے۔ انھوں نے نہ صرف برطانیہ سے خود اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ اپنے بچوں کو بھی معیاری تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ لیکن جس جوش و جذبہ سے میاں عبدالمجید صاحب آج کام کر رہے ہیں جوانی کے ایام میں یہ مشن کچھ تعطل کا شکار رہا۔ عربی زبان کا مقولہ ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ یہی معاملہ میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ جیسے ہی کاروبار سے عملی طور پر انہیں فراغت ملی وہ توانا جذبوں کے ساتھ تعلیمی میدان میں مجاہدوں کی طرح ڈٹ گئے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی خوش قسمتی یہ بھی رہی کہ ان کی اور ان کے رفیق کار وقار حسن صاحب کی اولاد لائق اور صاحبِ ادراک ثابت ہوئی۔ انھوں نے کاروبار کو نہ صرف اچھی طرح سنبھالا بلکہ ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ اب میاں عبدالمجید صاحب کے ذہن میں فروغِ علم کے نئے نئے منصوبے اُبھرنے لگے۔ آج اگر دیکھا جائے تو میاں عبدالمجید صاحب کی پہلی، دوسری اور تیسری ترجیح میں تعلیم، تعلیم اور تعلیم ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان درسگاہوں اور انجمنوں کا تذکرہ کریں جن کے پلیٹ فارم سے میاں عبدالمجید صاحب تعلیم کے لیے اَن تھک کوشش کر رہے ہیں ضروری ہے کہ میاں عبدالمجید صاحب کے نظریہ تعلیم کے متعلق یہاں کچھ بات ہو جائے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے مانچسٹر یونی ورسٹی سے تعلیم پائی اور ہمیشہ سائنس کے طالب علم رہے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچ بھی سائنسی خطوط پر استوار ہوئی ہے۔ وہ سائنس و ٹیکنالوجی کو ہماری قومی ترقی کے لیے جزولاینفک خیال کرتے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کے نزدیک روایتی اور مقصد سے عاری تعلیم وقت کا ضیاع ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قومی سطح پر اور معاشرتی سطح پر تعلیم ہی ہمارا مقصد زندگی ہونا چاہیے جب

تک ہم سو فیصد شرح خواندگی کا ہدف حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک مستحکم جمہوریت، معاشی اور سماجی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال کے مطابق مغرب کی حالیہ ترقی کا راز صرف اور صرف تعلیم ہے۔ آج مغرب کی دنیا پر اِجارہ داری کی وجہ صرف اور صرف تعلیم ہی ہے کہ وہ علم و ہنر سے لیس ہیں۔ اور بدقسمتی سے مشرقی معاشرے بالخصوص مسلمان سماج کا رویہ علم بیزاری کا رہا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب جب آکسفورڈ اور کیمبرج کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ہوتی ہے اور وہ اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ جس زمانے میں مغرب کے اندر شہرۂ آفاق درس گاہیں بن رہی تھیں اس وقت برصغیر میں حرم سرائیں، محلات، برج اور عشرت کدے تعمیر ہو رہے تھے۔ یہ باتیں قوموں کی ترجیحات کا تعین کرتی ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے پاس وافر وسائل ہیں لیکن امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے کی درس گاہیں ہم کھڑی کرنے سے قاصر ہیں۔ صرف عرب ممالک ہی اپنی دولت کا کچھ حصہ اس کام کے لیے وقف کر دیں اور دنیا سے ذہین افراد کو اپنے ہاں مدعو کریں یوں چند سالوں میں شہ دماغ ہماری درسگاہوں میں اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ مغرب نے یہی تو کیا ہے وہ دنیا جہان سے جوہر قابل کو اپنے ہاں بلا لیتے ہیں، ٹیلنٹ کی قدر کرتے ہیں جس کی بدولت ان کی ٹیکنالوجی فروغ پاتی ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب جب بھی کسی درس گاہ میں جاتے ہیں تو طلبہ و اساتذہ کو یہی بات بتاتے ہیں کہ کوئی بھی تہذیب جب غالب آتی ہے تو وہ اپنی ٹیکنالوجی کی بدولت اور علم و ہنر کے زور پر۔ اگر آج ہم مسلمان سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت اور افادیت کو سمجھ لیں تو ہم دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو سکتے ہیں۔ جابر بن حیان، محمد بن زکریا رازی، ابن الہیثم، فارابی، الکندی یہ کون لوگ تھے سب مسلمان تھے۔ جب مسلمانوں نے تعلیم سے منہ موڑا دنیا

میں ان کے جغرافیے بدل گئے۔ ان کی شناخت عسکریت پسندی اور تشدد کے حوالوں سے ہونے لگی۔ آج بھی ہم اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں تعلیمی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب اس بات پر بھی اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی پہلی چار سو یونی ورسٹیوں میں ایک بھی یونی ورسٹی پاکستان سمیت اسلامی دنیا کی نہیں۔ ہمارے ہاں ہر سال بہ مشکل چند سو پی ایچ ڈی تیار ہوتے ہیں جبکہ ہمسایہ ملک ہندوستان میں ہر سال پانچ ہزار سے زائد۔ گو تعلیمی اور سائنسی میدان میں ہندوستان ہم سے بڑا ملک ہے۔ ہمارے درمیان مقابلہ بنتا نہیں لیکن پاکستان میں جوہرِ قابل کی کمی نہیں، ہم ہندوستان سمیت دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے وسائل، صلاحیتیں اور ترجیحات تعلیم کی طرف موڑ دیں۔ میاں عبدالمجید صاحب اس سوچ و فکر کے ساتھ تعلیم کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ اب ان کی توقعات کا مرکز نوجوان نسل ہے وہ کہتے ہیں کہ نوجوان ہی انقلاب کا ہراول دستہ بن سکتے ہیں۔ ان کے اندر کچھ کرنے اور تبدیلی لانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے ایف سی کالج میں تعلیم پائی اور یہ درس گاہ ہمیشہ ان کی محبتوں کا مرکز رہی ہے۔ ایف سی کالج سے انھیں صرف اُنس ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے۔ ایف سی کالج نے ان کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ وہاں اُس زمانے کا نظامِ تعلیم، اساتذہ کی تحقیق کا معیار اور نظم و ضبط میاں عبدالمجید صاحب کے ذہن پر نقش ہیں۔ اس کالج کی خوش گوار یادوں کو وہ اکثر اپنے دوستوں کے درمیان تازہ کرتے رہتے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب نے جب کراچی میں رہائش اختیار کی تو دوست احباب کے ساتھ سماجی تعلقات بڑھنے شروع ہوئے اور اُنھیں تقریبات میں جانے کا موقع ملا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے کاروباری رفیق وقار حسن گورنمنٹ

کالج لاہور کے فارغ التحصیل تھے اور راوین کہلاتے تھے اور یہ معاملہ ان کے ایک دوسرے کاروباری رفیق اور دوست خاور بٹ کے ساتھ بھی تھا۔ راوین ہمیشہ ایکٹیو رہتے ہیں۔ جہاں بھی ہوتے ہیں تقریبات کراتے رہتے ہیں۔ یوں راوین کو دیکھتے ہوئے ایف سی کالج کے قدیم طلبہ نے بھی ایف سی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن بنائی۔ لاہور کی حد تک تو یہ کافی متحرک تھی لیکن کراچی میں اس کا نظم بہت بعد میں قائم ہوا۔ میاں عبدالمجید صاحب کے ایف سی کالج کے ایک کلاس فیلو گلزار قریشی صاحب جو کراچی میں انکم ٹیکس کمشنر تھے انھوں نے کراچی میں ایف سی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں کافی فعال کردار ادا کیا۔ یوں میاں عبدالمجید صاحب بھی اس ایسوسی ایشن سے وابستہ ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج کی طرح ایف سی کالج کی بھی ایک شاندار تاریخ ہے۔ کئی نام ور لوگ اس درس گاہ نے پیدا کیے۔ پاکستان کے پہلے نیول چیف ایڈمرل چوہدری، سابق وزیراعظم چوہدری شجاعت حسین، سابق وزیراعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی اور سابق صدر پاکستان جنرل (ر) پرویز مشرف بھی ایف سی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ اس وقت نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن میں میاں عبدالمجید صاحب کے ساتھ ایک فعال دوست ڈاکٹر اکرم کھوکھر بھی ایف سی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ مرحوم حمید پراچہ صاحب بھی بعد میں اس کارواں میں شامل ہو گئے۔ یہ دوست احباب جب بھی اکٹھے ہوتے اپنے کالج کے زمانے کا تذکرہ کرتے اور ایف سی کالج کی بہتری کے لیے سوچتے۔ اس ایسوسی ایشن کے دو فائدے ہوئے ایک اس درس گاہ کے سابق طلبہ کے آپس میں خوش گوار اور دوستانہ مراسم قائم ہوئے، دوسرا ایف سی کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کے اندر تڑپ بڑھتی گئی۔ جس طرح گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ راوین کہلاتے ہیں اسی طرح ایف سی کالج کے طلبہ فارمانائٹس کہلاتے ہیں۔ ایسوسی ایشن کا سالانہ عشائیہ ہوتا تو اس میں میاں

عبدالمجید صاحب ضرور شریک ہوتے۔ اس ڈنر میں مختلف نوعیت کے سنجیدہ اور تفریحی پروگرام بھی ہوتے اور اسی پلیٹ فارم کے سابقہ طلبہ نے مطالبہ کیا کہ ایف سی کالج کو ڈی نیشنلائز کیا جائے۔ کیونکہ قومیانے سے اس کا علمی اور تحقیقی معیار گر گیا ہے۔ بڑی جدوجہد کے بعد جنرل مشرف کے دور میں یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ انھوں نے نہ صرف اس کالج کی مالی اعانت کی بلکہ اسے یونی ورسٹی کا درجہ بھی دیا۔ فارمانائٹس نہ صرف پروگرام کرتے ہیں بلکہ اس درس گاہ میں زیرِ تعلیم ذہین طلبہ کو وظائف بھی دیتے ہیں۔ اولڈ بوائز کا ویلفیئر ٹرسٹ طلبہ کی اعانت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ اس کے لیے ایس ایم سلیم صاحب نے ہمیشہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ میاں عبدالمجید صاحب ایف سی کالج کی بہتری اور ترقی کے لیے ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ کالج کی خدمت کرنے کا انھیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ اسے کسی صورت ضائع نہیں کرتے۔

میاں عبدالمجید صاحب ایف سی کالج کی موجودہ انتظامیہ سے کافی مطمئن ہیں کیونکہ موجودہ انتظامیہ کو امریکہ میں کالجز چلانے کا کافی تجربہ حاصل ہے۔ اپنے دورِ وزارتِ اعلیٰ میں چوہدری پرویز الٰہی نے ایف سی کالج میں ایک تعلیمی بلاک بنوا کر دیا ہے میاں عبدالمجید صاحب اس کی بھی تحسین کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں کالج کا معیار کسی حد تک بحال ہو گیا ہے۔ ایف سی کالج کے سربراہ مسٹر پیٹر ایچ آرماکوسٹ (Peter H. Armacost) بھی میاں عبدالمجید صاحب کی ایف سی کالج کے ساتھ وابستگی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب کو کالج نے ایک اعزاز دیا ہے۔ اگرچہ وہ ازراہِ انکساری اس کا تذکرہ کم کم کرتے ہیں لیکن وہ اعزاز اتنا بڑا ہے کہ اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ایف سی کالج میں ہر سال سالانہ پروگرام ہوتا ہے جس میں کسی ایک غیر معمولی شخصیت کو ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ 13 مارچ 2004ء کو ایف سی کالج نے میاں عبدالمجید صاحب کی غیر معمولی خدمات

کے اعتراف میں Distingushed Formanite Award دیا۔ اس سیشن میں سابق چیئر مین سینیٹ محمد میاں سومرو کو بھی یہ ایوارڈ دیا گیا۔ یوں تو میاں عبدالمجید صاحب کو ملنے والے اعزازات کی فہرست طویل ہے لیکن مذکورہ ایوارڈ وہ اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ ایف سی کالج میاں عبدالمجید صاحب کی زندگی میں وہ باب ہے جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مانچسٹر یونی ورسٹی سے میاں عبدالمجید صاحب نے تعلیم پائی اور اس یونی ورسٹی کو وہ اپنی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ بھی سمجھتے ہیں۔ اس مادرِ علمی سے بھی ان کی والہانہ محبت قابل دید ہے۔ ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ آف مانچسٹر نے بھی میاں عبدالمجید صاحب کو اس قسم کے ایوارڈ سے نوازا یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو ملا ہے۔

میاں عبدالمجید صاحب نے 1978ء میں روٹری کلب کی رُکنیت حاصل کی۔ روٹری میں میاں صاحب بہت سرگرم رہے اور اب بھی ہیں۔ لیکن ان کو دو کاموں پر فخر ہے۔ 88-1987ء میں جناب ایس۔ ایچ۔ اطہر روٹری ڈسٹرکٹ پاکستان کے گورنر منتخب ہوئے۔ تو انھوں نے عبدالمجید صاحب کو اپنا ڈسٹرکٹ سکریٹری بنایا اس طرح روٹری کے تمام شعبہ جات کی دیکھ بھال زیادہ تر میاں صاحب کے ذریعے ہونے لگی۔ اُس سال کا ایک بڑا کام پاکستان روٹری کا چین کا دورہ تھا۔ غالباروٹری کا کوئی وفد اس سے پیشتر چین نہیں گیا تھا۔ اس دورے کی دعوت جناب روٹرین عبدالقادر مرحوم نے بہت تگ و دو کے بعد حاصل کی تھی۔ جب یہ دورہ ہوا اُس وقت چین کے دروازے دنیا پر نہیں کھلے تھے۔ چین کے دس روز کے قیام میں میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو چین کی معیشت، معاشرت اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ہوئی۔ چینی حکومت کی طرف سے پذیرائی ملی، اور اندرون چین کے دیہات میں بھی جانا ہوا اور پھر نئے صنعتی مراکز کو بھی دیکھا۔

کئی سالوں کے بعد پچھلے دو سالوں میں دوبارہ چین جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ بدلہ ہوا چین تھا۔ اتنی ترقی کسی قوم نے اتنی تیزی سے نہیں کی۔ ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ روٹری میں کئی مخلص دوست ملے ان میں سے میاں مقبول احمد مرحوم اور ڈاکٹر منصور ڈار کا ذکر ضروری ہے۔ دو سال پیشتر میاں مقبول صاحب کی وفات ہوئی۔ یہ تینوں تقریباً بیس سال تک ہر صبح ایک دوسرے کو ٹیلیفون کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ میاں مقبول صاحب کی وفات سے دو دن پہلے تک قائم رہا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

دوسری ذمہ داری لٹریسی کی ہے۔ جو 2000ء سے اب تک قائم ہے۔ اس پلیٹ فارم سے یا اس کی وساطت سے کئی لاکھ ناخواندہ افراد کو خواندہ بنایا گیا اور آج بھی میاں صاحب روٹری ڈسٹرکٹ پاکستان میں لیٹرسی کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔

روٹری کلب بین الاقوامی سطح کا ایک ایسا ادارہ ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے روٹری کے مختلف عہدوں پر اعزازی طور پر کام کیا لیکن تدریس وہ شعبہ ہے جسے وہ اپنے لیے باعث اعزاز خیال کرتے ہیں۔ یہاں تدریس کے پروگراموں میں کام کرنے سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ 2001ء میں سہیل صاحب پاکستان روٹری ڈسٹرکٹ کے گورنر بنے تو انھوں نے میاں عبدالمجید صاحب سے کہا کہ آپ اس پلیٹ فارم سے لٹرسی پر کام کریں۔ یہاں میاں عبدالمجید صاحب نے فارمل ایجوکیشن اور لٹریسی کے فرق کو جانا۔ لٹریسی پر کام کرتے ہوئے ان کی ملاقات راعد افضل صاحب سے ہوئی جو نیو سنچری کے نام سے ایک ادارہ چلا رہے تھے۔ اس ادارے نے اپنے پانچ سالہ تجربات اور تحقیق کے بعد ناخواندہ افراد کے لیے کتابیں تیار کرائیں جسے جگنو سبق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ راعد افضل ایک متحرک اور مشنری

انسان ہیں۔ تعلیم ان کی زندگی کا اوّل و آخر مقصد ہے۔ انھوں نے اپنے پروگرام کے متعلق میاں عبدالمجید صاحب کو بریفنگ دی کہ کس طرح جگنو کتابوں کی مدد سے ایک اَن پڑھ آدمی چند ماہ میں دو تین گھنٹے روز صرف کرنے سے پڑھنے لکھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے تڑپ تو میاں عبدالمجید صاحب کے اندر شروع ہی سے تھی انھوں نے بریفنگ کے بعد جگنو سبق پروگرام کو نیشنل فوڈز میں آزمائشی طور پر چلایا۔ اس کے حیرت انگیز نتائج نکلے۔ عمر رسیدہ ناخواندہ لوگ لکھنے پڑھنے اور روزمرہ کا حساب کتاب رکھنے کے قابل ہو گئے۔ ان کی زندگی میں شعور آیا اور اس شعور نے بعض لوگوں میں رہنے سہنے کی انقلابی تبدیلی پیدا کی۔

اب اس پروگرام کے Steps سامنے آنا شروع ہوئے۔ پروگرام کا پہلا Step یہ ہے کہ پہلے ٹیچر کو ٹرینڈ کیا جائے گا۔ ٹیچر کی ٹریننگ صرف اسی حد تک ہوگی کہ وہ اسی پروگرام کو پڑھانے کے قابل ہو جائے۔ وہ ایک جنرل ٹیچر نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایک عام ٹیچر کا ذہن ایک خاص سسٹم میں آجاتا ہے۔ وہ رٹّے والا نظام ہے۔ جب کہ اس کی ٹیچر ٹریننگ الگ سے ہوتی ہے۔ یہ نظام ایک صوتی نظام ہے۔ یہ آواز سے شروع ہوتا ہے۔ آواز میں جو نیوسنچری والوں نے ریسرچ کی تھی اس میں یہ ظاہر ہوا تھا کہ 50 فیصد حروف تہجی جو ہیں وہ ہماری گفتگو کا80 فیصد ہوتے ہیں اور باقی 50 فیصد حروف تہجی صرف 20 فیصد گفتگو میں ہوتے ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے کتابیں بھی اسی ریسرچ کے حساب سے بنائی تھیں۔ پہلی کتابیں اس طرح کی ہیں کہ روزمرہ کی جو بات چیت ہے اس میں جو ساؤنڈ آتا ہے اس کے حساب سے چلتی ہیں۔ پھر جگنو والوں نے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ آپ فیکٹری کے کچھ آدمی دیں۔ جن کو ہم ٹیچنگ کرنے کی تربیت دیں گے۔ میاں صاحب نے اپنی فیکٹری کے پانچ چھ لوگ دیے جن میں دو خواتین تھیں، اور دو تین مرد تھے، یہ سب پڑھے

لکھے تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اپنے ورکرز سے کہا کہ آپ وہاں جا کر ٹریننگ لیں۔ تین دن کی ٹریننگ تھی، تین دن تک اُنھوں نے ٹریننگ لی۔ پھر جگنو والوں نے آ کر بتایا کہ اس طرح آپ نے کلاس سیٹ کرنی ہے۔اس کے بعد پڑھانے کا کام شروع ہوا تو اس کا نتیجہ ویسا ہی نکلا جیسا کہ جگنو والوں نے دعوا کیا تھا۔ میاں صاحب کی فیکٹری کے جو بالکل اَن پڑھ لوگ تھے اُنھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس سے فیکٹری کو بھی فائدہ ہوا۔ ان میں سے بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو پروموشن ملی، جو بالکل ان پڑھ لوگ تھے۔وہ آج کل فیکٹری میں سپروائزر ہیں۔

فیکٹری کے پاس بارہ، تیرہ سو ملازمین ہیں۔نیشنل فوڈز میں بھی ہزار سے اوپر ہی ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے جن کی تعداد سیکڑوں تھی بالکل ان پڑھ تھے۔ اب اس پروگرام کی بدولت وہ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے ہیں۔ اسے مزید کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں کی کوشش ہے کہ اس پروگرام کو دوسرے کارخانوں اور اداروں میں بھی پھیلائیں۔ انڈسٹری میں ان کے جتنے بھی واقف کار ہیں۔ ان سے درخواست کی ہے کہ وہ بھی نیشنل فوڈز کی پیروی کریں اور اپنے ملازمین کو تعلیم دلوائیں۔تو اس کے جواب میں کریسنٹ ٹیکسٹائل گروپ نے یہ سارا سسٹم اپنے ہاں رائج کیا ہوا ہے، انگلش بسکٹ فیکٹری والوں نے رائج کیا ہوا ہے۔ سوئی ناردرن گیس والوں نے اسے شامل کر لیا ہے اس طرح بہت سے اداروں نے اسے اپنے ہاں کامیابی سے رائج کیا ہے اور ان کے ملازمین اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ساری انڈسٹری اس پروگرام کو اختیار کر لیتی ہے اور یہ تہیّہ کر لیتی ہے کہ ہمارے جتنے بھی ورکرز ہیں ان کو پڑھانا ہے ان کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے تو اس سے ان کو بھی فائدہ ہوگا اور ورکرز کی فیملیز کو بھی فائدہ ہوگا۔

آج کل ایک تجزیہ کیا جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے یہ پروگرام پڑھا ہے اور اس پروگرام کے بعد جو سند حاصل کی ہے اس کے بعد ان پر کیا اثر ہوا ہے، ان کی زندگی پر، ان کے اردگرد ماحول کے اوپر کیا فرق پڑا ہے، اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور انشاء اللہ وہ جائزہ تھوڑا سا اور Deeply لیا جائے گا تو پتا چل جائے گا کہ اس کا بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ اس کے اثر کے ایک واقعے کے میاں صاحب بھی شاہد ہیں۔ لیاری کا ایک دور دراز علاقہ تھا، وہاں پر یہ پروگرام چل رہا تھا وہ اور ان کے ساتھی نجم صاحب دونوں رات کو وہاں گئے اور بہت دیر میں پہنچے۔ وہاں پر بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے اور کچھ نوجوان بھی۔ میاں صاحب نے ان سے پوچھنا شروع کیا کہ آپ کو اس پروگرام کا کیا فائدہ ہوا؟

ایک نوجوان لڑکا تھا 15،16 سال کا، اس نے کپڑے وغیرہ صحیح پہنے ہوئے تھے، شلوار قمیص، پٹھان لڑکا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ جی میں دکان میں کام کرتا ہوں اور میں وہاں پر اسسٹنٹ ہوں۔ دُکان میں چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ جب کوئی گاہک آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ چیز چاہیے تو مجھے ٹائم لگتا تھا دیکھنے میں کہ کون سی چیز کہاں پر پڑی ہے۔ اب میں نے آہستہ آہستہ چیزوں کے نام لکھ لیے ہیں اور ان کو وہاں پر لگا دیا ہے تو یہ میرے لیے بڑا آسان ہوگیا۔ ایک اور صاحب تھے ان کی عمر مڈل ایج میں تھی۔ ان سے میاں صاحب نے پوچھا کہ بھئی آپ کو اس کا کیا فائدہ ہوا؟ کہنے لگے کہ گورنمنٹ کا ایک ادارہ ہے میں اس میں مالی کا کام کرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ شوق تھا کہ مجھے پودوں کے نام یاد ہو جائیں۔ میں نے ان پودوں کے نام لکھنے شروع کیے ہیں تو اب مجھے اس میں بڑا فائدہ ہوا ہے۔ اب میں نئے نئے پودے ڈھونڈتا ہوں اور وہ لگاتا ہوں۔ ایک اور بزرگ آدمی تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے، باقی سب لوگ زمین پر بیٹھے تھے، میاں صاحب نے کہا کہ بھئی

آپ تو بزرگ آدمی ہیں، آپ کو کیا فائدہ ہوا؟ کہنے لگے دیکھیں جی میں ریٹائر بندہ ہوں، میں تو اب کام نہیں کرتا۔ بچے میرے پڑھے لکھے ہیں، شام کو جب بچے آتے تھے تو آپس میں باتیں کرتے تھے کہ بھئی آج یہ ہوا، وہ ہوا۔ اخبار میں یہ آیا ہے۔ تو میں ان کا منہ دیکھا کرتا تھا۔ اب میں اخبار پڑھتا ہوں اور جب بچے واپس آتے ہیں تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ بھئی تم نے اخبار میں پڑھا یہ کیا لکھا ہوا تھا، تو اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں فیملی میں واپس آ گیا ہوں۔ اسی طرح اور بھی لوگوں نے پڑھنے لکھنے کے فوائد بتائے۔

کئی ایسی کلاسیں ہیں جو عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس میں دادی، ماں، پوتی تینوں ایک کلاس میں بیٹھی ہوئی تعلیم لے رہی ہیں۔اس پروگرام کو اندھیرے سے اجالے کی طرف ایک سفر کا نام دیا گیا ہے۔ تعلیم بالغان ایسی چیز ہے جس کی طرف جانا چاہیے اور اس کی طرف جانا بہت ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہماری حکومت نے اس پر پیسے تو بہت خرچ کیے لیکن توجہ نہیں دی۔ جو چیز اس پروگرام کے تحت 300 روپے میں کرسکتے ہیں۔ یہی کام حکومت تین ہزار روپیہ فی بندہ خرچ کر کے بھی نہیں کر پا رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گورنمنٹ والوں کا اپنا ایک طریقۂ کار ہے۔ جب میاں صاحب نے اس سلسلے میں سٹی گورنمنٹ سے بات کی تھی تو نعمت اللہ خان صاحب ہی ناظم کراچی تھے، اُنھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ کام ہو، مگر اس کے لیے ایک کمرہ درکار ہوگا، وہاں پر ایک پنکھا ہوگا، وہاں پر ایک کولر ہونا چاہیے، ایک چپراسی ہونا چاہیے، ٹیچر ہونا چاہیے، یہ ہونا چاہیے، وہ ہونا چاہیے تو ان پر خرچا آتا ہے 12، 13 سو روپے کا۔ تو چار گنا زیادہ خرچ ہو رہا ہے،اور تعلیم پھر بھی نہیں مل رہی ہے۔

میاں صاحب کہتے ہیں کہ یہ کام گورنمنٹ کے بس کا نہیں ہے، یہ کمیونٹی کا

پروگرام ہے۔ جب تک کمیونٹی اس کے ساتھ شامل نہیں ہوتی، یہ پروگرام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بہت سے پروگرام کامیاب نہیں ہوئے۔ کمیونٹی کے پاس آپ جاتے ہیں تو وہ آپ کو جگہ بھی دے دیتی ہے۔ کمیونٹی کی اسی علاقے سے، اسی محلے سے، اسی گاؤں سے بچے بچیاں جو میٹرک پڑھے ہوئے ہیں، جو کام نہیں کر رہے، ان کو آپ لے لیں، ان کو آپ ٹیچرز کی ٹریننگ دے دیں، کتابیں آپ ان کو دے دیں تو کام چل سکتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ایسا کام ہے جس کے لیے یونائیٹڈ نیشن کی یا امریکن ایڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم سب تہیہ کرلیں کہ ہم نے قوم کو جہالت سے نکالنا ہے تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثالیں موجود ہیں، بہت سے ملکوں کی مثالیں ہیں۔ سری لنکا آپ کے سامنے ہے، اس کی مثال ہے۔ انڈیا میں کیرالہ جو ایک کمیونسٹ اسٹیٹ ہے یہ جنوبی بھارت میں ہے۔ اس نے تھوڑے عرصے میں، دس پندرہ سال میں ایجوکیشن اور لٹریسی کا ریٹ کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے یہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے بہت سی چیزیں چاہئیں۔ اس میں یہ ہے کہ آپ کو صرف **Determination** چاہیے اور سب لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ ملک میں جب تک سب پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوں گے، جب بچہ بوڑھا، جوان، عورت سب پڑھ لکھ نہیں جائیں گے تو آگے ترقی نہیں ہوسکتی ہے۔ نہ ڈیموکریسی چل سکتی ہے نہ کوئی اور ادارے چل سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم سب کو اپنی جگہ پر کوششیں کرنا ہوں گی۔ مختلف پلیٹ فارمز سے۔

اس کے علاوہ ایک ادارہ اور ہے جو غریب بچوں کی تعلیم کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس کا نام سیٹزن فاؤنڈیشن ہے۔ یہ ادارہ بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ اُنھوں نے ابھی تک 450 اسکول کچی آبادیوں میں قائم کیے ہیں۔ یہ سارے اسکول دور دراز علاقوں میں ہیں جہاں اور کوئی اسکول نہیں ہے۔ میاں صاحب کو جب پتا چلا تو وہ

اس ادارے میں گئے اور ان سے مدد کا پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ اپنی کمپنی سے پیسے دیں۔ تا کہ ہم اسکول کی بلڈنگ وغیرہ بنا سکیں۔ میاں صاحب نے کہا کہ میں ایک اور طریقے سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ جی کس طرح۔ میاں عبدالمجید صاحب نے کہا جو آپ کے اسکول ہیں وہ سہ پہر میں ہمیں دے دیں، ہم اس میں شام کو لٹریسی سینٹر چلائیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ جی ٹھیک ہے۔ اس میں یہ ہے کہ جگنو والے کتابیں مہیا کرتے ہیں، ٹیچرز کی ٹریننگ کرتے ہیں، پروگرام کو مانیٹر کرتے ہیں، سٹیزن فاؤنڈیشن والے اپنی جگہ دیتے ہیں اور نیشنل فوڈز جو میاں صاحب کی کمپنی ہے وہ کتابیں اور ٹیچرز کی تنخواہ دیتی ہے۔ اس طرح سے تقریباً سو سینٹرز چل رہے ہیں۔ نیشنل فوڈز میں فلاحی کاموں کے لیے الگ سے بجٹ رکھا جاتا ہے۔ اس بجٹ سے ملک بھر میں امدادی کام ہوتے ہیں۔ سارے پروگرام جو سٹیزن فاؤنڈیشن کے ہیں، ان کے تحت بلوچستان میں اسکول چل رہے ہیں اور سندھ کے انٹیریئر میں بھی اسکول ہیں، اب فرنٹیئر میں بھی اسکول بنا رہے ہیں تو وہاں پر بھی کام کریں گے۔ جہاں بھی ان کے اسکول ہوں گے، نیشنل فوڈز کا تعاون جاری رہے گا۔

میاں عبدالمجید صاحب ٹیکسٹائل کے آدمی ہیں اب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ٹیکسٹائل کی تعلیم کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ وہ ٹیکسٹائل یونی ورسٹی فیصل آباد کے بورڈ آف گورنرز میں بھی شامل ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی زراعت سے وابستہ ہے اور جب تک ہم ٹیکسٹائل پر کام نہیں کرتے ہم خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتے۔ پاکستان کو 67% زرمبادلہ ٹیکسٹائل سے حاصل ہوتا ہے اور 39 فیصد روزگار بھی اسی شعبے سے وابستہ ہے۔ بدقسمتی سے ہم ٹیکسٹائل کی تعلیم اور تحقیق پر وہ توجہ نہیں دے رہے جو ترقی یافتہ ملکوں نے دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بنگلہ دیش

ٹیکسٹائل کے شعبے میں پاکستان سے آگے ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کے خیال میں یہ سب کچھ وہاں ویلیوایڈڈ انڈسٹری کی وجہ سے ہوا۔ ان کے ہاں کپاس نہیں اُگتی لیکن وہ گارمنٹس میں لیڈر بنتے جارہے ہیں۔

یہاں ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ صنعت کے لیے اس درس گاہ کی بہت خدمات ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس درس گاہ کے بغیر ٹیکسٹائل انڈسٹری آج جس مقام پر کھڑی ہے ناممکن تھا۔ بھٹو صاحب نے جب تعلیم کو نیشنلائزڈ کیا تو اس کی زد میں یہ کالج بھی آ گیا اور آہستہ آہستہ اس کا معیارِ تعلیم بھی گرتا چلا گیا۔

نواز شریف صاحب جب وزیراعظم پاکستان بنے تو میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے رفقاء نے ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ مانچسٹر کے زیر اہتمام انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کروائی جس میں پاکستان کی انڈسٹری نے بھرپور حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں ٹیکسٹائل ملز کے مالکان نے نہ صرف بذات خود شمولیت کی بلکہ اس کو مالی مدد بھی کی۔ وہاں یہ سوال اُٹھایا گیا کہ ٹیکسٹائل میں اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئرز اور ٹیکنالوجسٹ کی کمی ہے اُسے پورا کرنا اشد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کالج کا معیارِ تعلیم بھی بڑھانا ضروری ہے۔ ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن کی طرف سے اس کالج کی ڈی نیشنلائزیشن کا مطالبہ کیا گیا جو بعد میں مان لیا گیا۔ اس طرح یہ کالج ان کی سرپرستی میں آ گیا۔

فروری 2002ء میں جنرل پرویز مشرف صاحب کے زمانہ میں اسے یونیورسٹی بنانے کا سوچا گیا جس کے لیے نیشنل ٹیکسٹائل ایجوکیشن فاؤنڈیشن رجسٹر ہوئی جس نے نومبر 2002ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دلوایا۔ میاں عبدالمجید ان دونوں اداروں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر ہیں بلکہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن بھی ہیں۔ آج کل یہ ادارہ پھر حکومت کے زیر انتظام چلا گیا ہے تاہم یہ پاکستان کی پہلی

ٹیکسٹائل یونیورسٹی ہے اور یہ اعزاز ہمیشہ قائم رہے گا۔

ٹیکسٹائل کالج / یونیورسٹی کی طرح محبِّ وطن مل مالکان نے کراچی میں بھی ایک ٹیکسٹائل کا ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کی ایک کمیٹی بنائی جس کے سربراہ میاں محمد رفیع صاحب (کریسنٹ گروپ) کو بنایا گیا۔ 1991ء میں ٹیکسٹائل کانفرنس لاہور سے ہی اس کی تحریک شروع ہوئی۔ 1992ء میں امریکہ میں World Textile Teachers Conference منعقد ہونے والی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہمارا ایک وفد وہاں جائے اور کراچی میں ادارہ قائم کرنے کے لئے کسی اچھے ادارہ سے الحاق کی بات چیت کرے۔

میاں رفیع صاحب کی ایما پر یہ وفد امریکہ گیا جس کی قیادت ایس ایم عثمان صاحب مرحوم نے کی، جو ٹیکسٹائل ملز اونرز ایسوسی ایشن کے سیکریٹری جنرل تھے۔ اس میں میاں عبدالمجید، مرحوم خلیل الرحمٰن اور مرحوم حفیظ الدین خاں شامل تھے۔ اس طرح Clemson University جو امریکہ کی ٹیکسٹائل میں مشہور ہے، سے رابطہ ہوا۔ جس کے ساتھ 1994ء میں معاہدہ طے پایا۔ اس طرح ٹیکسٹائل یونیورسٹی آف پاکستان کے نام سے ایک کرائے کی جگہ پر یہ ادارہ قائم ہوا۔ اب کمیٹی کی تشکیل نو کی گئی ہے جس کے سربراہ جناب فاروق سُمار صاحب ہیں جو آج بھی یہ فریضہ بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی محنت اور جناب احمد حبیب صاحب مرحوم (گل احمد ٹیکسٹائل) اور ان کے رُفقاء نے ایک خوب صورت کیمپس کراچی کے باہر تعمیر کروایا۔ اسے Degree Awarded Inistitute بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حکومت سندھ نے 98-1997ء میں Textile Institute of Pakistan کے نام سے یہ چارٹر دیا۔

یہ درس گاہ کراچی سے باہر ایک پُرفضا مقام پر ہے۔ جدید ترین لیبارٹریاں اور

خوبصورت بلڈنگ بنائی گئی ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب دل و جان سے اس ادارے کے ساتھ کام کر رہے ہیں ان کی میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ذہین طلبہ کے لیے اسکالرشپ کا اہتمام کرتے ہیں۔ ٹی آئی پی میں ٹیکسٹائل کی جدید ترین تعلیم دی جاتی ہے۔ گورنر سندھ اس کے سرپرست ہوتے ہیں۔ یہاں اساتذہ کا تعلیمی معیار بھی قابل دید ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب اس کے بھی بورڈ آف گورنرز میں شامل ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ اسکالر ڈاکٹر اقبال احمد اس کے چانسلر رہے ہیں۔ وہ میاں عبدالمجید صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ عالمی سطح پر ان کا نام پروفیسر نوم چومسکی اور ایڈورڈ سعید کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب ٹی آئی پی کے کانووکیشن کے موقع پر ایک ذہین اور غیر معمولی طالب علم کو اقبال احمد میموریل ایوارڈ اور اس کے ساتھ نقد انعام دیتے ہیں۔ یعنی ایک بڑے آدمی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک عمدہ طریقہ ہے۔ عرفان حسین معروف کالم نویس بھی ہیں وہ اس ادارے کے چانسلر رہ چکے ہیں۔ میاں عبدالمجید صاحب ٹی آئی پی کی دامے درمے سخنے قدمے مدد کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی ٹی آئی پی کو کوئی مسئلہ درپیش ہو میاں عبدالمجید صاحب اس کے حل کے لیے پیش پیش رہتے ہیں۔ میاں صاحب کا وژن یہ ہے کہ ٹی آئی پی کو سیاسی مداخلتوں سے پاک رکھا جائے۔ اس کا ماحول خالصتاً علمی اور فنی ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ ڈگری پروگرام ایسا ہونا چاہیے جس سے ٹیکسٹائل انڈسٹری کو فائدہ پہنچے۔ اس لیے ٹی آئی پی کے کلاس رومز اور اس کے باہر ایک خوب صورت ماحول ہے۔ ٹی آئی پی میں ٹیکسٹائل ریسرچ اینڈ انوویشن سینٹر کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے جو میاں عبدالمجید صاحب کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ یہاں بین الاقوامی معیار کی تحقیق کریں اور قوم کو بتائیں کہ اس وقت پاکستان کو ٹیکنیکل ٹیکسٹائل کی کس قدر ضرورت ہے اور بیرونی دنیا میں ہونے والی ریسرچ سے

بھی اپنے آپ کو اَپ ڈیٹ رکھیں۔ اس سینٹر کے ذریعے میاں عبدالمجید صاحب کے اہداف یہ ہیں کہ اس ریسرچ سینٹر کا عالمی اور مثالی اداروں کے ساتھ تحقیقی میدان میں اشتراک عمل ہو۔ سیمیناروں اور ورکشاپس کے ذریعے نئی ٹیکنالوجی کے متعلق آگاہی پیدا کی جائے۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری کو نئی اور جدید ٹیکنالوجی کی منتقلی کے راستے دکھائے جائیں اور ایسے تحقیق کار نوجوان اس ادارے میں تیار کیے جائیں جو مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ٹی آر آئی سی (ٹیکسٹائل ریسرچ اینڈ انوویشن سینٹر) میں ریسرچ اسکالرز ٹیکنیکل ٹیکسٹائل کے لیے سنجیدہ کوششیں کر رہے ہیں۔ میڈیکل اور جیو ٹیکسٹائل بھی اس میں شامل ہیں۔ ٹی آئی پی کو شاید ان چند صفحات سے سمجھا نہ جا سکے۔ دیکھنے اور مشاہدے کے بعد ہی اندازہ ہو گا کہ میاں عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھی اس ادارے کے ذریعے ٹیکسٹائل کی تعلیم کے فروغ کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ جس کے ثمرات آئندہ نسلیں اٹھائیں گی۔ میاں عبدالمجید صاحب یہاں روایتی تعلیم کے بجائے تحقیق و تخلیق پر زور دیتے ہیں۔ اس ادارے کے سربراہ ڈاکٹر زبیر بندوق دا ایک وژنری اور باصلاحیت انسان ہیں۔ وہ میاں عبدالمجید صاحب کی مشاورت سے اس کے لئے شبانہ روز محنت کر رہے ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے متحدہ ہندوستان میں نظریۂ پاکستان کی حقانیت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میاں عبدالحمید صاحب 1940ء کی تاریخی قرارداد پاکستان میں اپنے والد کے ساتھ شریک تھے۔ میاں عبدالمجید صاحب کی کمسنی کا مشاہدہ ہے کہ مسلمان اور ہندو ایک ساتھ صدیوں رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہیں۔ ان کے معاشی رویے، سیاسی سوچ اور سماجی روایات ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ پھر انھوں نے بچپن میں دیکھا کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کا نہیں کھاتے تھے۔ چھوت چھات، ذات پات کی

اس تقسیم نے میاں عبدالمجید صاحب کو شروع سے متنفر کر رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ انسانوں میں مساوات کے قائل ہیں۔ ہندو کی اس سوچ نے مسلمانوں کو دو قومی نظریہ کی راہ دکھائی اور وقت نے ثابت کیا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ہندو مسلمانوں پر بالادستی کا خواہاں تھا جبکہ مسلمان کی سرشت میں ہمیشہ آزادی اور خودمختاری رہی ہے۔ میاں عبدالمجید صاحب کے والد کلاسکے میں مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ اور نظریاتی اعتبار سے میاں عبدالمجید صاحب ہمیشہ قائداعظم کے پیروکار رہے۔ میاں عبدالمجید صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ آج پاکستان میں جو علاقائی اور لسانی جھگڑے ہیں اس کی وجہ نئی نسل کا نظریۂ پاکستان سے ناآشنا ہونا اور دوسرا پُرانی نسل موجودہ نسل کو اکابرین تحریکِ پاکستان کے نظریات اور قربانیوں کی داستانیں منتقل نہیں کر سکی۔ نظریۂ پاکستان میاں عبدالمجید صاحب کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب تو نظریۂ پاکستان ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن ٹرسٹ کو قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کا خیال سابق وزیرِاعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں صاحب کو آیا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جیسے جیسے نئی جنریشن آتی جائے گی وہ تو اس جدوجہد کو اور ان قربانیوں کو بھولتی جائے گی جو پاکستان کے لیے ان کے بزرگوں نے دی ہوئی ہیں۔ ان کا خیال بالکل صحیح تھا اسی لیے اُنھوں نے یہ ایک کام کیا تھا کہ ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے جو نظریۂ پاکستان کی ترویج کرتا رہے، ایک **Reminder** کے طور پر بتاتا رہے کہ بھئی کس طرح پاکستان بنا تھا اور جس وقت پاکستان بنا تھا اس وقت قوم کے ساتھ کیا وعدے کیے گئے تھے۔ ان کو پورا نہیں کیا گیا تو کیوں نہیں کیا گیا؟ تو ان کو سامنے رکھا جائے کہ پاکستان بنتے وقت یہ وعدے کیے گئے تھے کہ پاکستان ایک فلاحی اسلامی مملکت ہوگی۔ اب تک اگر نہیں ہوئی، تو کیوں نہیں ہوئی؟، ان سوالوں کا

جواب تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے کچھ فنڈز بھی دے دیے اور جگہ بھی دی اور اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مسلم لیگ ورکرز فنڈ بھی قائم کیا تھا۔ یہ آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اس کا مقصد جنھوں نے پاکستان کے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں۔ ان کی خدمات کو یاد رکھنا تھا۔ میاں صاحب کی نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے ساتھ پرانی وابستگی ہے۔ جب سے یہ ٹرسٹ بنا ہے وہ اس کے ساتھ منسلک ہیں۔

میاں صاحب جب لاہور جاتے تھے تو ڈاکٹر رفیق احمد صاحب سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ان کے پرانے دوست ہیں۔ ڈاکٹر رفیق احمد صاحب لاہور میں نظریۂ پاکستان ٹرسٹ میں اعزازی سکریٹری کے طور پر کام کررہے تھے۔ جب میاں صاحب ان کے پاس جاتے تو وہاں پروہ مختلف کام کررہے ہوتے تھے ان پر بات چیت ہوتی تھی کہ وہ کیا کررہے ہیں، کتابیں بن رہی ہیں، اس کی پلاننگ ہورہی ہے۔ ٹرسٹ کی عمارت میں بہت بڑی لائبریری قائم ہوگی، وہاں پر ہال بنے گا، وہاں پر تقریب کے لیے جگہ ہوگی ایسی باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے میاں عبدالمجید صاحب سے کہا، ''آپ کراچی میں کیوں نہیں یہ کام شروع کرتے؟''

اُنھوں نے جواب دیا۔ ''کراچی میں کام شروع کرنے کی تو ایسی بات نہیں ہے، شروع کرلیں گے لیکن میرا جو طریقہ ہے وہ مختلف ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی نئی نسل کے اوپر پوری توجہ دینی چاہیے۔ جو موجودہ نسل ہے یا جو نسل گزر چکی ہے۔ اس کو یہ محرومی اس لیے نظر آتی ہے کہ پاکستان کے ثمرات انھیں ملے نہیں ہیں۔ پاکستان بنتے ہوئے جو وعدے کیے گئے تھے فلاحی مملکت بنانے کے، Equal Oppertunities ہونی چاہئیں تھیں، ایجوکیشن سب کے لیے ہونی چاہیے تھی، ہیلتھ سب کے لیے ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ملی۔ اس لیے انھیں تو پاکستان بننے کی وجہ معلوم نہیں ہے کہ پیچھے کیا ہوا ہے۔ نئی نسل تو کہتی ہے کہ جی ہمیں کیا ملا ہے۔

جب وہ ٹیلی وژن دیکھتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، ریڈیو سنتے ہیں تو ان کو نظر آتا ہے کہ ہمیں کیوں مقام نہیں ملا، ہم کیوں محروم ہیں، ہم کیوں پس ماندہ ہیں، کس چیز کے گناہ گار ہیں؟ تو ہمیں چاہیے کہ جو نئی نسل ہے اس میں یہ کام شروع کیا جائے اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ٹھیک ہے بہت سی چیزیں نہیں ہوئیں لیکن اس میں پاکستان کا قصور نہیں ہے۔ اس میں قصور ہم سب لوگوں کا ہے۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔"

ڈاکٹر رفیق احمد صاحب ان کی بات سے متاثر ہوئے تھے۔" آپ نے ٹھیک کہا ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آپ اسے کراچی میں شروع کریں۔"

نصرت مرزا صاحب کالم نویس ہیں، وہ مجید نظامی صاحب کے بھی بہت قریب تھے، ڈاکٹر رفیق احمد صاحب سے بھی ملتے رہتے تھے تو ایک دن میاں عبدالمجید صاحب کو نصرت مرزا صاحب کا فون آیا۔" ڈاکٹر رفیق صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے آکر ملوں"۔

میاں صاحب نے کہا" بالکل جی بسم اللہ آیئے"۔

میاں صاحب اس وقت تک نصرت مرزا سے پہلے نہیں ملے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ نظریۂ پاکستان ٹرسٹ اب فاؤنڈیشن بن گئی ہے۔ فاؤنڈیشن میں گورنمنٹ اپنا کچھ نہ کچھ حصہ رکھنا چاہتی تھی۔ کچھ ممبرز کو گورنمنٹ نام زد کرتی تھی۔ تو ٹرسٹ سے اس کو فاؤنڈیشن میں تبدیل کردیا گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ فاؤنڈیشن یہاں کس نام سے کام کرتی۔ قوانین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میاں عبدالمجید صاحب اور نصرت مرزا صاحب نے کراچی میں سندھ کمیٹی کے نام سے کام شروع کرنے کی تجویز دی اور اس کمیٹی نے سندھ میں کام شروع کیا۔ نصرت مرزا صاحب بہت بڑے دانش ور ہیں اُنھوں نے میاں صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا اور سب سے پہلے میاں عبدالمجید

صاحب نے ان سے یہی کہا کہ اسکولوں میں بچوں کے درمیان تقاریر کرواتے ہیں۔ اس وقت نعمت اللہ خاں صاحب ناظم کراچی تھے۔ نصرت مرزا صاحب کے ان سے اچھے مراسم تھے تو وہ ان کے ساتھ ناظم صاحب کے پاس چلے گئے۔ ناظم صاحب بہت اچھے طریقے سے پیش آئے اُنھوں نے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔کراچی میں نظریۂ پاکستان کا کام ضرور کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے اپنے ای ڈی او ایجوکیشن کو بلایا اور کہا کہ آپ ان حضرات کے ساتھ تعاون کریں۔ اس طرح اُنھوں نے تقریری مقابلوں کا کام شروع کیا۔ یہ کام اسکولوں میں شروع ہوا اور اس میں سب سے پہلا مقابلۂ تقریر جو تھا، اس کا موضوع تھا ''نظریۂ پاکستان آج بھی زندہ ہے'' یہ بالکل نیا موضوع تھا جو نصرت مرزا صاحب نے چنا تھا اور اُنھوں نے ہی اس کا خیال پیش کیا تھا۔

شروع میں صرف یہ دونوں تھے۔ اس کام میں بہت سی رکاوٹیں آئی تھیں۔ جب کوئی چیز نئی آتی ہے تو اسے اپنا رنگ جمانے میں کچھ وقت لگتا ہے۔کامیابی جلدی سے نہیں ملتی ہے اس کے لیے بہت ساری محنت اور اس سے بھی زیادہ صبر درکار ہوتا ہے۔یہ بات میاں عبدالمجید صاحب سے زیادہ کون جان سکتا ہے جن کی ساری عمر ہی محنت کرتے گزری تھی۔وہ نصرت مرزا صاحب سے یہی کہتے تھے کہ نصرت صاحب کامیابی اپنے زور بازو کی اچھی لگتی ہے۔ مرزا صاحب کہتے تھے کہ فلاں بڑا آدمی ہے اس کو شامل کرلو۔اور میاں عبدالمجید صاحب کہتے تھے۔'' چھوڑیں کسی کو کیا شامل کرنا ہے، کارواں چلے گا تو خود ہی لوگ شامل ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پھر فائنل Debate۔ ایف ٹی سی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی تھی۔اور اس کا سارا خرچہ نصرت مرزا صاحب، میاں عبدالمجید صاحب اور کچھ ان کے دوست انجم سلیم صاحب نے کیا۔ انجم سلیم صاحب نے کہا کہ میں یہ ضرور کرسکتا ہوں کہ جتنا

بھی آپ کا خرچا ہوگا اس کا بل آپ مجھے دے دیں تو میں آپ کو اس کی پے منٹ کردوں گا۔ اس کے ساتھ نیشنل فوڈز نے بھی اس معاملے میں مدد کی تھی۔ اُنھوں نے اپنا بینر دیا۔ انگلش بسکٹ والوں نے بینر دیا۔ کچھ اور دوست تھے جن سے اُنھوں نے کہا تو اُنھوں نے بینر دیے۔اس طرح یہ ایک اچھا پروگرام ہوگیا۔ اس پروگرام میں میاں عبدالمجید صاحب نے اپنے دوستوں اور ان کی فیملیز کو بلایا تھا۔ وہ حیران رہ گئے کہ بچوں نے کس طرح تقریریں کی ہیں، کس طرح ان کی الفاظ کی ادائگی تھی، اور کس جوش و جذبے سے وہ بات کر رہے تھے۔ بہت سوں نے کہا کہ ہم بھی اس میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر اکرم کھوکھر صاحب ، طارق سعود صاحب ، ڈاکٹر منصور ڈار صاحب اور اس وقت حمید پراچہ صاحب مرحوم زندہ تھے، یہ سب لوگ بھی اس کارواں میں شامل ہوگئے۔ یہ پہلے سال کی کارکردگی تھی اور اس کی اخبارات میں رپورٹنگ بھی ہوئی تھی۔

پہلے سال تو مجید نظامی صاحب شامل نہیں ہوئے تھے لیکن اس کے بعد کے جو تقریری مقابلے ہوئے اُن میں وہ تشریف لائے تھے اور جب اُنھوں نے بچوں کا جوش و جذبہ دیکھا تو اُنھوں نے لاہور جا کر ایک تجویز دی کہ ان بچوں کو انعام دیا جائے۔تو وہ بچے جنھوں نے فائنل مقابلے میں حصہ لیا تھا،ان بچوں کو ڈاکٹر اکرم کھوکھر اور ڈاکٹر منصور ڈار صاحب نے اسکالرشپ دینے کا اعلان کیا۔اور اس کے ساتھ ایک کیش ایوارڈ بھی تھا۔اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو لاہور بھی بھیجا گیا تھا۔تو یہ ایک نئی شروعات تھی۔ پھر ڈاکٹر رفیق احمد صاحب نے بچوں کو لاہور میں بہت اچھی رہائش اور دوسری سہولیات دی تھیں۔ ڈاکٹر رفیق احمد صاحب اور میاں عبدالمجید صاحب نے آپس میں مشورہ کر کے طلبہ کے دورے کا نام ''کاروانِ یکجہتی و خیرسگالی'' رکھا۔

اس کے بعد سے ہر سال جو بچے تقاریر میں آگے آتے ہیں تو اس کارواں کے ساتھ آگے جاتے ہیں اور لاہور میں ان کی پذیرائی ہوتی ہے اور اب تو دوسرے شہروں سے بھی بچے آنا شروع ہوگئے ہیں۔اس کام میں بہت سے لوگ میاں صاحب کے ساتھ شامل ہیں جو اس وقت بھی ان کے ساتھ کام کررہے ہیں، ان کا بہت اہم کردار ہے۔

جس کام کا آغاز میاں عبدالمجید صاحب نے کیا تھا وہ آج بھی اسی طریقے سے جاری ہے۔ بلکہ اس میں اب خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اب طلبہ کے ساتھ کچھ ٹیچرز بھی لاہور جاتے ہیں، پچھلے سالوں میں یہاں سے ای ڈی اوز کو بھی بھیجا گیا۔ وہاں پر ان کی پذیرائی ہوئی۔ اور ایک چیز اور جس کا ذکر ضروری ہے۔کہ ناظم کراچی نعمت اللہ صاحب خود ایک دفعہ لاہور گئے اور وہاں کے ناظم میاں عامر محمود صاحب کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی اور دونوں شہروں کو نظریاتی جڑواں شہر قرار دیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ کچھ اسکولز کو ہم جڑواں اسکولز بنادیں گے، کچھ کالجز کو جڑواں کالجز بنادیں گے۔ وہ بہت اچھا آئیڈیا تھا، بہت اچھی اسکیم تھی اور اس کی پبلسٹی بھی ہوئی۔لیکن بدقسمتی سے لاہور سے رسپانس نہیں ملا تھا اور پھر وہ اسکیم اسی طرح رہ گئی۔ اگر وہ اسکیم پوری قوت سے چل جاتی تو نظریۂ پاکستان کی تحریک اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتی۔ جون 2009ء میں کراچی ریجنٹ ہوٹل میں اسکولوں کے طلبہ کا کراچی سطح کا تقریری مقابلہ انتہائی قابل دید تھا۔ بچوں کا جوش وخروش، جذبہ اور پاکستان سے جذباتی وابستگی دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کا آنے والا کل تاریک ہے۔ بچوّں نے اپنی تقریروں کے ذریعے بہت سارے مایوس لوگوں میں اُمید کی شمع روشن کی۔ اسی پروگرام میں مہمانِ خصوصی بنگلہ دیش کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے جب کہ صدر تقریب سندھ کے صوبائی وزیر تعلیم پیر مظہرالحق تھے۔ نظریۂ پاکستان کے

پلیٹ فارم سے منعقد ہونے والے یہ پروگرام علاقائی اور لسانی عصبیتوں سے اَٹے اس معاشرے میں اُمید اور یقین کے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔

میاں عبدالمجید صاحب کے خیال میں اگر آدمی میں خدمت کا جذبہ ہو تو وہ سیاست میں آئے بغیر بھی ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔اور جس قسم کی سیاست ہمارے ملک میں ہے اس میں عوام کی خدمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔یہی وجہ تھی کہ میاں عبدالمجید صاحب کو کبھی بھی سیاست میں آنے کا شوق نہیں ہوا۔ جس طرح وہ باہر بیٹھ کر ملک کی خدمت کر رہے ہیں، سیاست میں اس سے زیادہ خدمت نہیں ہو سکتی تھی۔ حالاں کہ ان کو پیش کش ہوتی رہی تھیں۔ ایک بار نواز شریف صاحب آئے تھے اور اُنھوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کام کریں۔ میاں عبدالمجید صاحب نے کہا کہ جی ہم تو آپ کے ساتھ ہی ہیں لیکن ہم اپنا کام کرتے رہیں، آپ اپنا کام کرتے رہیں۔ مذہبی جماعتوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ مذہبی جماعت تو ایک ہی ہے اور وہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جماعت۔

ان کی بڑی مذہبی شخصیات سے ملاقاتیں رہی تھیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ایک آدھ دفعہ ملاقات ہوئی۔ زیادہ تفصیل سے نہیں ہوئی۔ قابل ذکر مذہبی اسکالرز کو ضرور سنتے ہیں، ہر آدمی کا اپنا مسلک ہے وہ اس میں آزاد ہے۔ ہر ایک کا اپنا مقصد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل مذہب ایک پیشہ بن گیا ہے۔ شخصیت کے اردگرد ہی مذہب گھومتا ہے۔ اور شخصیت کا تو اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اسلام تو بھائی چارے کا مذہب ہے۔یعنی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے کمزور مسلمان بھائی کی مدد کرے اور کچھ نہیں تو اس کے لیے دعا ہی کرے۔اسلام اصول کا نام ہے اگر کوئی شخص یا جماعت اصول ترک کرتی ہے تو وہ دراصل اسلام ترک کر دیتی ہے۔اسلام میں منافقت کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں میاں عبدالمجید صاحب پُراُمید ہیں۔ اسلام میں مایوسی تو گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ اپنے آپ سے مایوس ہونا چاہیے۔ میاں عبدالمجید صاحب کے خیال میں حکومت کی پالیسیاں ٹھیک ہوجائیں اور وہ ایک ہی کام پوری لگن سے کرے کہ تعلیم تعلیم اور تعلیم۔ ہر سطح کے اوپر، ہر جگہ تعلیم کو بہتر کرنا ہے، اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر آپ یہ کام کرلیں گے تو ملک کے لیے بہت سے راستے کھل جائیں گے۔ زراعت میں دیکھیں کہ کتنے لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ دو فیصد سے بھی کم ہوں گے۔ آج کل زراعت بھی کسی صنعت کی طرح سائنٹیفک ہوگئی ہے۔ اگر اس میں کام کرنے والے تعلیم یافتہ ہوں گے تو نتیجہ سو فی صد ہوگا۔ اور اگر زراعت کو اَن پڑھ افراد کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تو زراعت اور ملک کیسے ترقی کرے گا۔ اگر کسان پڑھے لکھے ہوں گے تو اُنھیں پتا ہوگا کہ پانی کا استعمال کیسے کرنا ہے، بیج کیسے بونا ہے، کھاد کو کس طرح سے استعمال کرنا ہے۔ اگر حکومت آنے والے دس سالوں میں تعلیم کو قومی پالیسی بنا لے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگلے دس سال میں پاکستان ترقی یافتہ ممالک میں شامل نہ ہو۔

۞۞۞

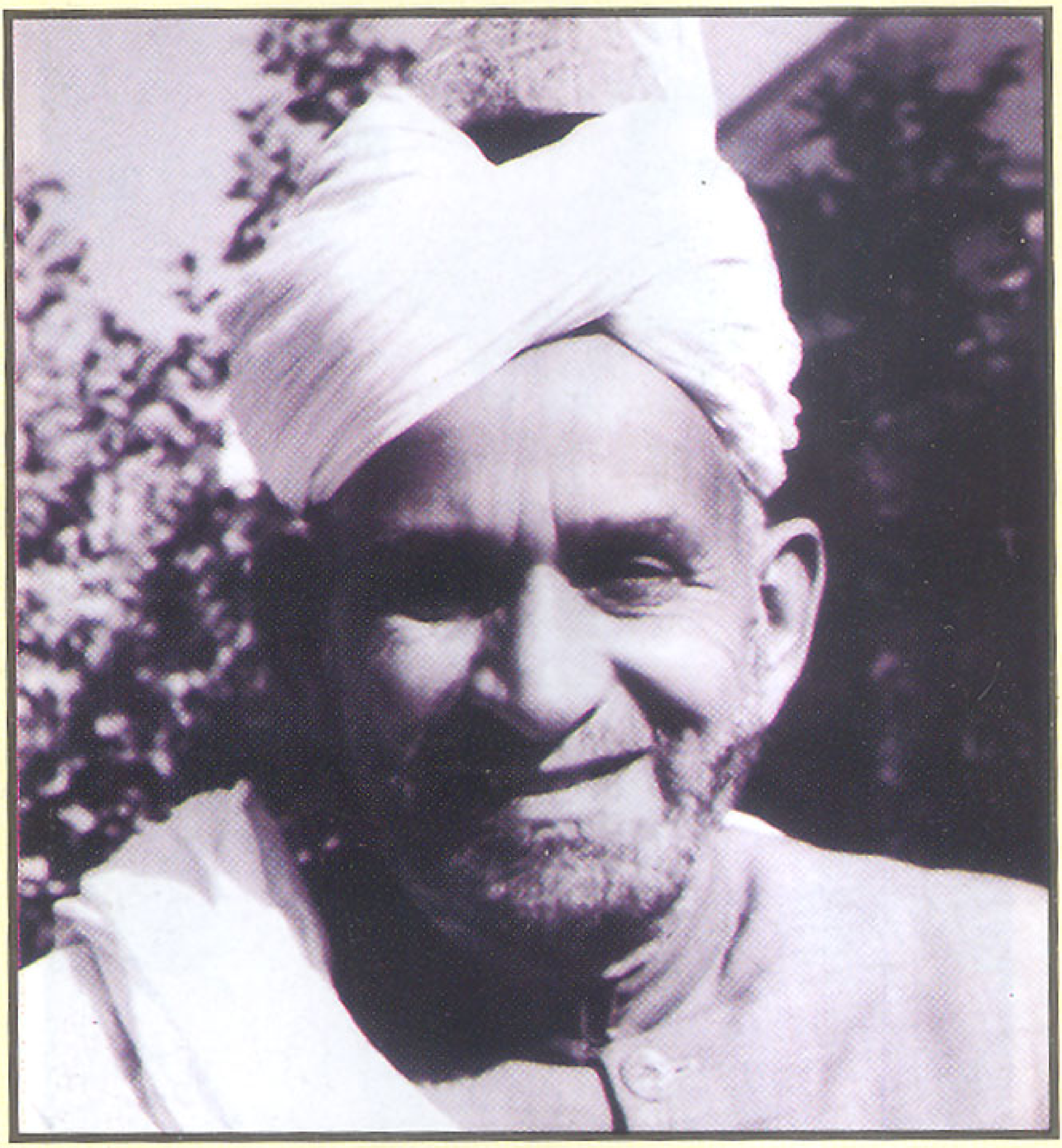

میاں عبدالمجید کے والد محترم میاں امام الدین (مرحوم)

میاں عبدالمجید کے بڑے بھائی میاں عبدالرشید (مرحوم)

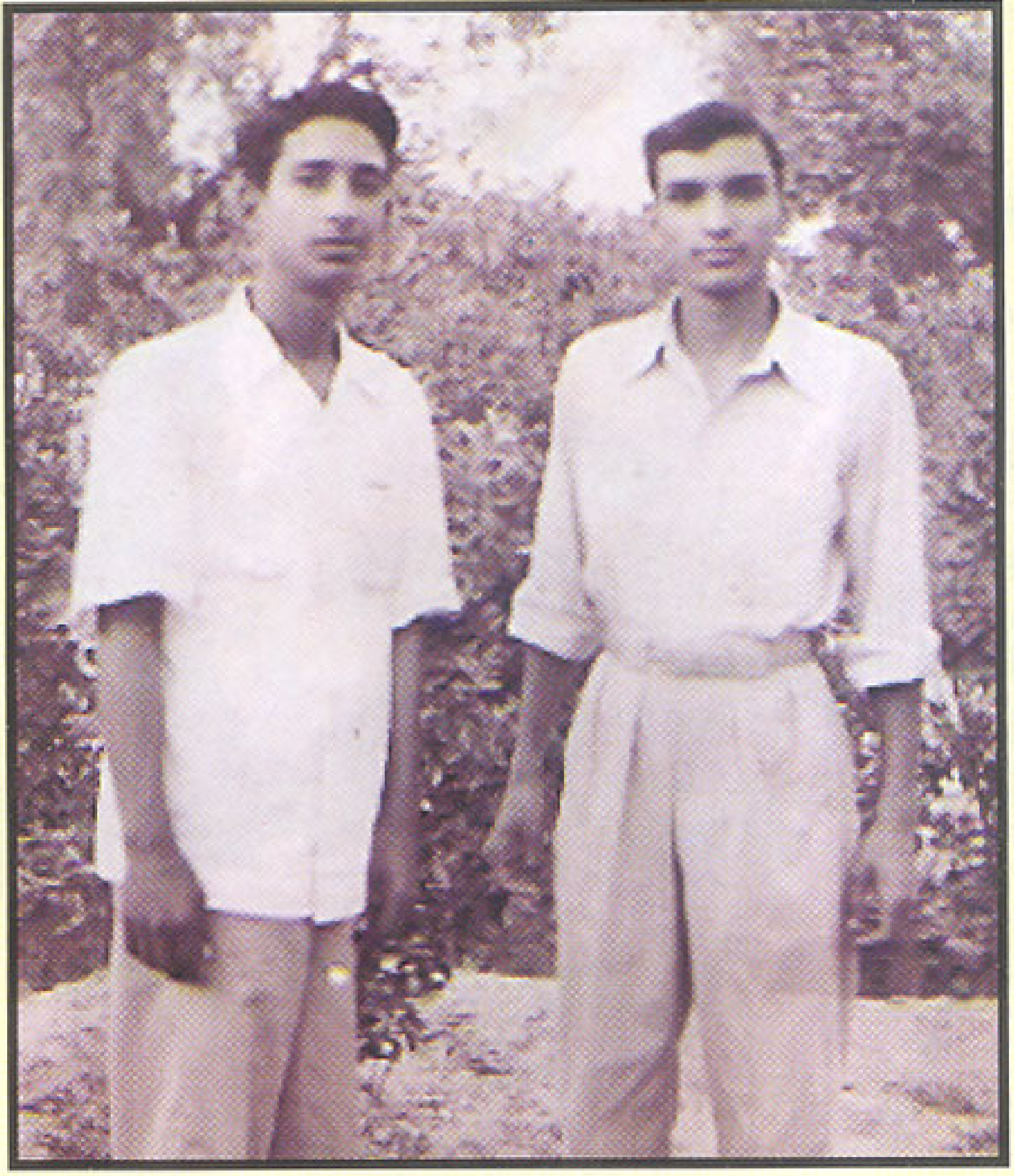

میاں عبدالمجید زمانہ طالب علمی کے ایک دوست امان اللہ خان (مرحوم) کے ساتھ

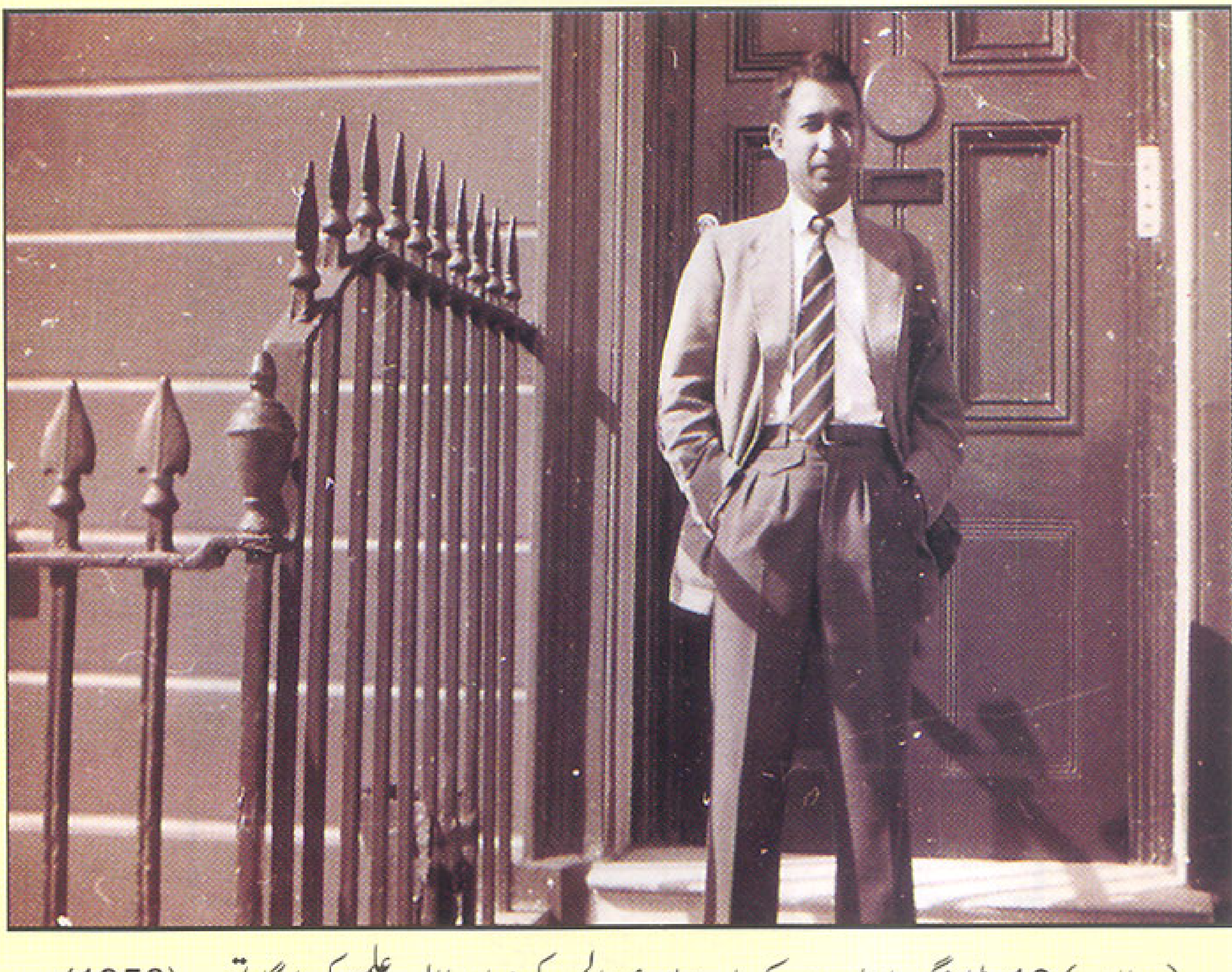

(برطانیہ) 10-ڈاوننگ اسٹریٹ کے باہر میاں عبدالمجید کی زمانہ طالب علمی کی یادگار تصویر (1956)

میاں امام الدین، میاں عبدالرشید، بیگم میاں عبدالرشید اور اُن کے بچے
(سمن آباد 1954-55ء)

فرشی نشست (دائیں سے بائیں) میاں عبدالمجید یوم پاکستان کے موقع پر دوستوں کے ہمراہ
(مانچسٹر 1957)

میاں عبدالمجید مانچسٹر میں اپنے دوستوں کے ساتھ (1956ء)

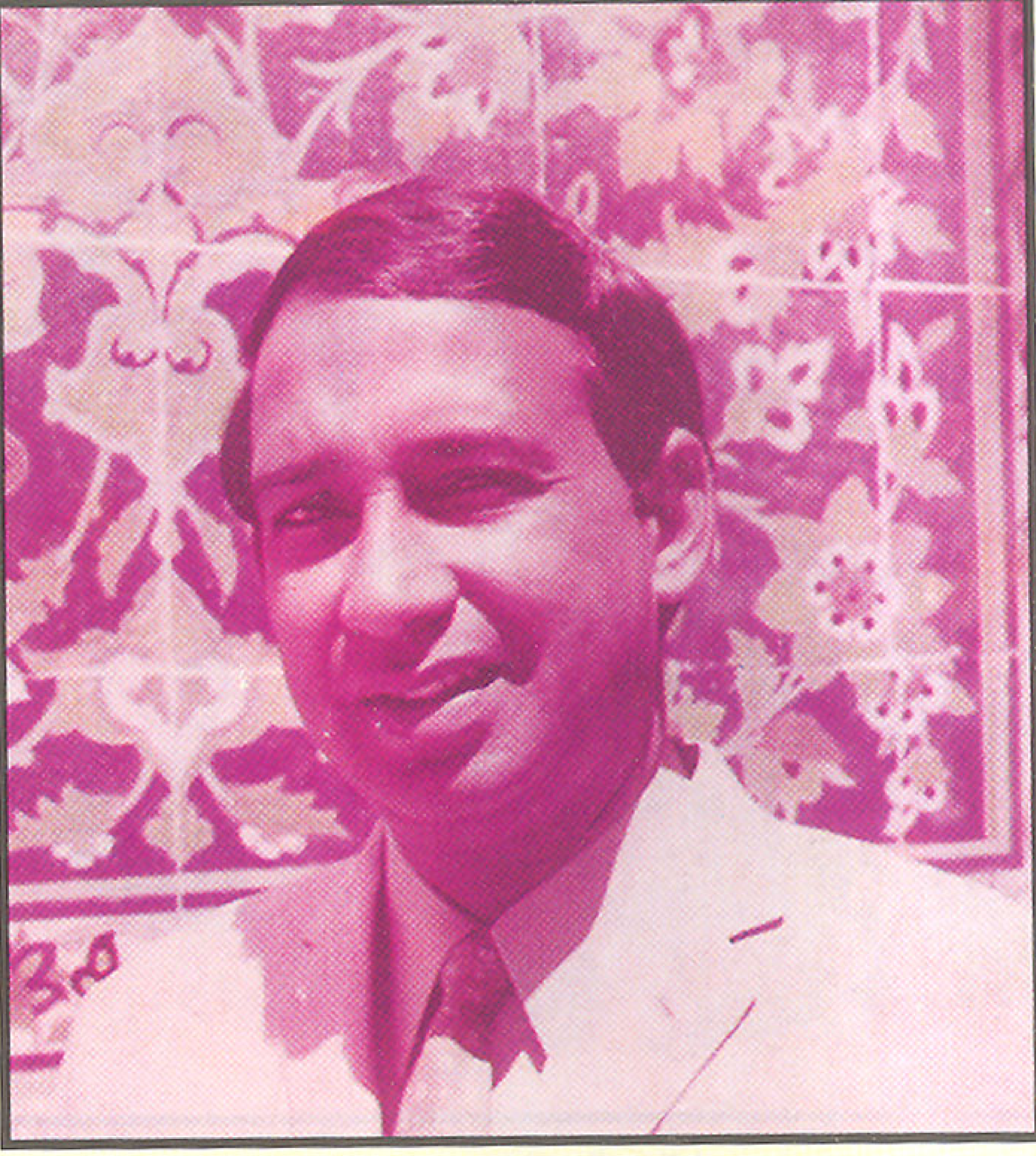

میاں عبدالمجید جوانی کی ایک یادگار تصویر (مانچسٹر 1956ء)

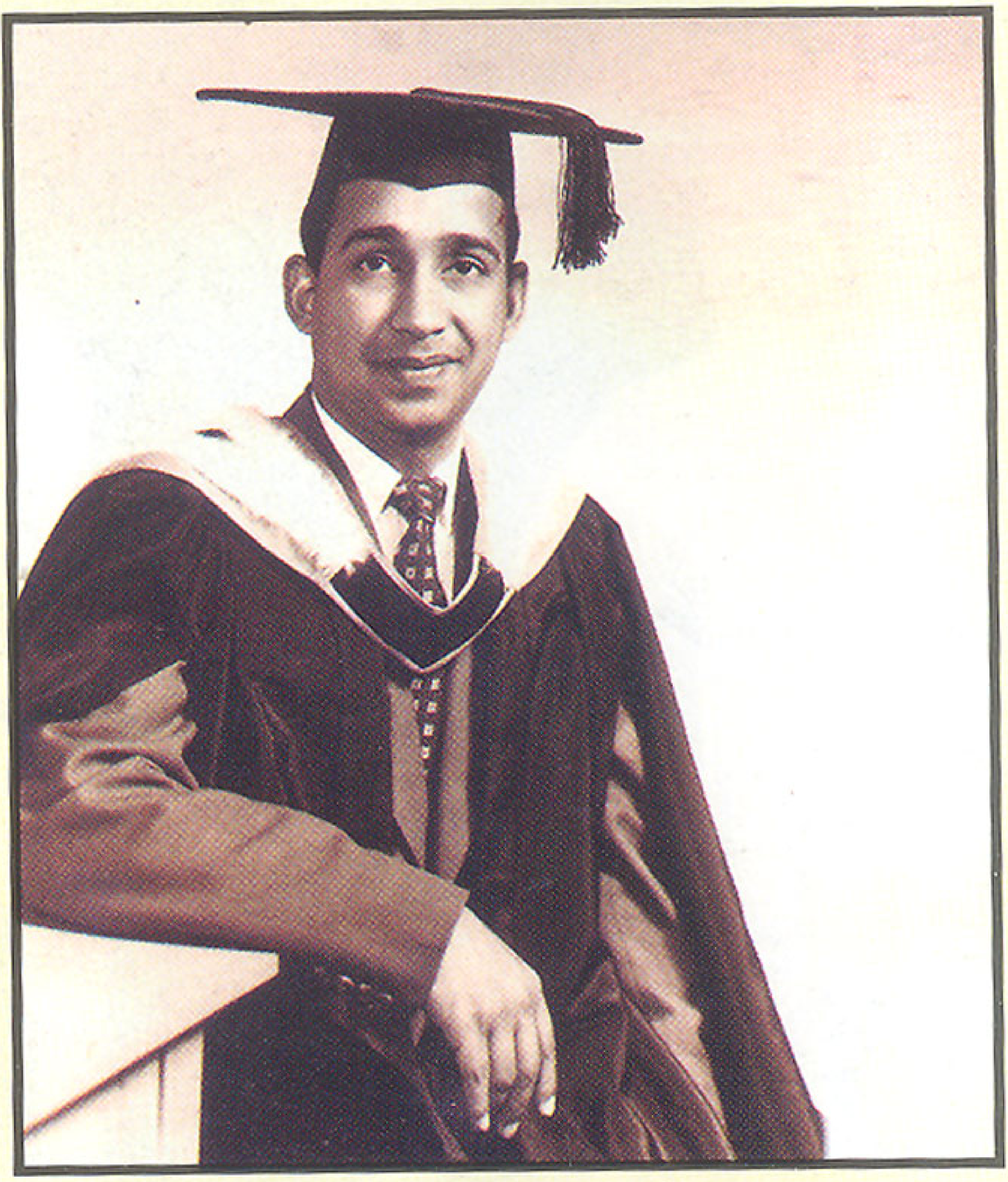

میاں عبدالمجید کنووکیشن کے موقع پر (مانچسٹر 1959ء)

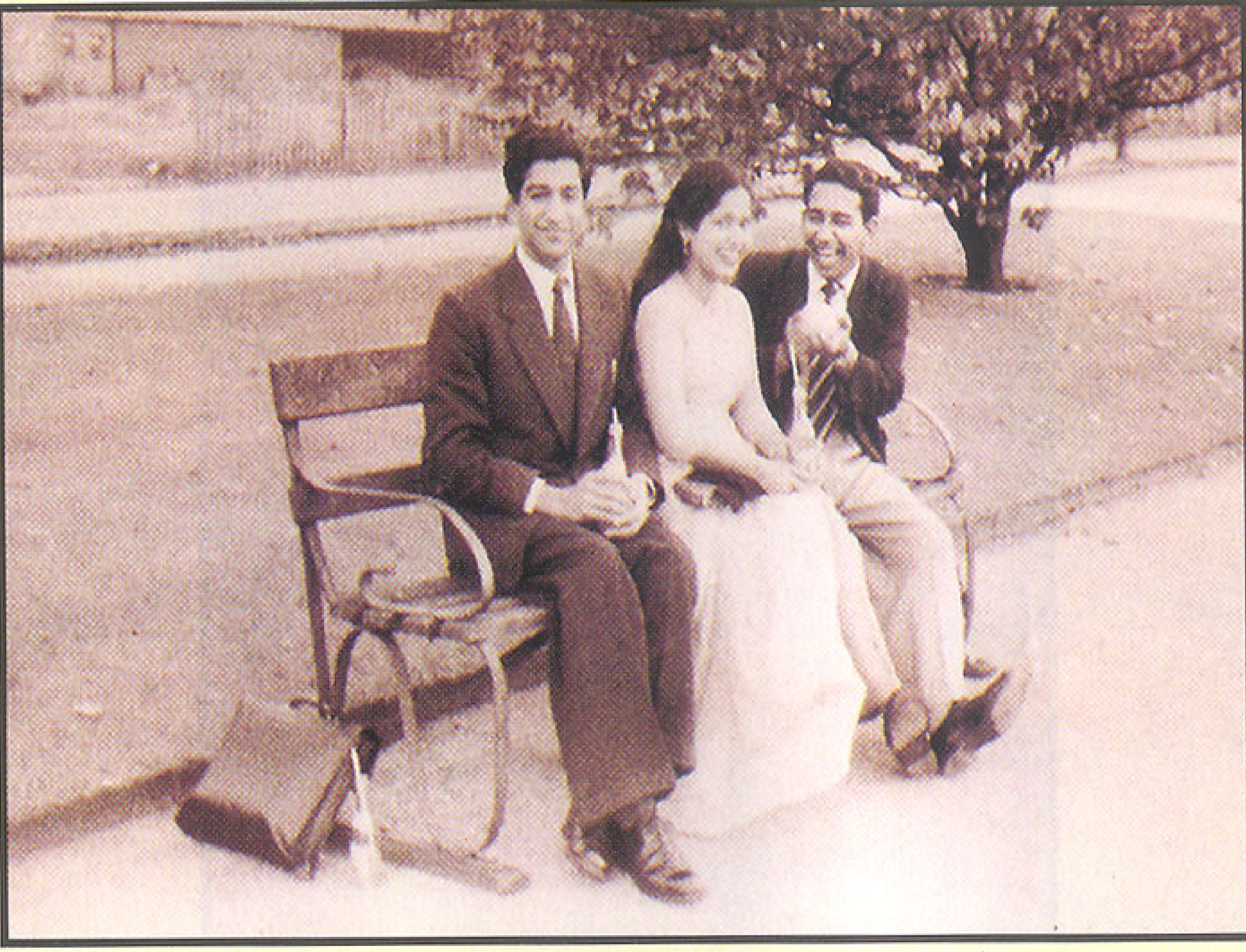

میاں عبدالمجید مانچسٹر میں طلبہ دوستوں (خدیجہ حق اور ظفر اقبال ناز) کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے

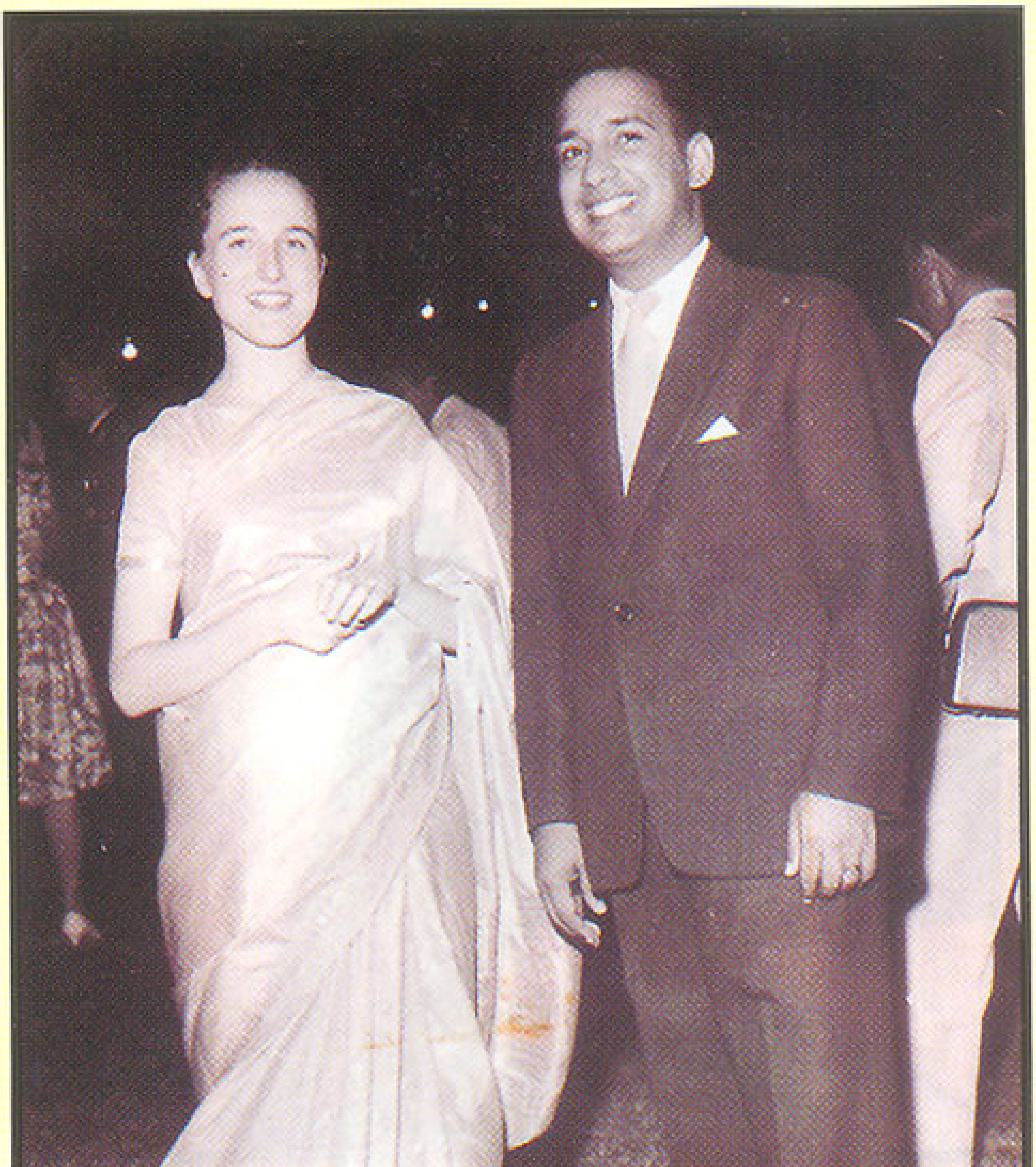

میاں عبدالمجید جوانی میں اہلیہ کے ساتھ (کراچی 1960ء)

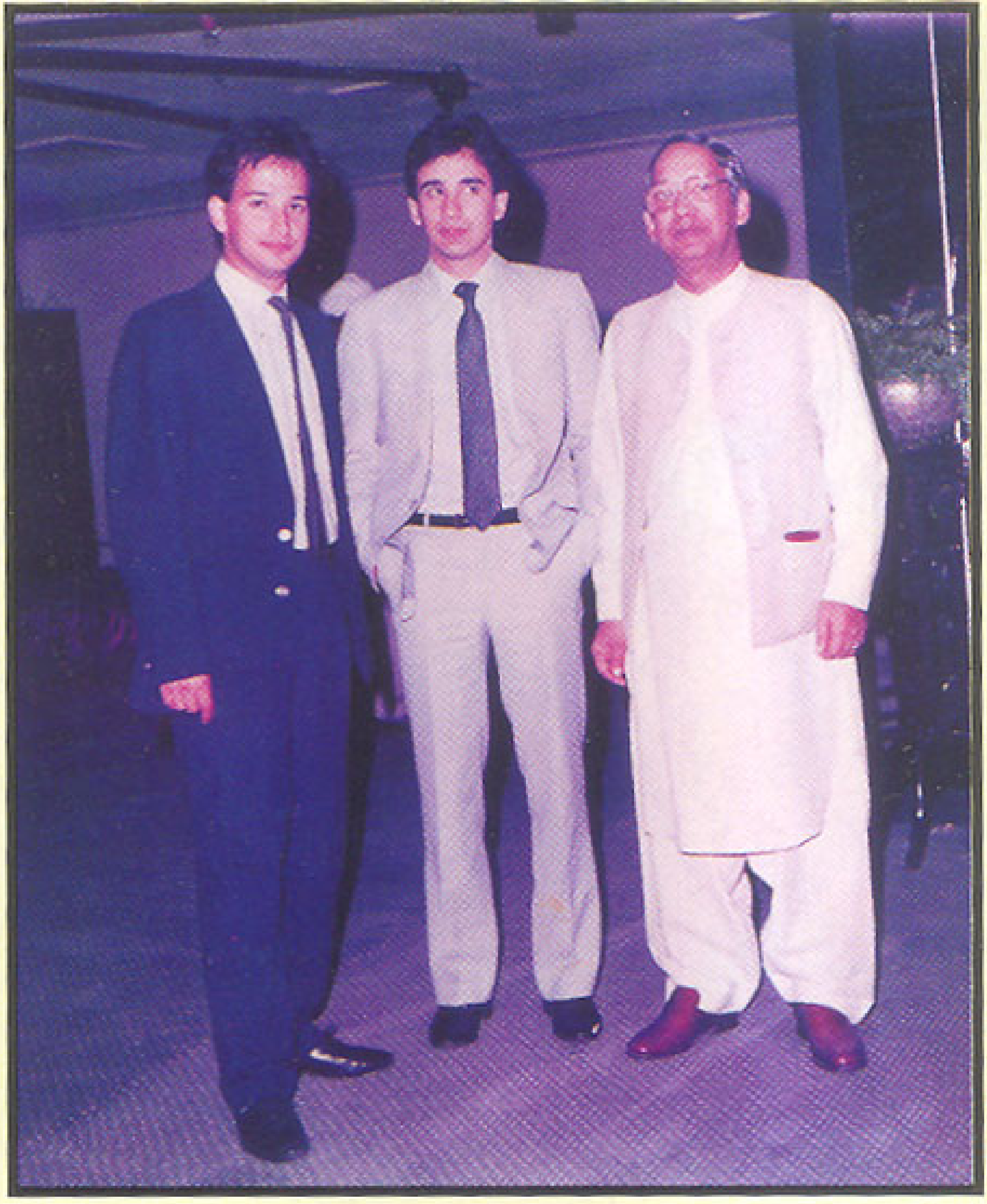

میاں عبدالمجید اپنے بیٹوں، زاہد مجید اور جاوید مجید کے ساتھ (کراچی 81-1980ء)

میاں عبدالمجید اپنے جنوبی امریکن ساتھی کے ہمراہ ہاورڈ بزنس اسکول امریکہ میں (1989)

میاں عبدالمجید، میاں شہزادہ منوں اور وقار حسن (انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کانفرنس لاہور 1991ء)

بین الاقوامی ٹیکسٹائل نمائش کے موقع پر سابق گورنر پنجاب میاں اظہر سے میاں عبدالمجید
ایوارڈ وصول کر رہے ہیں (لاہور 1990ء)

کراچی میں نمائش کے موقع پر طارق اکرام، میاں عبدالمجید، محمد میاں سومرو اور ابرار حسن

بین الاقوامی ٹیکسٹائل کانفرنس کے مہمان خصوصی سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کے ساتھ میاں عبدالمجید

(لاہور 1990)

سابق وفاقی وزیر ٹیکسٹائل محمود احمد خان کے ساتھ میاں عبدالمجید خطاب کرتے ہوئے (لاہور 1997ء)

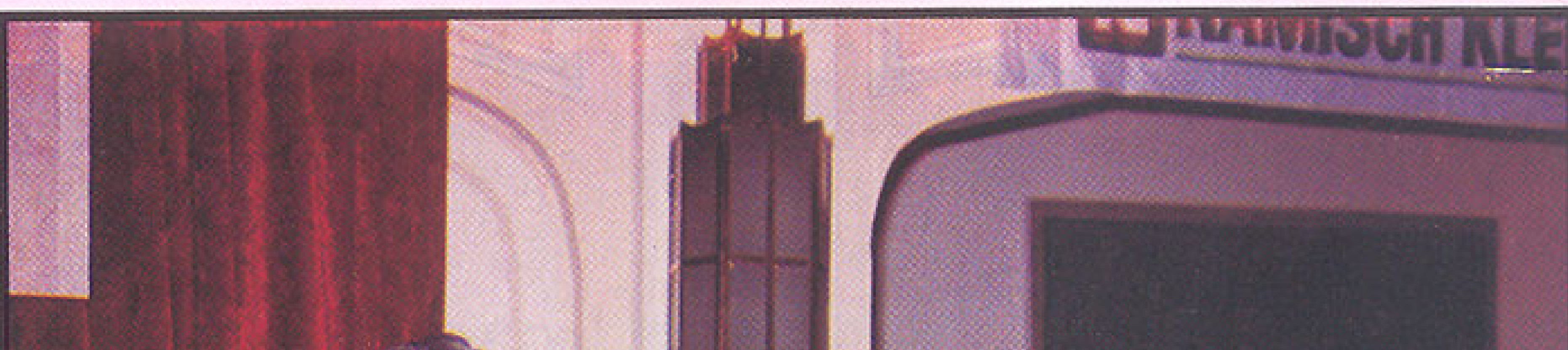

بین الاقوامی ٹیکسٹائل کانفرنس کے موقع پر (دائیں سے بائیں) جہانگیر منوں، میاں عبدالمجید، غلام حیدر وائیں
(لاہور، دسمبر 1991ء)

کراچی: روٹری کلب کے زیراہتمام ایک تقریب میں میاں عبدالمجید، حکیم سعید کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے

میاں عبدالمجید سابق چیئرمین سینٹ وسیم سجاد سے ایکسپورٹ ایوارڈ وصول کرتے ہوئے
درمیان میں ایس ایم منیر کھڑے ہیں

میاں عبدالمجید، غلام حیدر وائیں، محمود احمد خان اور میاں محمد نواز شریف (انٹرنیشنل ٹیکسٹائل کانفرنس 1991)

میاں عبدالمجید اپنے آبائی گھر کلاسکے میں عزیز واقارب کے ساتھ (1993ء)

میاں عبدالمجید صاحب اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر جاوید مجید اور ان کے بچوں کے ساتھ (لندن 2009ء)

میاں عبدالمجید اپنے بیٹے زاہد مجید اور پوتے کے ساتھ (آسٹریلیا، سڈنی)

میاں عبدالمجید اہلیہ کے ساتھ لاہور میں (1980ء)

میاں عبدالمجید اپنے دورہ چین کے موقع پر دوستوں کے ہمراہ
(بائیں سے دائیں) کیپٹن ایس ایچ اطہر اور ڈاکٹر خالد مرحوم (بیجنگ 1987/88ء)

دورہ چین کے موقع پر (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خالد مرحوم، میاں عبدالمجید، عبدالقادر مرحوم،
چین کے وزیر ثقافت، ہارون چاڑیا اور ایس اے خان (بیجنگ 1987/88ء)

کراچی: میاں عبدالمجید پیر پگاڑا سے شیلڈ وصول کرتے ہوئے (روٹری 1985ء)

نظریہ پاکستان سندھ کے زیر اہتمام تقریری مقابلوں کے اختتام پر تقسیم اعزازات کے موقع پر (دائیں سے بائیں) میاں عبدالمجید،
نصرت مرزا، مجید نظامی، نعمت اللہ خان، محمد میاں سومرو اور عقب میں طارق سعود و دیگر (اگست 2004ء)

نظریہ پاکستان ٹرسٹ سندھ کے زیراہتمام تقریب تقسیم ایوارڈز واسناد کے موقع پر (دائیں سے بائیں)
ڈاکٹر اکرم کھوکھر، نسرین جلیل، میاں عبدالمجید، طارق سعود، ڈاکٹر وسیم قاضی اور آخر میں ڈاکٹر منصور ڈار

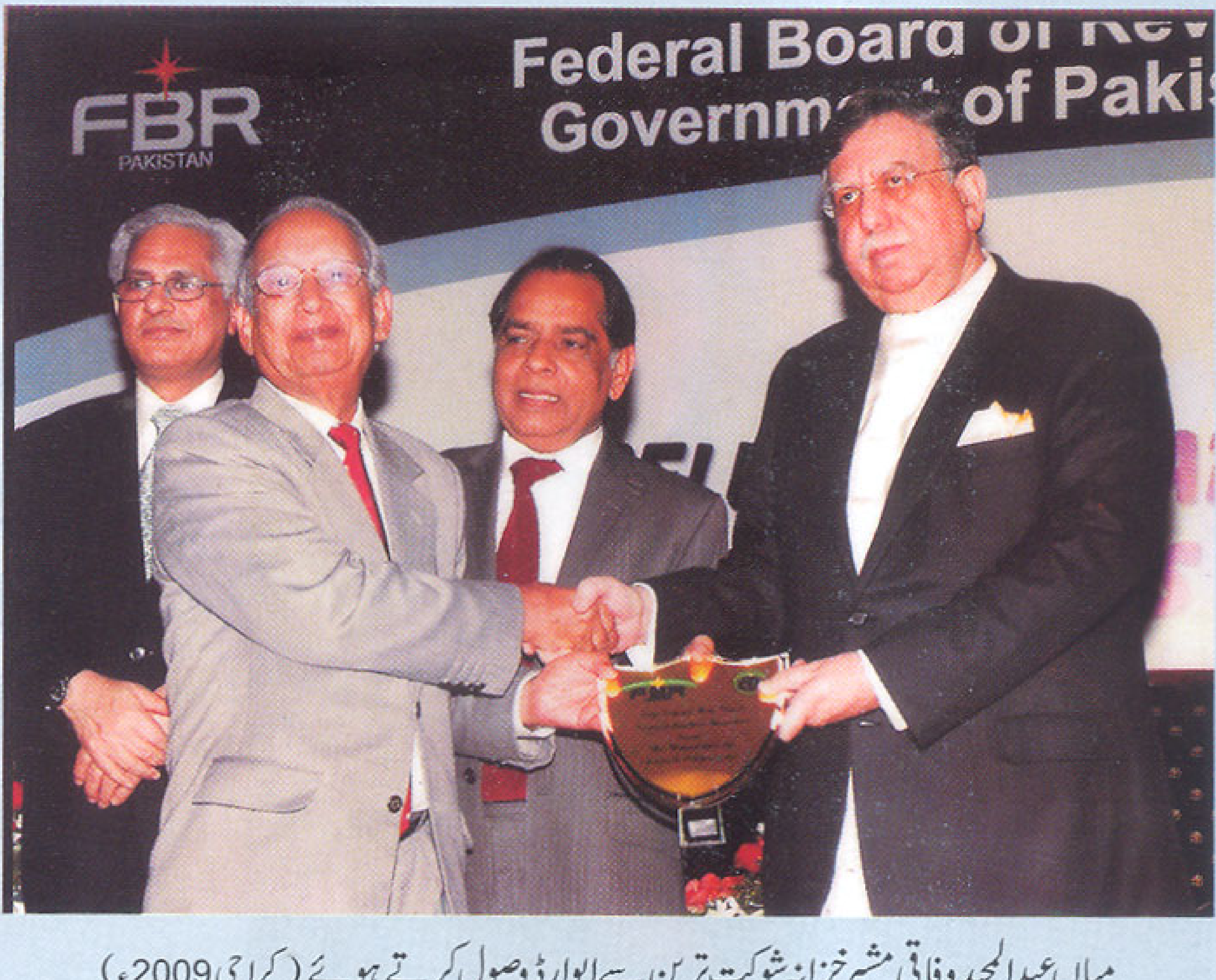

میاں عبدالمجید وفاقی مشیر خزانہ شوکت ترین سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے (کراچی 2009ء)

ایف سی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی ایک تقریب میں سابق وزیراعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی سے
میاں عبدالمجید ایوارڈ وصول کر رہے ہیں (2004ء)

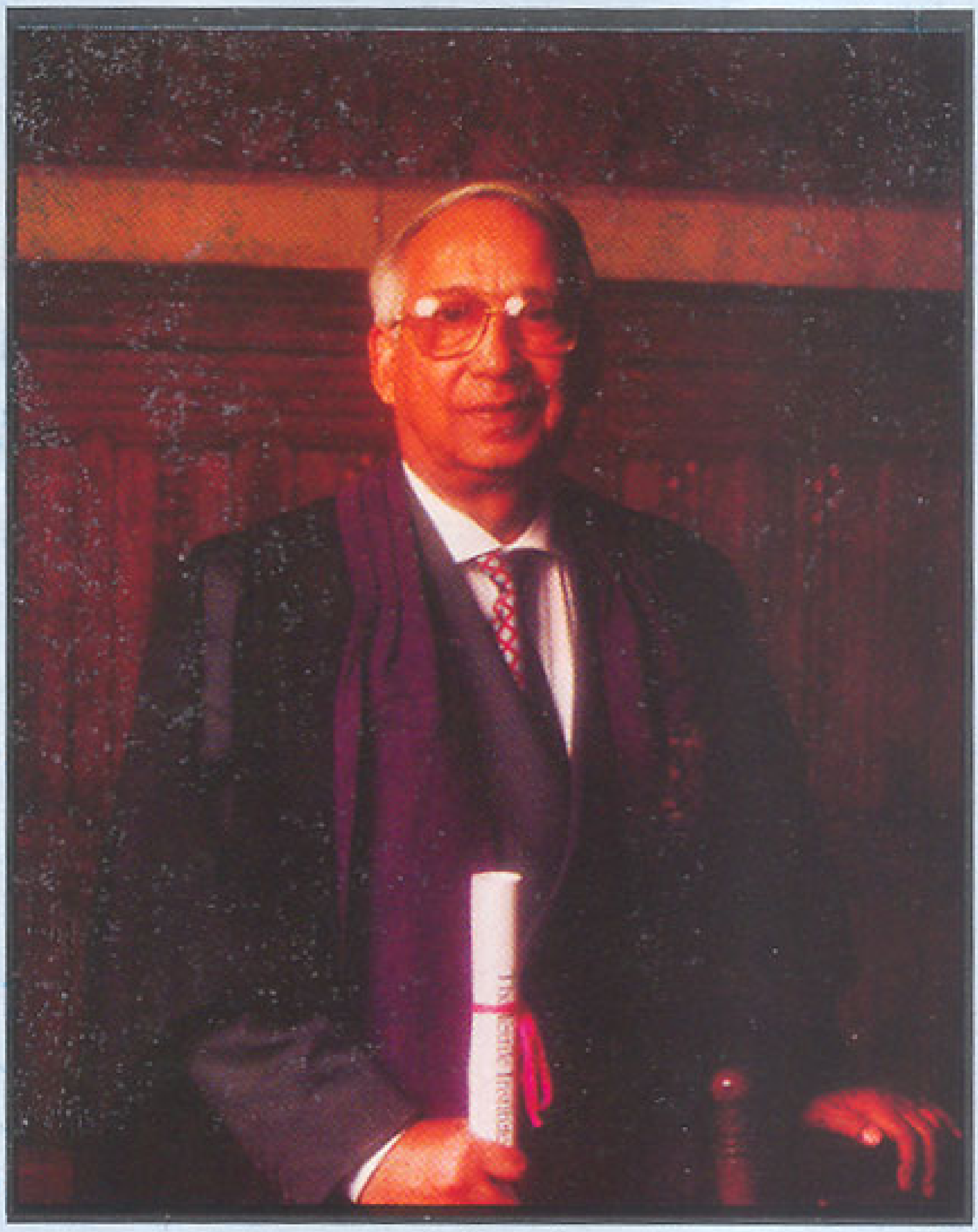

میاں عبدالمجید اعزاز وصول کرنے کے بعد (ٹیکسٹائل انسٹیٹیوٹ، مانچسٹر)

عالمی ٹیکسٹائل نمائش کی صدارت کے دوران میاں عبدالمجید غیر ملکی مندوب کو سنتے ہوئے
(ٹیکسٹائل کانفرنس، ہانگ کانگ 1996ء)

گرلز ہال کلاسکے کا امتحانی مرکز (میاں عبدالمجید کی والدہ کے نام سے موسوم)

سائنس بلاک گورنمنٹ ہائی اسکول کلاسکے

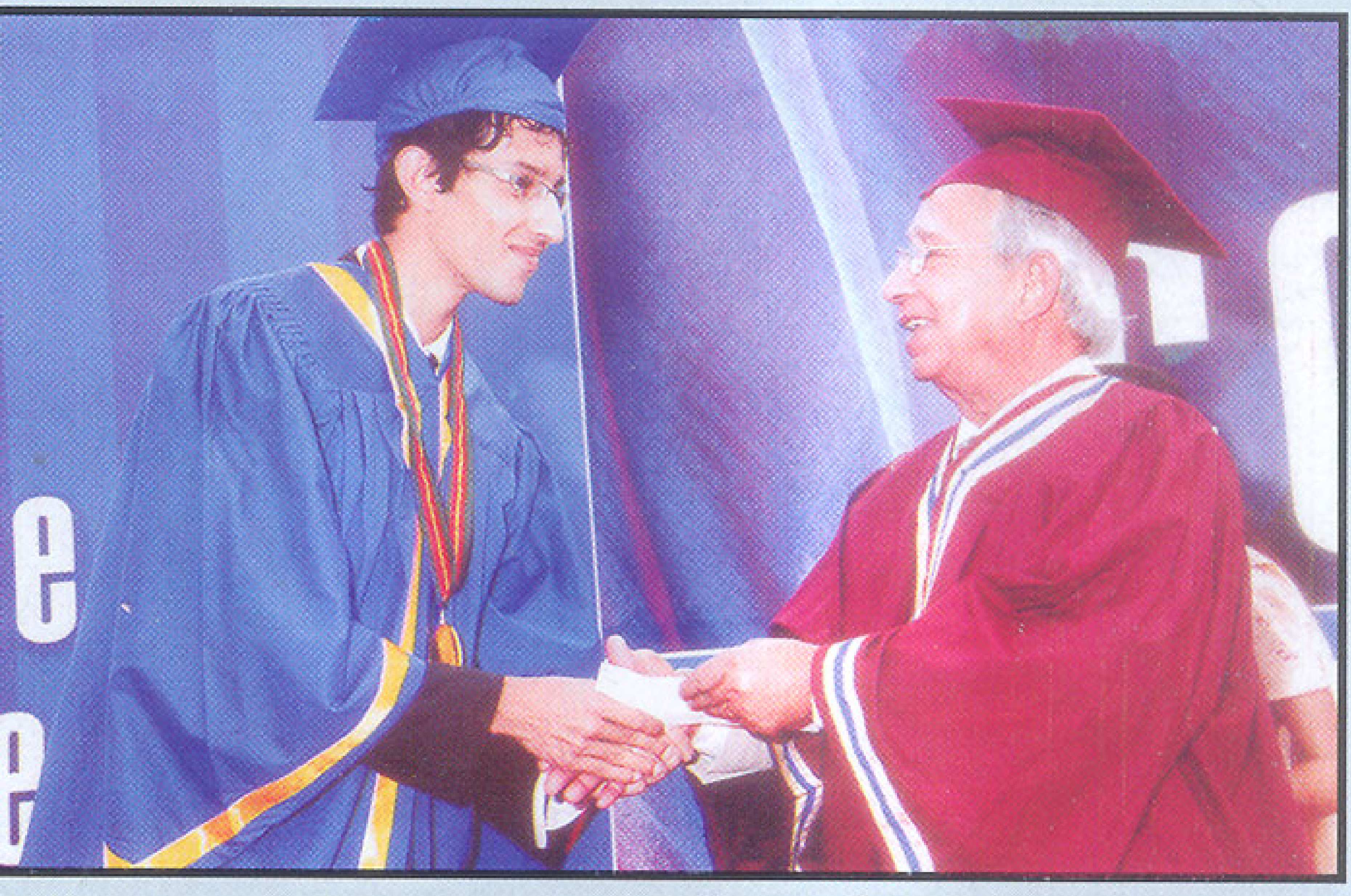

ٹی آئی پی کنووکیشن کے موقع پر میاں عبدالمجید ذہین طالب عاصم احمد کو
اقبال احمد میموریل گولڈ میڈل پہنانے کے بعد کیش پرائز دیتے ہوئے (2007-)

صاحبِ کتاب